آسماں
آغا سہیل

بدلتا ہے رنگ آسماں

(افسانے)

آغا سہیل

(پروفیسر ایف سی کالج لاہور)

اقبال بک کارنر۔ گلبرگ نمبر ۲-۱

فون نمبر ۸۲۸۲۲

بار اول ۱۹۷۵ء

تعداد ۱۰۰۰

قیمت دس روپے پچاس پیسے

سول ایجنٹس

مکتبۂ فنون ۴۷۔ انارکلی لاہور

فون نمبر ۵۸۰۰ ۹

آئینۂ ادب۔ چوک مینار انارکلی لاہور

فون نمبر ۶۷۵۰۴

طفیل آرٹ پرنٹرز لاہور

حسن عابد

کے

نام

مصنف کے کوائف

نام: آغا سہیل

تاریخ پیدائش: ۶ جون ۱۹۳۳ء

پیشہ: تدریس (پروفیسر ایف سی کالج لاہور)

پتہ: ۲۳۔ایف سی کالج لاہور ۱۶

فون نمبر ۸۲۹۱۶

تصانیف:

۱۔ غبارِ کوچۂ جاناں	(ناول)	فیروز سنز لاہور
۲۔ سرودِ سلطانی	(تالیف)	مجلس ترقی ادب لاہور
۳۔ بدلتا ہے رنگ آسماں	(افسانوں کا مجموعہ)	اقبال بک کارنر گلبرگ لاہور
۴۔ معارفِ سہیل	(مقالات)	〃 〃 〃 〃
۵۔ لسانیاتی خاکہ	(لسانیات)	(زیر طبع)
۶۔ دبستانِ لکھنؤ کا داستانی ارتقا	(تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی)	(زیر طبع)

پتنگا

جب ریل گاڑی سے اتر کر پتنگا نے چاروں طرف دیکھا تو یوں محسوس ہوا کہ
اس نے آنکھیں بند کر کے دھند کے سمندر میں غوطہ لگایا ہو —— گرد آلود آسمان حدِ نگاہ
تک دھند چھائی ہوئی پرانا اکّہ اور مریل سی گھوڑی اس میں جُتی ہوئی جو پھونک پھونک کر
قدم رکھتی تھی تو اکّہ رینگتا تھا۔ اس پر بھی میر موقع دعائیں دم کر کر کے پھونکتے جاتے، چابک
کیسی جس کو پھول کی چھڑی نہ چھوائی ہو، اور گھوڑی کو میری عزیز بیٹی، عزیز از جاں، قرۃ العین
اور عزیزہ سلمہا وغیرہ کہہ کر مخاطب کرتے ہوں۔ اُس کی رفتار معلوم —— اکّے کے ایک
پر کے اوپر دیوان جی بیٹھے۔ دوسرے پر کے اوپر ہزاری اور اندر پردے میں پتنگا
جس کے پیروں کے جھانجھ اور کڑے ہر ہر ہچکولے پر گھوڑی کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھروں
سے زیادہ شور کرتے تھے تو ہزاری کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ اس نے گھوڑی کی رفتار
سے اکتا کر کہا —— واجی میر صاحب —— اب تو خدا کے لئے اس بار جو آٹھوں کا میلہ لگے

تو اسے بیچ کر بسم اللہ کر کے دوسری ذرا شوخ سی گھوڑی خرید لیجئے۔"

میر موقع نے کان کھڑے کیے۔"کیا کہا میاں ہزاری؟ —— کچھ میری عزیزہ سلمہا کی نسبت تم نے رائے دی؟"

دیوان جی نے خطرے کی بو پاکر بات برابر کرنے کی کوشش کی۔"نہیں قبلہ آپ چلتے رہیے، بھلا گھوڑی کی نسبت ایسی گستاخی کون کر سکتا ہے۔"

میر موقع اِکّے سے اُتر پڑے، گھوڑی کے پاس کھڑے ہو کر اس کی تھوتھنی کو سہلاتے ہوئے بولے "دیوان جی یہ اِکّہ بڑی حویلی نہیں جائے گا —— دوسری سواری لے لیجئے —— آپ اتنی بڑی حویلی اور ایسی عالیشان سرکار کے دیوان ہیں، مگر بات کرنے کا ہنوز سلیقہ نہیں آیا ——"

دیوان جی نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو ہر طرف سناٹا تھا۔ درختوں پہ کہرے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ہر دس قدم کے آگے شاہراہ تک دھند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سردی کا یہ عالم تھا کہ ذرا کان کھلے اور تخ بستہ ہوا کا جھونکا سن سے جسم کے پار ہوا بدن میں لہو جما جاتا ہے، ناک برف کی قلفی کی طرح جمی ہوئی رکھی ہے۔ دیوان جی اس تصور ہی سے کانپ گئے کہ یہاں دو چار گھنٹے تنہائی میں گزارے جائیں۔ جوان جہان عورت ساتھ میں ایک نوخیز سا چھوکرا، دو بوڑھے، اگر ڈاکو آجائیں تو بھلا ہم ان کا کیا بگاڑ سکیں گے، جھٹ بولے "قبلہ میر صاحب، بھلا کیا قصور ہوا؟"

دیوان جی نے اتنا جو کہا تو میر صاحب چیخے۔"اب قصور بھی میں ہی بتاؤں، ارے صریحاً آپ نے گھوڑی کہا اسے کہ نہیں؟ بھلا اتنی بات کی مجھے تاب کہاں، دیکھئے ذرا اس کی غزالیں آنکھوں کی طرف، واللہ آنسو چھلک رہے ہیں —— آج تک اس کی آنکھوں

میں مَیں نے آنسو نہیں دیکھے —— دل ٹکڑے ہو گیا، سینے میں دیوان جی —— سارا شہر جانتا ہے کہ کہکشاں سلمہا میری آنکھ کا تارا ہے اور اس کی نسبت آپ گھوڑی کا لفظ استعمال کریں"۔ پھر گھوڑی کی طرف مخاطب ہو کر اور اس کی پیشانی کو چوم کر بولے "ہائے بیٹی کہکشاں کیا کریں زمانہ بڑا ناقدر شناس ہے، میں تو تمہیں جوہروں بھوروں میں رکھوں، کسی کی گرم نگاہ تک نہ پڑنے دوں مگر کیا کروں بیٹی پیٹ کی آگ نہیں مانتی "۔

ہزاری اور دیوان جی عجب مخمصے میں پھنسے، عجب خبط الحواس اِکّے والے سے سابقہ پڑا تھا۔ ڈالی گنج کا سنسان اسٹیشن، نہ کوئی جان نہ پہچان، دور دور تک آدم نہ آدم زاد اور مزہ یہ کہ بارہ بجے دن تک کوئی گاڑی کے آنے جانے کا امکان بھی نہیں۔ چار و ناچار دیوان جی نے کہا: "قبلہ بے شک مجھ سے بڑی چوک ہوئی۔ میں بے حد شرمسار اور نادم ہوں —— لے بسم اللہ اِکّہ بڑھائیے اور قصور بخشیئے ——"

"جی!!! میر موقع نے مڑ کر کہا "جب تک قرۃ العین گوشۂ چشم سے اشارہ نہ کرے گی میں نہیں چل سکتا —— اُس کے مزاج کو بھلا آپ کیا جانیں اور اُس کے دماغ کو بھلا کیا کوئی پہنچے "۔

ہزاری جل کے رہ گیا۔ زیر لب بولا "گھاس کھا گیا ہے بڈھا" —— دیوان جی نے کہا "فیم کی پینک ہے۔ ایک آدھ چھینٹا تیز ہو گیا ہوگا"۔ اندر سے پتنگا کی جوڑیاں چھنچھنائیں اور اتفاقیہ اسی وقت گھوڑی نے کنوتیاں بدلیں، کان کھڑے کئے اور سر کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا۔ بس میر موقع کے لئے یہ اشارہ مہمیز کا کام کر گیا۔ جھٹ اِکّے پر آ بیٹھے۔ بولے "چلئے اب موقع ٹھیک ہے، عزیزہ خود چلنے پر آمادہ ہے۔ اب اس کی مرضی کے خلاف کروں گا تو اس کا دل میلا ہو گا"۔

دیوان جی اور ہزاری نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور غالباً پس پردہ تیتنگا نے بھی۔ گھوڑی قدرے تیز تیز قدم اٹھانے لگی، میر موقع بولے "ماشاء اللہ ماشاء اللہ چشم بد دور آج عزیزہ سلمہا شوخی کی طرف مائل ہے۔ یا پھر میاں ہزاری کا طعنہ تازیانے کا کام کر گیا۔ بھئی کہکشاں ہم تو قائل ہیں تمہاری غیرت اور خودداری کے ——— کیوں نہ ہو، ہو آخر بھلا کیسی عالی نسب، والا حسب۔" دیوان جی کی طرف مڑ کر فخریہ انداز میں میر موقع نے دیکھا اور داد طلب کی۔

دیوان جی نے کہا "واہ واہ ——— سبحان اللہ! کیا پری کی سی چال ہے"۔

ہزاری نے فقرہ جڑا "کبک دری بھی نثار ہے"۔

میر موقع بھول گئے، خوشی میں سارا غم بھول گئے "حضرت یہ بڑی عالی نسب ہے عزیزہ"۔

ہزاری بولا "بجا ارشاد ہے قبلہ آپ سا پدر نامدار جس کی تربیت کرے۔ کیوں نہ بھلا وہ اس بات پر فخر کرے"۔

میر موقع نے کہا "ہاں ہے تو صحیح کہ میں نے اتنی سی جان کو پالا پوسا، ہر طرح کے ناز و نعم میں رکھا۔ اچھے سے اچھا کھلایا پلایا۔ پال پوس کر جوان بھی کیا۔ مگر صاحب اس عزیزہ کا سلسلۂ نسب حضرت رخش رحؒ تک پہنچتا ہے"۔

دیوان جی نے ذہن پر زور دے کر تمام اولیائے کرام کے اسمائے گرامی یاد کئے اور جب حضرت رخشؒ کا نام کہیں نہ ملا تو سخت مایوس ہوئے مگر ڈر کے مارے منہ سے کچھ نہ بولے کہ مبادا میر موقع کے مزاج کے خلاف گزرے۔

میر موقع دیوان جی کو خاموش دیکھ کر بولے "قبلہ دیوان جی حضرت رخشؒ کے مزار مقدس کا پتہ اسی عزیزہ سلمہا نے معلوم کیا ہے۔ وہ جو اکھاڑہ بھیم کے پاس سے ریل کی پٹری گزرتی ہے اور ایک ٹنکی تلے سا مزار پڑا ہوا ہے وہ حضرت رخشؒ کا ہے ——— کہکشاں سلمہا ایک روز

منہ اُٹھائے اس طرف چلی گئی۔ میں نے بھی لگام ڈھیلی چھوڑ دی۔ مزار کے پاس پہنچ کر رک گئی اور اشارے کر کر کے مجھے پاس بلایا — مجھ کم بخت کی سمجھ میں خاک کچھ نہ آیا — بہت پوچھا کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے ہر ہر بزرگ کا نام لیا کہ یہ کس کا مزار ہے — فلاں کا ہے — فلاں کا ہے تو صاحب سلمہا چپ — کوئی جواب نہیں، یہاں تک کہ میں نے یہ بھی پوچھ لیا کہ کیا یہ میر تقی میر کا مزار ہے کیونکہ ایک شاعر کو میں نے اس مزار کے بارے میں یہی کہتے سنا تھا بلکہ اکثر اسے فاتحہ پڑھتے بھی دیکھا تھا۔ عزیزہ سلمہا نے اس بات پر خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھا تو صاحب میں سہم گیا اور اسی وقت میں نے دل میں طے کر لیا کہ میر تقی میر کا یہ مزار ہرگز نہیں ہو سکتا — میں نے چپکے سے کان میں کہا۔ کیوں بیٹی تمہارے جد اعلیٰ حضرت رخش کا مزار اقدس ہے؟ تو گردن اثبات میں ہلا دی۔ چنانچہ قبلہ ہر جمعرات کو جو آپ مزار پہ ہار پھول کے انبار دیکھتے ہیں، شمع جلتی ہوئی اور لوبان سلگتا ہوا پاتے ہیں تو وہ اسی بندۂ ناچیز کا حقیر ہدیہ ہے — آپ ہی بتائیے کہ اگر رستم جیسے پہلوان کا خدا بخشے حضرت رخش ساتھ نہ دیتے تو بھلا آپ کہہ سکتے تھے رستم کو رستم زماں؟"

اس تقریر کے بعد دیوان جی کے ذہن میں یہ بات جمی کہ آخاہ یہ رستم کے گھوڑے رخش کا اس اہتمام اور احترام سے بیان ہو رہا تھا۔ بارے منزل مقصود آئی۔ ہزاری اور دیوان جی کی جان میں جان آئی — پتنگا نے چادر بیچ برقع میں سے پاؤں نکال اِکّے کے پہیوں پر قدم جمائے، گورے گورے پاؤں میں چاندی کے جھانجھ اور کڑے پڑے ہوئے تھے۔ سلما ستارے کی سرخ کامدار جوتی بہار دکھا رہی تھی۔ ہزاری ہزار جان سے ان پیروں پر عاشق ہو گیا۔ دیوان جی نے بڑھ کر سہارا دیا۔ چھم چھم کرتی ہوئی پتنگا ڈیوڑھی میں آئی۔ ہزاری بقچی اٹھا کر لایا۔ چادر پیچھے کی نقاب ہٹا کر بقچی پر جو پتنگا نے نظر ڈالی تو چاند سا مکھڑا بجلی بن کر ہزاری کے

دل پر گرا۔ دھیرے سے بولا "پتنگا ـــــ میں ڈیوڑھی پر رہتا ہوں، رونے کا کام کرتا ہوں بات بات پر باہر کے کاموں پر دوڑایا جاتا ہوں ـــــ تمہارا کام بھی جی جان سے کروں گا۔ ـــــ کبھی تمہارے حکم سے باہر نہیں رہوں گا۔ آج سے سمجھ لو تمہارا کوڑیا غلام ہوں، دن میں ایک بار ضرور آیا کرنا۔"

دیوان جی پیچھے سے آکے بولے ـــــ "جاؤ پتنگا اندر جاؤ۔ کہہ دو دیوان جی بیگم صاحبہ کی خدمت میں کورنش بجا لاتا ہے۔"

پتنگا ڈیوڑھی پھلانگ کر اندر گئی۔ صحن میں سناٹا تھا۔ غلام گردش میں کچھ ہلکی ہلکی آوازوں سے اسے اندازہ ہوا کہ کچھ نوکر جاگ اٹھے ہیں۔ محلسرا کے تمام دروازے بند پردے پڑے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف کی غلام گردش میں بھی جاگ ہو رہی ہے لیکن دروازے ہر طرف کے بند۔ لق و دق صحن کے بیچوں بیچ بغل میں بقچی دبائے حیران پریشان دیر تک وہ کھڑی سوچتی رہی کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اونچی اونچی دیواروں کے آگے سوائے دھند اور کہرے کے کوئی شے اب تک نظر نہیں آتی تھی۔ بڑے بڑے محراب دار دروں میں دروازے بند تھے اور شیشوں کی رنگ برنگی محرابیں دھند میں لپٹی ہوئی تھیں۔ اوپر کارنس اور چھجے اور چھجوں کے اوپر جالی اور کوٹھے کے دونوں پہلوؤں میں دو خوبصورت مہتا بیاں تک دھند کی وجہ سے دھندلا گئی تھیں۔ پتنگا نے اس خوبصورت حویلی کو اپنے بچپن میں اپنی نانی کے ساتھ آکر جب پہلی بار دیکھا تھا تو اس وقت بھی اس کو یہی مہتا بیاں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں اور وہ ہمیشہ اس حویلی کے دوبارہ دیکھنے کی آرزو رکھتی تھی اور آج جب اس کی یہ دلی تمنا بر آئی تھی تو وہ اس قدر خوش نہیں تھی۔ ہیضے کی وبا میں اس کے ماں باپ، بہن بھائی اور دوسرے اعزہ نہ مرتے اور نہ اسے علاقے کے رئیس کے

گھر اس طرح آکر ان کے رحم و کرم پر پڑنا پڑتا۔ آج اس حویلی میں اُس کے آنے کی حیثیت اور تھی، اسی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے نگاہ اوپر اٹھا کر دل ہی دل میں کہا "پالنے والے تیرا شکر ہے"۔ معاً اس کی نگاہیں خوب صورت مہتابیوں سے ہم آغوش ہو گئیں، ان مہتابیوں کے ساتھ یہ حویلی کیسی خوبصورت معلوم ہوتی تھی — جیسے کوئی حسینہ بستر ناز پر لیٹی ہو اور یہ مہتابیاں اس کے سینے کے اُبھار کی طرح پر شکوہ انداز میں اوپر اُٹھی ہوئی ہوں۔ ایسی بات سوچ کر اسے شرم بھی آ گئی مگر بات اتنی خوبصورت اور پھر پلور تھی کہ اس کا جی خوش ہو گیا۔ اسے سچ مچ حویلی بستر ناز پر کسی خوابیدہ حسینہ کی طرح پڑی ہوئی نظر آئی۔

غلام گردش کا ایک دروازہ کھلا۔ نورانی چہرے والی بوڑھی آتو جی دعائے نور کا وظیفہ پڑھتی ہوئی باہر نکلیں۔ ایک سیاہ سائے کو دیکھ کر ٹھٹکیں "اوئی کون ہے۔ بوا" کہتی ہوئی آگے بڑھیں۔ دو تین پیش خدمتوں نے ہڑبڑا کر دروازے کھولے اور بیک زبان بولیں "آ گئی"۔ چادروں کے بکل مار مار کر ساری جوان بوڑھی ادھیڑ ملازمائیں، لونڈیاں، پیش خدمتیں آ کر بولیں "پتنگا آ گئی"۔

"اے آتو جی پتنگا آئی ہے۔ بیگم صاحبہ کو اطلاع دیجیے"۔ اور چاروں طرف سے اسے سب نے گھیر لیا۔

آتو نے پاس آ کر سر سے پیر تک پتنگا کا جائزہ لیا، پتنگا بولی "بندگی"۔

آتو نے ناک بھوں چڑھائی۔ بولیں "موئے دیہاتیوں کو بھلا تمیز کہاں، ادب کہاں، سنو بی پتنگا یہ ہے سرکار دربار کا معاملہ — تمہاری گنوار ولٹھ مار بندگی یہاں نہیں چلے گی — سمجھیں؟ بڑی حیثیت کے لوگ کم حیثیت کے نوکروں کو بندگی کرتے ہیں۔ یہاں تو کورنش اور تسلیم کی خو ڈالنا پڑے گی"۔

ابھی یہ پند جاری تھا کہ پند نامہ کھلا ہی ہوا تھا کہ حویلی کے ایک حصے سے ستار بجنے کی آواز دھیرے دھیرے آنے لگی اور کوئی مردانی نگمہ پرسوز مترنم آواز میں گانے لگا۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی

دوسری طرف کوئی خاتون بڑی پرسوز آواز میں مناجات پڑھ رہی تھیں۔

سامان شتاب کردے مرے دل کے چین کا پروردگار واسطہ خون حسین کا

ایک طرف سے تسبیح و تہلیل کی صدائیں بلند تھیں۔ آسمان پر پرندے اڑتے ہوئے گزر گئے گھر میں پلے ہوئے طوطے، لال، مینائیں بولنے لگے، چہکنے لگے۔ کبوتر غٹر غوں غٹر غوں بولنے اور مرغ ککڑوں کوں کہہ کر چلائے۔ طوطے نے بھی اپنا وظیفہ پڑھا۔

"میٹھو ــــ میٹھو نبی جی بھیجو مدد حسین کی۔ میٹھو بیٹے خاصا کھایا؟ نہیں بی بی کہاں کھایا بھوکا ہوں ــــ نبی جی بھیجو مدد حسین کی۔"

آسمان پر قدرے روشنی پھیلی تو پتنگا کو لے کر ما آ تو بڑی بیگم صاحبہ کی نماز کی چوکی کے پاس لائیں۔ بڑے دالان سے ہو کر دوسرے دالان سے گزر کر شہ نشین پر جو تختوں کا چوکا لگا تھا نماز کی چوکی اسی پر بچھی ہوئی تھی اور بڑی بیگم صاحبہ مصلے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ پتنگا نے جھک کر کورنش عرض کی۔ اشارے سے جواب ملا۔ صحنچی میں آ کر اس نے دیکھا کہ چھوٹی بیگم بھی مصلے پر بیٹھی مناجات جھوم جھوم کر پڑھ رہی تھیں جو دو چار لونڈیاں باندیاں اس کو اپنی ہمجولی بنانے کے خیال سے اس کے ساتھ سائے کی طرح لگی ہوئی تھیں، ان میں سے ایک نے چھوٹی بیگم کے قریب کھڑے ہو کر دھیرے سے کہا "پتنگا۔

چھوٹی بیگم نے اس کے سراپا کو تنقیدی نظر سے دیکھا اور پھر مناجات میں لگ گئیں۔ آ تو نے کہا "جا پتنگا، کنیز جو چھوٹے نواب کی چھوچھو ہے، اس کے حجرے میں تیرا پلنگ

بچھا ہوا ہے۔ وہاں جاکر بیگم صاحبہ کے حکم کا انتظار کر۔"

کنیز دہرے بدن کی سیاہ فام مگر ہنس مکھ لڑکی تھی۔ پتنگا سر جھکائے، بقچی بغل میں دبائے جب حجرے میں داخل ہوئی تو جیسے کنیز کھل گئی۔ بقچی لے کر طاقچے پر رکھی، پلنگ درست کرکے اُسے بٹھایا اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرادی۔ ہولے سے در میں لٹکے ہوئے پنجرے کی طرف دیکھ کر اشارہ کرکے بولی "دیکھ پتنگا یہ جو مینا ہے نا ——— اسے جب میں نے شہتوت کے درخت پر سے پکڑا اور اس پنجرے میں ڈالا تو یہ بہت پھڑپھڑائی ——— اب دیکھو کتنے آرام سے بیٹھی ہے۔"

پتنگا نے گہری نظروں سے کنیز کی طرف دیکھا۔ کنیز نے بے اختیار پتنگا کے گلے میں باہیں حمائل کردیں۔ پیار بھرے لہجے میں بولی "بہن بُرا نہ ماننا ——— ہم سب اسی مینا کی طرح پنجرے میں بند ہیں۔"

پتنگا بولی "حویلی بڑی خوبصورت ہے۔"

کنیز چند لمحے تو خاموش رہی، پھر بولی "ہاں ہے تو ——— باغ بھی بڑا اچھا ہے۔ آم، شریفے، امرود، بڑھل، کٹھل، شہتوت، بیر سب کچھ لگے ہیں۔ کمرک کا بھی پیڑ ہے اور پھولوں کی کیاریاں بھی ہیں۔ موتیا، بیلہ، چنبیلی، جوہی، موگرا، ہارسنگھار سب اپنی اپنی فصل پہ پھول لیتے ہیں۔ آج کل نرگس کے پھول کھل رہے ہیں۔ گل اشرفی بھی ہے ——— تمہیں کونسے پھول پسند ہیں پتنگا بہن؟ چھوٹے نواب تو بس نرگس کے پھولوں کے عاشق ہیں ——— شاعر ہیں نا۔"

"شاعر؟ ——— چھوٹے نواب شاعر ہیں؟ ——— ہائے اللہ!"

"کیوں؟"

"کچھ نہیں ـــــ یوں ہی ـــــ پتہ نہیں، مجھے معلوم نہیں۔ شاعر کیسے ہوتے ہیں اور شعر کیسے کہتے ہیں ـــــ اور ـــــ اور یہ شعر ـــــ ہوتے کیا ہیں؟"

"ارے تم کو یہ بھی نہیں معلوم" ـــــ کنیز بولی "یہاں تو مشاعرے ہوتے ہیں۔ خیر دیکھ لینا سب کچھ۔ اور ادھر جو باغ سے ملا ہوا چھوٹا سا مکان ہے جس پر پھولوں کی بیل چڑھی ہوئی ہے، چھوٹے نواب اسی میں رہتے ہیں۔ بڑے نواب ادھر پہلو والے کمرے میں بس ہر وقت ڈنڈ بیٹھکیں لگایا کرتے ہیں۔ جانتی ہو کتنا دودھ پیتے ہیں روزانہ بڑے نواب؟"

"نا"

"پانچ سیر، پورا پانچ ـــــ اور ڈکار تک نہیں لیتے۔ یہ اونچی چھاتی ہے ان کی، سرخ رنگ، بڑی بڑی خوفناک آنکھیں، بولتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شیر گرج رہا ہے ـــــ صادق پہلوان کے کندھے پر بس یوں ہی ہاتھ رکھا تھا تو وہ زمین پر گر پڑا ـــــ جانتی ہو یہ پتنگی، چندا، زعفران مرداریں کیا کہتی ہیں ـــــ؟"

"کیا؟"

کنیز نے گہری نظروں سے پتنگا کو دیکھا۔ پھر خود بخود کھلکھلا کر ہنس پڑی، "اچھا ابھی نہیں پھر بتاؤں گی۔"

پتنگا کو خلجان تو ہوا لیکن اصرار نہیں کرسکی، کنیز کی زبان کترنی کی طرح چل رہی تھی "اور منجھلے نواب کو تو سوائے گانے بجانے کے کچھ ہوش ہی نہیں، دن رات ستار ہے اور وہ ہیں ـــــ منجھلے نواب ـــــ" اس نے معنی خیز انداز سے پھر پتنگا کو دیکھا ـــــ "جانتی ہو منجھلے نواب کو؟"

پتنگا نے نفی میں زوروں سے گردن ہلائی۔ کنیز نے کان کی لَویں پکڑ کر کہا "توبہ ہے ـــــ

اللہ ہر بہو بیٹی کی عزت کو بچائے بوا۔ نگاہ کے بہت برے ہیں ــــ بیگم صاحبہ نے تو ان کا محلسرا میں آنا جانا تک بند کر دیا ہے۔ بوڑھی اور پرانی پیش خدمتوں کے سوا کوئی وہاں نہیں جاتا۔ جب بڑی بیگم صاحبہ کو سلام کرنے سنجھلے نواب آتے ہیں تو ہم سب پردے میں بٹھائے جاتے ہیں۔ اب کوئی برس دن سے تو میں بھی ان کے سامنے نہیں گئی۔"

کنیز نے سرگوشی میں کہا۔" اور موئی زعفران کے دیدے کا پانی ایسا ڈھلا ہے کہ روز رات کو چوری چھپے سنجھلے نواب کے دیوان خانے میں چلی جاتی ہے، صبح تڑکے واپس آتی ہے ایک دن آتو جی کی نظر پڑ گئی۔ پیٹھ پر دو ہنٹر مار کر بولیں۔ اری موئی ڈھینڈھا پھول جائے گا تو محلسرا سے نکال باہر کی جائے گی ــــ جانتی ہو ڈھینڈھا کسے کہتے ہیں؟"

پتنگا نے پھر بڑے زوروں سے نفی میں گردن ہلا دی تو کنیز کو ہنسی آگئی بولی "خیر سب جان لو گی، ابھی تم منہ بند کلی ہو۔ مگر دیکھو بوا نہ تو کبھی سنجھلے نواب کی طرف جانا ــــ اور ــــ اور"

کنیز رُکی تو پتنگا نے پوچھا "اور کدھر؟"

کنیز نے کہا" اور تہہ خانے میں بھی نہ جانا ــــ جانتی ہو یہ جو اتنی بڑی سی شہ نشیں اور دو بڑے بڑے دالان ہیں ان کے نیچے کیا ہے؟"

"تہہ خانہ" پتنگا نے کہا "مجھے معلوم ہے، میں بچپن میں ایک بار نانی کے ساتھ یہاں آچکی ہوں۔ تہہ خانے میں جن رہتے ہیں نا ــــ"

"ہائے بوا جن نہیں ــــ ایک بامن آیا تھا بتاتا تھا کہ تہہ خانے میں اشرفیوں سے بھری ہوئی سینکڑوں دیگیں چھت سے لٹک رہی ہیں ــــ مگر ہر دیگ پر سیاہ سانپ پھن کاڑھے بیٹھا ہے۔ بامن نے کہا بیگم صاحبہ یہ مایا آپ کو نہیں مل سکتی۔ آپ کی اولاد کو ملے گی

یا پھر اولاد کی اولاد کو ــــــ"

"ہائے میرے اللہ اگر سانپ نکل آئیں تو؟" پتنگا نے کہا۔

منجھلے نواب کے دیوان خانے سے الاپ کی آواز آرہی تھی اور ستار کی لے پر اس الاپ سے عجب کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔

ہلکی سی دھوپ بھی نکل آئی تھی لیکن دھند بہت دھیرے دھیرے چھٹ رہی تھی شہ نشیں کی طرف سے بیگم صاحبہ کی پاٹ دار آواز سنائی دی "ہرمزی خانم (یہ آتو جی کا نام تھا)۔!!"

"حاضر ہوئی سرکار!" ہرمزی خانم پیر میں جوتی گھسیٹتی ہوئی اندر دالان میں چلیں۔

ڈیوڑھی پر ہزاری نے آواز دی ــــ محلدار ــــ اے محلدار ــــ دیوان جی بیگم صاحبہ کو کورنش عرض کرتے ہیں۔"

بیگم صاحبہ نے پاندان سے گلوری بناتے ہوئے ہرمزی خانم سے کہا۔ "پتنگا چھوٹی بیگم کی خدمت پر مامور کی جاتی ہے۔ یتیم بھی ہے یسیر بھی۔ ذرا تم سب اُس کا خیال رکھنا ــــ دیوان جی کو ہماری بندگی کہو۔"

"بہت بہتر۔" آتو جی نے مودّب ہو کر ایک فراشی سلام خود بھی عرض کیا "بندی بھی تسلیم بجا لاتی ہے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا۔ "ذرا ہم پتنگا سے ملنا چاہتے ہیں ــــ چھوٹی بیگم نے وظیفہ تمام کر لیا ہو تو انھیں بھی بلانا۔"

جس طرح کسی عمارت میں مینار بنا کر ادھورے چھوڑ دیے جاتے ہیں، مہتابیوں کی شکل تو ایسی ہی تھی لیکن، حویلی کو دور سے دیکھئے تو یوں لگتا جیسے کسی پرندے نے بازو سمیٹ کر

پرواز بند کردی ہو ـــــ ان مہتابیوں پر جو نیچے سے زینے جاتے ہیں، وہ بھی میناروں کے زینوں کی طرح گردشی شکل میں بنے ہیں، لیکن ان پر چڑھنے کا موقع پتنگا کو کبھی روزن تک نہ مل سکا چھوٹی بیگم نے اسے ذرا بھی مہلت نہ دی کبھی اس سے لحاف سلوائے، رضائیاں ٹھیک کروائیں سینچی آفتابے منجھوائے، چھت گیریاں درست کروائیں، تکینوں اور تکیوں کے غلاف بدلوائے اور جب ان سب کاموں سے فرصت ہوئی تو بدن دبوایا ـــــ اور جب رات گئے تک کام کرنے سے وہ چور چور ہوگئی تو پڑ کر سوگئی۔ اسے کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔

ایک روز صبح صبح ڈیوڑھی پر آواز آئی: ''رکابدار حاضر ہوا ہے سرکار۔''
کئی بار جب رکابدار نے آواز دی اور کوئی ڈیوڑھی پر نہ گیا تو چھوٹی بیگم نے پتنگا کو دوڑا دیا۔

''جوزیات حاضر ہیں، حبشی بھی ہے، جوزی بھی پستے کی برفی بھی ہے، اور بڑی سرکار کے لئے ایک ہدیہ بھی لایا ہوں ـــــ'' رکابدار نے کہا اور ایک رکابی جو بڑے اہتمام سے سجا کر لایا تھا، بڑھا دی۔ پتنگا نے ابھی رکابی تھامی بھی نہیں تھی کہ ایک ہاتھ اس کے اوپر سے آیا اور رکابی جھپٹ لی۔ اس نے اوپر دیکھا تو ایک لحیم شحیم آدمی لنگوٹ باندھے اس کے پیچھے کھڑا حلوہ سوہن کھا رہا تھا۔ ڈر کے مارے جو چیخ اس کے حلق تک آگئی تھی اس کو اس نے دبا دیا۔ سرخ و سفید رنگت، چوڑی چکلی چھاتی، پتلی کمر، بازو، رانیں اور پنڈلیاں پُر گوشت، آنکھوں میں جوانی اور قوت کا خمار ـــــ بڑے نواب بیچ بیچ مردانہ حسن کا بہترین مرقع تھا۔ دیکھتے دیکھتے رکابی خالی کر کے اس نے پتنگا کے ہاتھ پر رکھی اور یہ جا وہ جا ـــــ بیچاری پتنگا چوتی بن کر رہ گئی۔ کیا کرے کیا نہ کرے ـــــ چار و ناچار چھوٹی بیگم سے اس نے واقعہ بیان کیا تو انھوں نے اسے خاموش رہنے کو کہا اور رکابدار کو روپے بھجوا دیئے ـــــ اسی وقت

سے بڑے نواب کا ڈیل ڈول اس کے ذہن پر چھا گیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کہ مردانہ حسن بھی کوئی شے ہوتا ہے اور وہ اس طرح نگاہوں میں کھب کر رہ جاتا ہے —— کنیز اس کی دمساز اور ہمراز تھی، لیکن یہ راز تو اس نے کنیز تک کو نہ بتایا۔ بس دل و دماغ میں بڑے نواب کی من موہنی تصویر کو دبا کر چپ چاپ اس کی پرستش کرنے لگی۔ بڑے نواب کی ایک ہی جھلک نے اِس کو ان کا والہ و شیدا بنا دیا۔ اس کو حویلی اور بھی حسین نظر آنے لگی۔

جاڑوں میں اگر مہاوٹیں لگ جائیں تو سردی خوب چمکتی ہے دو دن تک سورج مطلق نظر نہ آیا۔ دالانوں کے دروازے بند، پردے پڑے ہوئے، انگیٹھیاں روشن اور لوگ دبکے دبکائے لحافوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نوکر چاکر، پیش خدمتیں، لونڈیاں باندیاں سب حاضر باش، حکم کے منتظر بار بار ڈیوڑھی پر ہزاری آکر آوازیں دیتا "پتنگا —— " اور پتنگا ادیدا کر ٹال ٹال جاتی کبھی کنیز کو بھیج دیتی، کبھی زعفران کو۔

چھوٹی بیگم کے بدن میں دو دن سے سخت درد تھا اور وہ صحنچی میں اپنے چھپر کھٹ پر پڑی ہوئی تھیں۔ پتنگا ان کے کمر کولھے دبا رہی تھی۔ ایک پیش خدمت سرہانے کھڑی ہوئے آگ کی انگیٹھی دھونک رہی تھی۔ دوسری دھیرے دھیرے "مثنوی زہرِ عشق" سنا رہی تھی۔ چھوٹی بیگم نے پان کی ایک گلوری کھا کر دھیرے سے کہا: "اری پتنگا —— دیکھ یہ موا ہزاری بے طرح تیرے پیچھے پڑا ہوا ہے، بار بار تجھے جو ڈیوڑھی پر بلاتا ہے تو کہیں کوئی جادو ٹونا نہ کر دے —— تو تو ابھی پھوٹتی کونپل ہے، وہ مردار بڑا گھاگ ہے۔"

چھوٹی بیگم صاحبہ —— میں اس موئے کو اپنی پتنگا کی ایڑی چوٹی پر سے سات بار

داروں ـــــ اس کے منہ کو لوکا ـــــ اے ہے آئینے میں اپنی صورت تو دیکھے ـــــ"
آگ دھونکنے والی ملازمہ بولی۔

زہر عشق پڑھتے پڑھتے پیش خدمت رُکی اور رُک کر بیگم صاحبہ کی طرف دیکھنے لگی۔

بیگم صاحبہ نے ایک لمحے کو پتنگا کی بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں جھانک کر کہا "ماشاء اللہ، چشم بد دور، تیری یہ بڑی بڑی آنکھیں تو بالکل آم کی پھانکیں ہیں۔"

پتنگا شرما گئی، ہولے سے بولی "اے ہے چھوٹی بیگم صاحبہ، کیوں بناتی ہیں مجھ نگوڑی کو ـــــ میں تو آپ کو دیکھتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ یہ مردوئے بھی کیسے بدنگاہ ہوتے ہیں ـــــ آخر سرکار کیا رکھا ہے ان مردار بازاری عورتوں میں۔ میری سمجھ میں تو خاک کچھ نہیں آتا۔ آپ کا حسن ہزاروں میں ایک ہے بی بی۔"

چھوٹی بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اسی لمحے پتنگا کو یوں محسوس ہوا کہ درد جسم میں نہیں دل میں ہے۔ چھوٹی بیگم کے شوہر نے ایک بازاری ڈال لی تھی اور دو تین برس سے چھوٹی بیگم میکے میں آ کے پڑ رہی تھیں مگر شوہر نے پلٹ کر کروٹ تک نہ لی تھی۔ آنسو خشک کر کے بولیں "بوا یہ اپنی اپنی قسمت ہے، جسے پی چاہیں وہی سہاگن۔" اور پھر مثنوی پڑھنے والی ملازمہ کو اشارہ کیا، وہ جھوم جھوم کر پڑھنے لگی۔

رنگ خوبی عطا کیا گل کو   نالہ و درد بخشا بلبل کو

باہر آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے اور پانی برابر برس رہا تھا۔ ذرا بھی دروازے کی دراز کھلتی تھی تو ہوا کا تیز جھونکا آتا تھا اور کلیجے کے پار ہو جاتا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ شہ نشین پر آنکھیں موندے ہوئے تمباکو کا ٹکڑا چبانے اور ادھر ادھر تکیے سے ٹیک لگائے خاموش ہو کر پاشن رہی تھیں۔ ایسے میں کئی بار پتنگا کا جی چاہا کہ ذرا بڑے نواب کو جا کر ایک نظر دیکھ آئے۔ لیکن جی مسوس کر رہ جاتی تھی اور وہیں بیٹھی رہ جاتی۔ بس وہ چھوٹی بیگم کے کمرے کو ٹلے

دبا رہی تھی۔ مثنوی بدستور جاری تھی۔

اس سے جس نے ذرا تپاک کیا — سب سے پہلے اسے ہلاک کیا

بس میں ڈالے نہ کبریا اس کے — رحم دل میں ذرا نہیں اس کے

آتش ہجر سے جلاتا ہے — آگ پانی میں یہ لگاتا ہے

پتنگا کا جی اوب اوب گیا، یا دلوں کی ایسی چھت بندھ گئی تھی کہ باہر آسمان کے نیچے نکلنا محال اور اندر دالانوں میں گھس کر بیٹھنا دوبھر تھا۔ بھلا چھوٹی بیگم کی المناک زندگی سے اسے کب تک دلچسپی رہتی ——— بارے کنیز آئی، اشارے سے اس کو آنکھ مار کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد پتنگا بہانے سے اٹھی۔ اپنے حجرے میں آئی تو دیکھا کنیز کے ہاتھوں میں نئی چوڑیاں چمک رہی ہیں۔

کنیز اسے دیکھتے ہی مارے ہنسی کے دُہری ہو گئی بولی "جانتی ہے پتنگا کون لایا؟"

"میں کیا جانوں؟"

"اری سُن تو ——— وہ موا ہزاری تیرے لئے لایا تھا، میں نے کہا یہ تو میں پہنوں گی، اس کو اور لا دینا۔ بولا کنیز، دیکھو یہ مذاق اچھا نہیں جس کی چیز ہے اس کو ملنا چاہیئے۔ پتنگا اجازت دے تو لو ——— تو بھئی اب تمہاری کیا رائے ہے؟"

جھلسا موئے کو۔"

اس وقت منجھلے نواب کے مکان سے ستار پہ گانے کی آواز آئی:

مہاراجا۔ ہووو ——— کر دوڑیا اااا کھو لو دو وو

رس کی ہی ہی بوند اپڑے۔ ے ے ے

ارے مہاراجا ہو ددو ——— رس کی بوندا پڑے۔ ے ———

پتنگا کو یوں لگا جیسے بارش کی ایک ایک بوند رس میں ڈوبی ہوئی سچ مچ اس کے دل کے کواڑ پر ٹپ ٹپ کر کے گر رہی ہے اور دل کا کواڑ ہولے ہولے دھیرے دھیرے یوں کھل رہا ہے جیسے نئی نویلی دلہن کا گھونگھٹ سرکتا ہے۔ وقت اور سر کا اگر سنجوگ ہو جائے تو کائنات بھی ایک نقطے پر سمٹ آتی ہے۔ منجھلے نواب کی آواز میں سچ مچ جادو تھا۔ پتنگا آنکھیں بند کر کے پلنگ پر لیٹ گئی اور جب تک گیت کی آواز بارش کے ملے جلے سنگیت پر اس کے کانوں سے ٹکراتی رہی وہ چپ چاپ پڑی رہی —— گیت ختم ہوا تو آنکھیں کھول کر دیکھا کنیز جا چکی تھی۔

درخت کی پتلی پتلی ڈالوں پر دھیرے دھیرے پتنگا چڑھی اور جب گھنی گھنی شاخوں میں خوب اچھی طرح چھپ گئی تو اس نے منجھلے نواب کے مکان کے دالان کی طرف نگاہ اٹھائی جہاں مسند پر منجھلے نواب گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے تھے۔ خوب بڑی بڑی مونچھوں سے ان کے چہرے سے عجب جلال ہویدا تھا۔ انگرکھے اور چوڑی دار گھٹنے میں ان کا مضبوط جسم بھلا معلوم ہو رہا تھا دوست احباب جمع تھے اور رنڈی کا طائفہ حاضر تھا۔ سارنگی اور طبلے کی سنگت پر ایک نوخیز رنڈی بھاؤ بتا بتا کر گا رہی تھی:

ارے مورا سیاں، سوتن گھر نہ جا

〃 〃 〃 〃 〃 سوتن گھر نہ جا، بیرن گھر نہ جا

ارے مورا سیاں

تو تو کہے موری بالی عمریا

〃 〃 〃 〃 〃 ابھی تو ہوں لڑکیاں سوتن گھر نہ جا

اوپر پتنگا چڑھی ہوئی اور نیچے کنیز کھڑی ہوئی تھی، آتو کے ڈر کے مارے جلدی سے وہ نیچے

اتری تو اُس کی جان میں جان آئی۔ جلدی سے باغ کے باہر جانا چاہتی تھی کہ اس نے دیکھا
چھوٹے نواب پھولوں کا گلدستہ بنا رہے ہیں اور کچھ گنگنا رہے ہیں۔ دبے پاؤں دونوں محلسرا
میں آگئیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کے سینوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تو دل بلیوں اچھل رہے تھے
اسی وقت آتو کی آواز آئی "پتنگا ——— !"

"آئی آتو جی" پتنگا کے بولنے سے پہلے ہی طوطا بولا تو پتنگا کو ہنسی آگئی۔ دو چار صلواتیں
سنانا چاہتی تھی کہ اس نے دیکھا چھوٹی بیگم نہانے کی چوکی پر بیٹھی ہیں۔ سر کے بال کھلے ہیں نیچے لُنگی
میں کھلی بھیگی ہوئی ہے اور بال دھوئے جا رہے ہیں ——— سر ڈھلوا کر چھوٹی بیگم نے آتو سے کہا "آج
سے حمام میں پتنگا بیٹھ دھویا کرے گی۔ آتو جی، تمہارے ہاتھوں میں اب دم نہیں رہا"

آتو نے پتنگا کو گھورا اور زبان سے کہا "بہت بہتر صاحبزادی!"

یہ بھی پتنگا کا زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ اکیلے حمام میں پچیس چھبیس برس کی ایک کڑیل
جوان عورت اس کے سامنے مادر زاد ننگی کھڑی تھی جس کے سیاہ گھنے بال ٹخنوں تک لوٹ رہے
تھے اور جس کا بدن کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ جلد کے نیچے جیسے ہلکی ہلکی آنچ سی اس کو اٹھتی
ہوئی محسوس ہوئی۔ بیٹھے ملتے ملتے کئی بار اس کے جی میں آئی کہ ان گداز مرمریں کمر کولھوں میں
گدگدی کر دے لیکن چھوٹی بیگم کے مزاج سے بھی وہ واقف تھی۔ چپ چاپ بیٹھی ملتی رہی ———
نہا دھو کر جب چھوٹی بیگم باہر نکلیں تو عورت کے جسم کا جادو پتنگا پر منکشف ہو چکا تھا اور
آج صحیح معنوں میں اس کے دل میں چھوٹی بیگم سے ہمدردی اور ان کے بد ذوق شوہر سے
شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ چھوٹی بیگم بال سکھانے کے لئے اوپر کوٹھے پر چڑھ گئیں تو پتنگا بھی اوپر
چلی گئی ——— چاروں طرف چھوٹے چھوٹے کچے پکے مکانات بنے تھے۔ جہاں غریب غربا آباد
تھے۔ اوپر کھلا ہوا وسیع آسمان تھا۔ دور مشرق کی جانب کھیت اور باغ نظر آتے تھے۔ سڑکوں پر

اکّا دکّا بگھیاں، اِکّے تانگے نظر آرہے تھے۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح دیکھتے دیکھتے ایک مہتابی پر چڑھ گئی۔ جہاں سے شمال کی جانب گومتی ندی نظر آرہی تھی جو واقعی گھومتی گھامتی چکر کاٹتی بڑے ہی ٹھسّے سے بہہ رہی تھی۔ جنوب کی طرف شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد نظر آتی تھی اور مغرب کی طرف سبزہ ہی سبزہ — یہ تو دور کے مناظر تھے۔ محل سرا سے متصل مکانات کا نظارہ بھی بخوبی ہو سکتا تھا۔ اچانک دھائیں دھائیں —— دو فائر ہوئے اور برابر کی مہتابی سے شعلے نکلے، پتنگا دھک سے رہ گئی۔ درختوں سے شور مچاتے ہوئے کوّے اڑ گئے اور فضا میں بدبو سی پھیل گئی۔

"پتنگا!" چھوٹی بیگم زینے میں آکر چیخیں۔

"جی!" سہمی ہوئی آواز میں وہ بولی۔

"نیچے آ۔"

اور جب وہ نیچے پہنچی تو اس نے دیکھا کہ بڑے نواب انگریزی برجس پہنے، گلے میں کارتوسوں کی پیٹی ڈالے، ہاتھ میں بندوق لئے کھڑے ہیں، شکار پر جانے کی تیاری ہے۔ بڑی بیگم صاحبہ کھڑی دعائیں دم کر رہی ہیں۔ آتو قرآن گھوٹے نواب کو گرویں کرنے کو تیار کھڑی ہیں۔ باہر تمام ملازمین حاضر ہیں۔ ہاتھی پر ہودا کسا ہوا ہے۔ ڈیوڑھی کے سامنے ہزاری دہی کی مٹکی نیک شگون کے طور پر لئے کھڑا ہے۔ نواب کا تازہ تازہ شکار ایک کبوتر تھا۔ حکم دیا گیا کہ اس کا خون نواب کے تلوؤں پر لگا دیا جائے۔ دیکھتے دیکھتے ساری پیش خدمتیں، دوڑیں۔ کسی نے نواب کا شکاری جوتا اتارا، کسی نے جراب اتاری اور کسی نے ایڑی پر خون ملا۔ اور پتنگا کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کر سکی۔ بس ٹکٹکی باندھے ہوئے نواب کو تکتی ہی رہی۔ بڑی بیگم نے چاندی کے دو روپے نواب کی مٹھیوں میں دبائے اور کہا: "بیٹا یہ مستحقین کو اپنے ہاتھوں سے بانٹ دو۔"

نواب نے گردن کے اشارے سے پتنگا کو بلایا لیکن اس کے قدم زمین پر جم کر رہ گئے تھے۔ چھوٹی بیگم نے کہا "جا پتنگا لے لے۔"

اور پتنگا کے ذہن میں معاً بجلی سی لہرائی۔ بھولی بسری ایک بات یاد آئی۔ بولی "ہم سادات آلِ رسولؐ ہیں، ہم پر صدقہ حرام ہے!"

نواب کا چہرہ اتر گیا۔ بڑی بیگم اور چھوٹی بیگم سناٹے میں آگئیں تو کو وہم ستانے لگا تمام نوکروں میں سرگوشیاں اور کانا پھوسیاں ہونے لگیں۔ نواب کا قفلِ دہن کھلا: "معاف کرنا سیدانی بی ــــ تم ہمیں دعا دے کر رخصت کرو۔" نواب نے یہ دیکھے بغیر کہ کون مستحق روپے لے رہا ہے مٹھیاں کھول دیں اور مبارک سلامت کی فضا میں سب نے دامن پھیلا پھیلا کر دعائیں دیں۔

پتنگا نے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے کہا "خدا حامی و ناصر!"

نکونا ہاتھی جھومتا ہوا حویلی کے سامنے سے گزرا۔ ہر ایک شخص مکان کے چھجے کے اوپر ہاتھ اٹھا اٹھا کر خدا حافظ ــــ خدا حافظ، اللہ بیلی، اللہ نگہبان کہہ رہا تھا اور نواب اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہودے میں بیٹھے ہوئے چلے جا رہے تھے۔

ایک پتنگا کیا سارا گھر اداس تھا کہ سرِ شام ایک اور گل کھلا ــــ بجھلے نواب ہاتھ میں بندوق لئے دندناتے ہوئے گھر میں آگھسے۔ سیدھے بڑی بیگم کی طرف چلے گئے۔ نوکر چاکر دہل گئے۔ جس نے چیخنے چلانے کی نیت کی نواب نے بندوق کی نالی اسی کی طرف کر دی۔ بڑی بیگم بھی بڑے ہی دل گردے کی عورت تھیں۔ ذرا بھی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ بڑی دلجمعی اور اطمینان سے بیٹھی رہیں۔ نوکروں سے کہا آنے دو، اور بجھلے نواب اپنی بڑی بڑی بھیانک مونچھوں میں مسکرائے تو پتنگا کو وہ ایک خوفناک ڈاکو نظر آئے جس کے دل میں سفاکی اور

بے رحمی کوٹ کوٹ کر بھری رہتی ہے اور اس نے کئی بار سوچا کہ وہ کچھ کرے۔ آتو پر رعشہ چھوٹا ہوا تھا چھوٹی بیگم کی گگھی بندھی ہوئی تھی اور پتنگا در سے لگی کھڑی ہوئی سب کچھ دیکھ تو رہی تھی لیکن اس پر خوف طاری تھا۔ کنیز نے صحنچی سے نکل کر جو یہ منظر دیکھا تو تڑسے زمین پر گری اور بے ہوش ہوگئی۔ سنجھلے نواب نے بڑھ کر بندوق کی نالی بڑی بیگم کے سینے پر رکھ دی" او کھوسٹ!" انھوں نے اپنی ماں کو مخاطب کیا" ساری دولت اپنے الفتوں کے کلیجے میں اتار رہی ہے ــــ مجھے دو تین سو روپے پر ٹرخا دیتی ہے۔ یہ نہیں جانتی کہ لڑکا جوان جہان ہے کچھ اس کی اور بھی ضرورتیں ہیں ــــ نکال اپنا صندوقچہ ــــ کدھر چھپایا ہے ہیروں کو اپنے ــ لا نکال میرے حوالے کر ــــ"

بڑی بیگم صاحبہ نے کہا:" او نامراد، مردود، شیطان، ازلی، یزید کے ساتھی ــــ کیا میں تیری ان گیدڑ بھبھکیوں میں آجاؤں گی ــــ خدا تیرا منہ کالا کرے، دنیا اور آخرت دونوں میں تو ذلیل و خوار ہووے ــــ"

"او بڑھیا ــــ کیوں تیری شامت گھیر رہی ہے:" اور یہ کہہ کر سنجھلے نواب نے بیگم صاحبہ کا منہ دوپٹے سے باندھ دیا۔ پلنگ کی ادوائن کھول ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور مقابے سے کنجی نکال کر صندوق کھول کر صندوقچہ برآمد کر لیا۔ نہایت فاتحانہ انداز سے صندوقچہ لے کر وہ چلے تو پتنگا چیل کی طرح جھپٹی لیکن ایک ہی لمحے میں اس کی دونوں کلائیاں سنجھلے نواب کی گرفت میں تھیں اور وہ ہمس بھی نہیں سکتی تھی۔ سنجھلے نواب نے قہقہہ لگا کر کہا:" تم تو خود ہیرا ہو ــــ کہاں چھپیں تھیں؟ ہیرے جواہرات بھی ملے اور تم بھی ہاتھ لگیں" پھر وہ ماں سے مخاطب ہو کر بولے" دیکھ بڑھیا یہ میرا سالانہ خراج ہے ــــ اور یہ میری خدمت کے لیے لونڈی ــــ"

اچانک سامنے سے منجھلے نواب ہاتھ میں ستار لئے اور چھوٹے نواب دیوان لئے ہوئے دوڑے دوڑے آئے اور منجھلے نواب نے قہقہہ لگایا ـــــ پتنگا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ صندوقچہ بغل میں دبا کر دو ہوائی فائر گئے اور یہ جا وہ جا۔

محلسرا میں کہرام پڑ گیا۔ بڑی بیگم صاحبہ کو سب نے کھولا تو جھکوں پھکوں رو رہی تھیں اور منجھلے نواب کا منہ چھوٹے نواب اور چھوٹے نواب کا منہ منجھلے نواب تک رہے تھے۔ پتنگا اپنی کلائیوں کو سہلا رہی تھی۔ کنیز کلّے فرش پر جو گری تھی تو اس کا سر کھل گیا تھا اور خون کی ایک لکیر سی فرش پر بہتی چلی گئی تھی۔ باہر سے ہزاری اور دیوان جی زوروں سے چیخ چیخ کر پوچھ رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی کہ پتنگا دوڑ کر ڈیوڑھی پر چلی گئی اور ہول جول میں یہ بھی بھول گئی کہ وہ بغیر دوپٹے کے ہزاری کے سامنے پہنچ گئی۔ اس نے سارا واقعہ دیوان جی کو سنا دیا تو وہ دونوں سناٹے میں آ گئے ـــــ دیوان جی پر یک بارگی رقت کا ایسا دورہ پڑا کہ وہ چیخ چیخ کر رونے لگے اور روتے ہوئے اندرونی ڈیوڑھی پر چلے گئے" بڑی بیگم صاحبہ!" دیوان جی نے ہچکوں ہچکوں روتے ہوئے کہا" آج معلوم ہوا ہے کہ ہم بے والی وارث ہو گئے ـــــ ارے اس ڈیوڑھی کو خدا سلامت رکھے ـــــ کیسے دن آ گئے ہیں، شریف اشراف کیا کیا چلن اختیار کر رہے ہیں۔"

ہزاری نے چپکے سے کہا" دیکھ پتنگا۔ اب تیری عزت خطرے میں ہے۔ بلّی کے منہ کو خون لگ چکا ہے، اب منجھلے نواب سے آبرو بچانا مشکل ہے۔ تو میرا کہا مان ـــــ میرے ساتھ چلی چل۔ تیرے تلوے دھو دھو کے پیوں گا۔ اللہ کی قسم تجھے بیگموں کی طرح رکھوں گا۔

پتنگا اپنی کلائیوں کو سہلا سہلا کر رونے لگی اور ہزاری اپنے انگوچھے سے اس کے آنسو خشک کرنے لگا اور اس بات کا پتنگا نے مطلق برا نہ مانا ـــــ لیکن، جب ہزاری نے بھاگ چلنے

پر اصرار کیا تو اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ ڈیوڑھی سے لوٹتے وقت ہزاری نے پھر کہا: "دیکھ پتنگا۔ بہت پچھتائے گی —— اور اپنے ساتھ میری بھی مٹی پلید کرے گی۔"

جب پتنگا وہاں سے واپس آئی تو کنیز کے سر میں پٹی بندھی تھی اور وہ چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی۔ آتو چھوٹی بیگم کے تلوے سہلا رہی تھی اور زعفران کے سوا ہر ایک پریشان اور سراسیما نظر آتا تھا۔ چھوٹے نواب اور منجھلے نواب اب تک خاموش کھڑے تھے، جیسے وہ اس حویلی کے دو عالیشان ستون ہوں اور بس۔

بڑے نواب چار پانچ روز کے بعد شکار کھیل کر واپس آئے تو سارا واقعہ اُن سے چھپا ڈالا گیا۔ سخت تاکید کردی گئی کہ اس حادثے کی ہوا بھی نہ دی جائے ورنہ اسی گھر سے مچیاتی ہوئی کئی لاشیں نکل جائیں گی۔ بس بڑے نواب کا گھر میں سرد مہری سے جو خیر مقدم کیا گیا تو خود ان کا ماتھا ٹھنکا۔ ماں کی علالت بھی ان کو کچھ فرضی معلوم ہوئی۔ اُنھوں نے منجھلے اور چھوٹے نواب سے مل کر کچھ معلوم کرنا چاہا لیکن بے سود۔ آتو سے پوچھا تو وہاں پانچ سیر کا اُن کے منہ پر قفل لٹک رہا تھا۔ بہن سے معلوم کیا لیکن اُن کے جواب سے بھی تشفی نہ ہوئی۔ رات کا کھانا کھا کر جب نواب اپنے ٹھکانے پر جانے لگے تو پتنگا کے پاس اس کے حجرے میں آگئے۔ "سیدانی بی!" بڑے نواب نے دھیرے سے کہا۔ "ہم تمہاری دعا سے واپس تو آگئے —— لیکن ہمارے آنے سے کسی کو خوشی نہیں ہوئی۔ ہر ایک ناراض ناراض سا نظر آ رہا ہے۔ خدا معلوم کیا بات ہے جیسے کوئی بہت بڑا راز مجھ سے چھپایا جا رہا ہے —— تم ایک ذرا اوپر نہیں آسکتیں؟ —— میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

جواب کا انتظار کئے بغیر ہی نواب مڑے تو ایک سایہ سا دیوار کے پاس رینگا —— نواب نے

کہا "کون ؟" لیکن جواب ندارد — پتنگا نے بھی حجرے کے باہر آکر دیکھا تو زعفران کے حجرے میں وہ سایہ دبک کر چلا گیا، اور جب نواب نے زعفران کے کمرے میں جا کر لیمپ کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک کونے میں زعفران دبکی ہوئی یوں بیٹھی تھی جیسے بھیگی بلی۔

پتنگا نے نواب کے پاس جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا، اس کو زعفران کی سازش سے ڈر لگا۔ نواب بے خبر تھے لیکن انھیں کیا معلوم کہ زعفران کیا کر رہی تھی۔ صرف آتو کو اور چند نوکروں کو خبر تھی۔ آتو نے بڑی بیگم کے کان بھرنا شروع کئے تو اچانک ایک دن ہزاری سے چپکے ہی چپکے دائی کو بلوایا گیا دائی نے زعفران کو علیحدہ حجرے میں لے جا کر ٹٹولا تو دھک سے رہ گئی۔ ماں بننے کے آثار ظاہر تھے۔ جب دائی نے فتویٰ دے دیا تو چپکے ہی چپکے بہت سا روپیہ دے کر دائی کا منہ بند کر دیا گیا۔ بڑی بیگم نے تنہائی میں زعفران کو بلوا کر راز اگلوانا چاہا تو وہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ ساری محلسرا میں اُدھم تھا لیکن بڑے نواب کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی گئی۔ آتو کے ذریعے ہزاری کو زعفران سے منسوب کرنے کے جتن ہونے لگے لیکن وہ ایک ہی گھاگ تھا، سمجھ گیا۔ آتو سے کہا کہ "بیگم صاحبہ ایسی ہی مہربان ہیں تو پتنگا سے نکاح کرا دیں، میں راضی ہوں، "آتو نے کہا کہ "پتنگا سیدانی ہے تو شیخ زادہ"۔ اور جب زعفران کے ساتھ شادی کر لینے میں اسے لمبی چوڑی رشوت کی رقم بھی پیش کی گئی تو ہزاری بپھر کر بولا "آتو جی تم کو تو خدا کو منہ دکھانا ہے — ایمان ایمان سے کہہ دو کہ اگر تمہارا بیٹا ہوتا تو تم زعفران کو اپنی بہو بنا لیتیں"۔ "آتو کے منہ سے نکلا "اے توج، ہم بی بی کا دانہ کھاتے ہیں میاں — نوابوں کا اُلش نہ ہم کھائیں، نہ اپنی اولاد کو کھلائیں — میاں بات سچی ہے ذات نہیں —" یہ کہہ کر مڑیں تو دیکھا بڑے نواب کھڑے تھے۔ نواب نے آتو کو گھور کر دیکھا، پھر اُلٹے پیروں اپنی ماں کے پاس گئے "اماں جان مجھے سب معلوم ہو گیا"۔ اور اماں جان (بڑی بیگم) کے آنسو بہنے لگے بولیں "بیٹا — کیا کروں، خاندان کی لاج تو رکھنا ہی ہے۔ اس نالائق نے تو خاندان کی عزت کو بٹہ لگا یا ہی ہے"۔

"خاندان کی لاج ؟" بڑے نواب بڑبڑائے شام کی ہوا خوری کے لئے انگریزی برجس پہن کر گھوڑے پر سیر کرنے جارہے تھے۔ ہاتھ میں تازیانہ تھا۔ زوروں سے اپنی پنڈلی پر پٹخنے لگے۔ پھر زوروں سے آواز دی: "سیدانی بی ـــــ سیدانی بی"

اور پتنگا لرزتی ہوئی آپہنچی "جی بڑے نواب صاحب!"

بڑے نواب نے شہ نشین کے ایک در میں لٹکے ہوئے قرآن مجید کو جزدان سے نکال کر پتنگا کے ہاتھوں پر رکھ دیا "تم کو اسی کلام ربانی کی قسم ـــ میرے پیچھے یہاں جو کچھ ہوا ہے سب ابھی ابھی مجھے بتادو"

بے چاری پتنگا کانپ کر رہ گئی۔ اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ ہر ملازمہ اور پیش خدمت آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے منع کر رہی تھی۔ چھوٹی بیگم نے بھی آنکھ کے اشارے سے منع کیا۔ اس نے بڑی بیگم کی طرف دیکھا۔ نگاہیں چار ہوئیں تو بیگم صاحبہ نے نظریں جھکا لیں۔

بڑے نواب چیخ کر بولے "سیدانی بی ـــ تمہارے جد حضرت امام حسین علیہ السلام نے یزیدیوں کے نرغے میں گھر کر بھی سچی بات کہی تھی، حق بات کہی تھی، تمہارے خاندان کا یہی شیوہ ہے کہ پھانسی کے تختے پر بھی بے باکی سے سچ اور حق بات کہہ گزرتے ہیں ـــ تم صاف صاف کہو"

پتنگا کی گردن فخر سے بلند ہو گئی۔ بڑی بیگم چھاتی کوٹ کوٹ کر رونے بلکنے اور تڑپنے لگیں۔

بڑے نواب نے کہا: "اماں جان میرے سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ میں اس آگ میں جلا جارہا ہوں ـــ لیکن مجھے کوئی سچی بات نہیں بتاتا"

پتنگا بولی: "بڑے نواب میرے سینے میں بھی سچائی کا نور اتر آیا ہے ـــ لیجیے میں سب کچھ بتائے دیتی ہوں"

اور اس نے سارا واقعہ من وعن سنا دیا تو نواب تڑپ کر صحن میں صحن اور صحن سے باغ کی طرف اور باغ کی دیوار پھاند کر منجھلے نواب کے مکان کے صحن میں آگئے۔ منجھلے نواب کا گریبان پکڑ کر کھینچتے ہوئے محلسرا میں لے آئے اور اس قدر تھپڑ، جوتے اور گھونسے اور تازیانے مارے کہ منجھلے نواب کا سارا نشہ

برن ہو گیا اور سارا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ تمام عورتیں چھڑانے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن کسی کا بس نہیں چلتا تھا اور بڑے نواب کا ہاتھ رکتا ہی نہ تھا اور غصہ تھا کہ چڑھی آندھی کی طرح امڈا امڈ کر آ رہا تھا۔ بالآخر بڑے نواب نے محلسرا کے ایک ستون میں سنجھلے نواب کو باندھ دیا اور اوپر سے بھری بندوق لے آئے۔ چاہتے تھے کہ کام تمام کر دیں کہ ماں کی ماری ماں دوڑ کر سنجھلے نواب سے چمٹ گئی —— اس وقت وہ بڑی بیگم صاحبہ نہیں تھیں۔ صرف ایک ماں تھیں۔

"ہٹ جائیے اماں جان! اس مردود کو جہنم واصل ہونے دیجئے —— اس نے خاندان ہی کی عزت کو بٹہ نہیں لگایا، انسانیت کو قتل کیا ہے —— یہ قاتل ہے اور قاتل کی سزا موت ہے۔"

ادھر چھوٹی بیگم بھی بڑے نواب کی بندوق پکڑے ہوئے زار و قطار رو رہی تھیں اور سنجھلے نواب پھٹی پھٹی نظروں سے ہر طرف دیکھ رہا تھا۔

اللہ اللہ کر کے بڑے نواب کو ٹھنڈا کیا گیا۔ ماں نے بڑے بیٹے کے قدموں پر سر تک رکھ دیا لیکن طے یہ پایا کہ سنجھلے نواب کو اسی طرح بندھا رہنے دیا جائے۔ چھوٹی بیگم نے چہرے کا لہو صاف کیا۔ بڑے نواب نے بندوق سامنے رکھ دی اور ماں کی چھاتی پر سر رکھ کر خوب روئے۔ تمام گھر میں عورتیں رونے لگیں —— پتنگا از راہ ہمدردی پانی کا کٹورا بھر کر سنجھلے نواب کو پلانے لے گئی۔ سنجھلے نواب کے چہرے پر ہلکی سی خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ کٹورا لیتے وقت لبوں پر ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے سرگوشی میں کچھ کہا جسے سنتے ہی معاً پتنگا کٹورا پھینک کر جوتی اتار کر دھڑا دھڑ مارنے لگی۔

"کتنے رذیل —— کیا سمجھا ہے تو نے؟ —— کیا مجھے زعفران سمجھا ہے تو نے؟"

تمام نوکر چاکر دوڑ پڑے۔ بڑے نواب بھی بپھری ہوئی شیرنی کے تیور دیکھ کر تعجب میں پڑ گئے اور ابھی سراسیمگی کم نہ ہوئی تھی کہ دھڑا دھڑ دو فائر ہوئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ بڑے نواب کی بندوق پتنگا کے ہاتھ میں تھی اور سنجھلے نواب کی چھاتی سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا اور پتنگا چلا رہی تھی ——

"میں سیدانی ہوں —— میرے سینے میں سچائی کا نور اتر آیا ہے۔"

سہ پہل

یہ ایک پتلا سا شیشے کا ٹکڑا ہے جس کے تین پہلو ہیں۔ معلوم نہیں کہاں سے میری چھوٹی بچی اسے اٹھا لائی ہے۔ میں نے اسے لکھنے کی میز پر کاغذات دبانے کے لئے رکھ لیا ہے۔ کبھی کبھار ایک بھولی بسری یاد آتی ہے تو اسے آنکھوں کے قریب لے جا کر آسمان، فضا اور زمین کی طرف دیکھتا ہوں لیکن معاً خیال آتا ہے کہ یہ بلور کی وہ قلم نہیں جو نہایت عمدہ ترشی ترشائی شیشے کے جھاڑوں اور فانوسوں میں ہزاروں کی تعداد میں آویزاں رہتی تھیں اور جب جھاڑوں اور فانوسوں کو صاف کیا جاتا تھا تو ان گنت بلوریں سہ پہل قلمیں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی تھیں۔ ہم دوڑ دوڑ کر اور لپک لپک کر اٹھاتے اور آنکھوں کے پاس رکھ کر نظارہ کرتے تھے۔ اللہ اللہ کیا نت نئے رنگوں کی قوس قزح سی کھل جاتی تھی۔ آسمان پر کیا کیا گل کھلتے تھے۔ زمین کیسی گلزار نظر آتی تھی اور فضاؤں میں رنگوں کی لہریں سی اڑتی پھرتی تھیں۔ یہ لیجئے دوسرا پہلو نگاہوں کے سامنے رکھ لیا۔ ہائے یہ زمین کو کیا ہو گیا۔ جیسے ہم ایک گہرے غار میں دھنستے چلے جا رہے ہوں۔

اب قدم بھی اٹھتا ہے تو نہایت احتیاط سے۔ سامنے ایک گہرا غار نظر آرہا ہے۔ توبہ توبہ جی گھبرانے لگا۔ ہٹاؤ بھئی اس پہاڑ کو ذرا اب تیسرے کی سیر ہو جائے لیجیے ہر چیز چھوٹی ہو گئی۔ درخت، آدمی، مکان، ہر شے اس قدر مختصر ہو گئی جیسے وہ اصلی نہ ہوں نقلی ہوں بلکہ آج کل کی مروجہ اصطلاح میں "ماڈل" ہوں ۔۔۔ لیکن (اور ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑا "لیکن" ہے) یہ قلم جو میری میز پر رکھی ہے نہ تو اصلی بلّور کی ہے اور نہ کسی جھاڑ فانوس سے گری ہے۔ معمولی شیشے کا ٹکڑا ہے جسے بے خیالی میں اکثر میں آنکھوں کے سامنے رکھ لیتا ہوں لیکن بجائے اس کے کہ نظارہ رنگین اور خوشنما بن جائے۔ بھدا، بے کیف اور بیحد دھندلا دھندلا سا نظر آتا ہے، البتہ یہ ہے سہ پہل اور اسی بنا پر میں بار بار دھوکا کھا جاتا ہوں، اٹھاتا ہوں، نظروں کے سامنے لاتا ہوں اور پھر رکھ دیتا ہوں۔ اس کا تو ہر پہلو بے رنگ ہے۔

جس میز پر اس سہ پہل ٹکڑے کو میں نے رکھ دیا ہے۔ اس کے سامنے صرف چار کرسیاں پڑی رہتی ہیں۔ صدر نشیں ہر حالت میں میں ہی ہوتا ہوں۔ البتہ ان کرسیوں پر ہر طرح کے لوگ آآکر بیٹھتے اٹھتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ کمرہ نہ زیادہ بڑا ہے نہ چھوٹا۔ بس اوسط درجے کا دفتر ہے جو بہرحال نجی ہے۔ چاروں طرف کتابوں کے ریکیں اور بک شیلفز کتابوں سے اٹے پڑے ہیں۔ چند چھوٹی چھوٹی میزوں پر مختلف چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ میز کے ٹھیک سامنے دیوار میں بڑی سی کھڑکی ہے جو کھلتی ہے تو اس پر چنبیلی کی بیل کا سایہ بھی پڑنے لگتا ہے اور سامنے لان میں کھلے ہوئے لا تعداد موسمی پھولوں کی خوشبو مشامِ جاں کو معطر کر دیتی ہے۔ میری بیوی کو رنگوں کا تھوڑا بہت سلیقہ ہے لہٰذا جاڑے میں سرخ پردے کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشوں پر چڑھا دیتی ہے۔ گرمی میں ہرے یا نیلے اور بسنت کے زمانے میں بسنتی اور نارنجی دیواروں میں چند مناظر کی پرکشش تصویریں بھی ہیں۔ شیلفز میں ایسی ایسی کتابیں موجود ہیں کہ آدمی پڑھنے پر آجائے تو دنیا و مافیہا فراموش کر دے

——— لیکن کیا کیجئے کہ یہ سہ پہل ٹکڑا جو میرے سامنے رکھا ہوا ہے، بار بار میری توجہ اپنے آپ میں جذب کر لیتا ہے۔ میں کبھی لاشعوری طور پر اسے اٹھا کر ہاتھوں میں الٹتا پلٹتا رہتا ہوں اور کبھی نگاہوں کے پاس لے جاتا ہوں ——— کبھی کبھی بعض لوگ مجھ سے مشغول گفتگو ہوتے ہیں اور میں اضطراری حرکتیں کر بیٹھتا ہوں اور معاً مجھے خیال آتا ہے کہ یہ محض ایک معمولی شیشے کا بھدا، بے رنگ ٹکڑا ہے جس سے کچھ بھی نظر نہیں آسکتا۔ یہاں تک کہ سامنے بیٹھا ہوا کوئی شخص بھی صاف نظر نہیں آتا بلکہ اُس کا چہرہ اور بھی مسخ ہو جاتا ہے گویا اچھا بھلا آدمی بھی کچھ سے کچھ نظر آنے لگتا ہے۔

عجیب بات ہے کہ جب کبھی میں تنہا ہوتا ہوں، بچے اسکولوں میں ہوتے ہیں۔ بیوی باورچی خانے میں سر کھپاتی ہے اور میں تنہائی کی اس لذت سے لطف اندوز ہونے کے لئے کوئی کتاب یا رسالہ اٹھاتا ہوں یا کاغذات لے کر اپنے مسودات دیکھتا ہوں تو نہ جانے کیسے یہ سہ پہل میرے ہاتھ میں آجاتا ہے اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ کاش یہ نقلی نہ ہوتا اصلی ہوتا اور میں اسے نگاہوں کے سامنے رکھ کر ہر ہر پہلو سے مختلف مناظر دیکھتا، آسمان پر اُڑنے والے پرندے دیکھتا۔ بادلوں کے پرے کے پرے اور جھنڈ کے جھنڈ امنڈتے ہوئے دیکھتا بسنت میں لاتعداد رنگین پتنگیں دیکھتا، موسم بہار میں رنگین تتلیوں کا نظارہ کرتا اور زمانۂ جنگ میں جہازوں کے دوڑنے لپکنے، قلابازیاں اور اُن پر لپکنے والے طیارہ شکن توپوں کی شعلوں کی لمبی لمبی سرخ زبانوں کا نظارہ کرتا۔ زمین پر کھلنے والے پھولوں، پودوں، درختوں، جانوروں اور آدمیوں کو دیکھتا، کیا مزے کی سیر ہوتی لیکن افسوس یہ سہ پہل ٹکڑا اصلی شیشے کی قلم نہیں ہے۔ معمولی اور بے رنگ ٹکڑا ہے جو صرف کاغذ دبانے کے کام آسکتا ہے۔

یہ جو دل میں ایک گدگدی سی اٹھتی ہے اور ایک بڑی عجیب سی خواہش سر اٹھاتی ہے کہ آخر کیوں نہ ہر آتے جانے والے کو بلور کی اصلی سہ پہل قلم کے ذریعے سے پہلو بدل بدل کر دیکھا جائے

تو آخر اس کی کوئی نہ کوئی تو وجہ تو ضرور ہو گی، نفسیاتی ہی سہی مگر ہے دلچسپ۔

آنے جانے والوں میں یوں تو بیسیوں لوگ ہیں جو آکر گھنٹوں اُٹھتے بیٹھتے ہیں، باتیں بگھارتے ہیں اور چلے جاتے ہیں لیکن ان میں سے اکثریت، اُن لوگوں کی ہوتی ہے جو محض ڈرائنگ روم تک کے مہمان ہوتے ہیں۔ زیادہ اخلاق برتا جائے شربت سے تواضع کر دی یا اسی ڈرائنگ روم سے متصل ڈائننگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ جو کچھ نان و نمک میسر ہوا پیش کر دیا اور ایسے بھی ہوتے جو لاہور میں چند روز گزارنے کے لئے غریب خانے پر قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ انھیں مہمانوں کے بیڈ روم کا راستہ بتا دیا جاتا ہے لیکن اس کمرے تک جسے میں اسٹیڈی، یعنی دار المطالعہ کہتا ہوں محض چند نفوس کی رسائی ہے۔ حتیٰ کہ میرے بچے تک بہت کم آسکتے ہیں۔ بیوی ضرور آتی ہے لیکن جب اُسے میرے پڑھنے لکھنے پر ترس آنے لگے اور چائے کئی بار ٹھنڈی ہو جائے لیکن پھر بھی آنے جانے والوں کا سلسلہ یہاں رہتا ہے۔

یہ جو میرے سامنے والی کرسی پر ایک لحیم شحیم اور تن و توش والے ایک صاحب آکر ابھی ابھی بیٹھے ہیں جن کا ناک نقشہ بڑا بھدا اور عجیب موٹا موٹا سا ہے اور جن کے سر پر بال تو ہیں لیکن کم ہوتے جا رہے ہیں۔ رنگت بھی زردی مائل ہے۔ دانت ہموار اور خوبصورت ہیں لیکن بے تحاشا پان کھانے سے دانتوں کی ریخیں سیاہ ہو گئی ہیں۔ پیٹ کچھ اس طرح بڑھا ہوا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے موصوف بیٹھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ رکھے ہوئے ہیں۔ گویا دھوبی کی موٹی تازی گٹھڑی ہے جس میں میلے اور کثیف کپڑے بھرے ہوئے ہیں۔ اس گٹھڑی پر ٹریلین کا بڑا اچھا اور چمکدار سرمئی سوٹ ہے جو بدیسی زر مبادلہ خرچ کر کے بنایا گیا ہے۔ موصوف کی موٹی موٹی انگلیوں میں پانچسو پچپن کا سگریٹ سلگ رہا ہے اور ابھی ابھی موصوف جب اپنی مرسیڈیز کار سے اترے تھے تو ان کے شوفر نے نہایت ادب سے دروازہ کھولا تھا لیکن میں نے اپنے سامنے

کی کھڑکی سے انھیں ادھر آتے دیکھ کر صرف بیٹھے بیٹھے اس قدر کہا تھا "یہاں آجایئے" چنانچہ وہ یہاں آگئے اور اب میں اُن سے مغز پاشی کر رہا ہوں۔

موصوف کا ملک کی ایک بڑی فرم سے تعلق ہے یا اس بڑی فرم کا موصوف سے تعلق ہے یہ بات نہ مجھے معلوم ہے اور نہ معلوم کرنے کی اب تک میں نے ضرورت محسوس کی ہے۔ ایک آدھ بار موصوف کے کام کے سلسلے میں مجھے ان کے دفتر اور گھر بھی جانا پڑا ہے۔ دفتر تو تمام کا تمام ایرکنڈیشنڈ ہے۔ گرمی میں ٹھنڈا اور جاڑے میں گرم۔ قالینوں کے فرش سے نہایت درجہ لطیف اور نرم، جدید وضع کے فرنیچر سے مزین، چاق وچوبند کام کرنے والے کلرکوں کے جمگھٹے میں ان حضرت کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ یوں تو بقول شخصے ان حضرت نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے، ملکوں ملکوں کی سیر کی ہے لیکن یاران طریقت انھیں نہایت غبی سمجھتے ہیں اور "خرِ عیسیٰ اگر بمکہ ..... الخ" کی مثال انھیں کے اوپر منطبق کرتے ہیں۔ یوں تو طرح طرح کی باتیں موصوف کے بارے میں اچھی بُری سب ہی مشہور ہیں لیکن میرا بھی جی چاہتا ہے کہ کاش میں اصلی بلّور کا سہ پہل ٹکڑا پا جاتا تو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھ کر اس شخص کو ہر ہر پہلو سے دیکھتا اور کیا مزا ہوتا ــــــ ذرا پہلا رخ تو آنکھوں پر رکھئے۔

موصوف بیحد مرنجاں مرنج نظر آتے ہیں۔ گھر والے ان کو مذہبی بھی سمجھتے ہیں۔ صبح منہ اندھیرے اُٹھ کر مصلے پر بیٹھ کر فجر کی نماز کے بعد تسبیح وتہلیل نیز قرآن مجید کی تلاوت میں خاصا وقت صرف کرتے ہیں حتیٰ کہ ۸ بجے ناشتے کی ٹرے ڈھکیل کر اُن کے کمرے میں پہنچائی جاتی ہے۔ وہ کسی بھوکے بیل کی مانند اس ٹرے پر جٹتے ہیں تو اسے چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔ الحمدللہ کہہ کے دفتر سدھارتے ہیں۔ یہاں بار بار ٹیلی فون کرتے ہیں۔ یہ علاحدہ بات ہے دفتر سے بیٹھ کر بیگم کو ٹیلی فون زیادہ کرتے ہیں۔

"بیگم پان ختم ہو گئے ہیں۔"

بیگم معلوم نہیں میرے پیٹ کی ایک نس میں درد کیوں ہو رہا ہے۔ میں نے تو زینہ تک استعمال نہیں کیا۔ لفٹ سے اوپر پہنچا ہوں۔"

بیگم تم کیا کر رہی ہو۔ خدا کی قسم شادی کے پچیس سال بعد بھی تم میں بلا کا حسن ہے۔ واللہ میں تو کشتۂ ناز ہوں۔"

"بیگم میں یہ تو کہنا ہی بھول گیا کہ آج شام کو میں پہنچ جاؤں گا۔ رات کو مسٹر .... کا ڈنر ہے مرغ روسٹ ہونے چاہئیں۔ دہلوی کباب سیخ اور لکھنوی بریانی ــــ اور ہاں بیگم خدا کے لئے تم باورچی خانے کا رُخ نہ کرنا تمہیں میرے سر کی قسم یہ مردود ایک درجن نوکر کس لئے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔

اس دھندے میں دوپہر سر پر آپہنچی آخری گلوری اپنے کلّے میں دبائی۔ پانچسو پچپن سگریٹ کا ڈبہ ہاتھ میں لیا۔ لفٹ کے ذریعے نیچے پہنچے، کار میں بیٹھے گھر آگئے۔ آتے ہی دھم سے بیڈ پہ گر پڑے۔ کسی نے جوتے اتارے کسی نے لباس تبدیل کرایا۔ ایک ذرا آنکھ لگی کہ تین کا عمل ہوا۔ بیخ لیا۔ پھر ذرا سی جھپکی لی۔ پانچ بجے تڑپڑا اٹھ کر نماز پڑھی۔ لان میں ذرا سا ٹہلے۔ ایک درجن چھوٹے بڑے بچوں کو ڈانٹ پلائی۔ حرام خور نوکروں کو جھاڑ دیا۔ شام کی چائے لان میں بیٹھ کر بیگم کے ساتھ پی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ایک آدھ درجن ٹیلی فون کئے۔ کچھ اندرون کچھ بیرون شہر۔ رات ہوئی، مہمان پہنچے۔ موصوف بھی اپنے ڈی جے میں ملبوس ہو کر ڈائننگ ہال میں آئے۔ مہمان نے میزبان کی کمزوری کو تاڑ کر اشیائے استعمال کی توصیف شروع کی۔ جی ہاں یہ پیرس سے ٹرے خریدی ہے۔ یہ ڈنر سیٹ خاص بابیم کا ہے اور یہ دیواروں پر جو گلوب لگے ہیں خاص ولایتی مال ہے۔ کوئی فرم عموماً اسے تیار نہیں کرتی۔ جھاڑ اور فانوس کا زمانہ کہاں البتہ آپ یہ جدید لیمپ شیڈ ملاحظہ کیجئے کنول کا پھول کھلا ہوا ہے وغیرہ وغیرہ۔ رات ہوئی۔ نماز اور وظیفے سے فارغ ہو کر موصوف نے بیگم کے کمرے کا رخ کیا۔ کچھ بیگم کے نخرے سہے اور کچھ اپنے دکھائے۔ غرض اس رسم کو پورا کر کے پان کی دو

گلوریاں کلّے میں دبا کر، جی چاہا تو ایک ذرا کی ذرا ٹیلی ویژن ملاحظہ کیا ورنہ کل صبح تک کے لئے
خدا حافظ۔

اب ذرا دوسرا رُخ دیکھئے ——— اللہ اکبر یہ وہی شخص ہے تو یہ پہچاننا مشکل ہے۔ کراچی
کی سڑکوں سے منہ چھپا کر گزرتا ہے کہ کہیں کوئی قرض خواہ ٹوک نہ دے۔ دوستوں کے کپڑوں پر
گزارہ ہے۔ قرض کھاتے کھاتے حلیہ بگڑ گیا ہے۔ دوستوں، عزیزوں کو اس قدر دھوکے دیئے
ہیں کہ کوئی صورت دیکھنے کا روادار نہیں۔ کوئی "بلیک شیپ" کہتا ہے کوئی نوسرباز ———
کوئی فریبی، دغاباز اور کوئی مکّار، لیکن بہرحال ایک غیر ملکی فرم موصوف کے دامِ تزویر میں آ ہی
جاتی ہے اور غریب کے دن پلٹتے ہیں ——— چونکہ یہ رُخ بیحد بھیانک ہے، سر چکرانے لگتا ہے، جی
گھبرانے لگتا ہے جیسے ہم بڑے غار کے سامنے کھڑے ہیں لہٰذا اب دوسرا رخ بدلئے۔

اے لیجئے یہ ہے تیسرا رخ ——— ذرا خوب اچھی طرح نگاہوں کے سامنے رکھیئے گا۔
دیکھئے پہچانیئے ——— مگر یہ کیا یہ ہر چیز چھوٹی کیوں ہو گئی۔ کبھی موصوف کا سر چھوٹا گیند معلوم ہوتا
ہے۔ لمبوترا کھمبا جیسے کھمبے پر نارنگی رکھی ہو۔ کبھی موصوف بجائے خود گیند معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی
تارکول والا ڈرم دکھائی دیتے ہیں اور اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ یوں نظر آتے ہیں گویا
لوہے کے ڈھیر پر جالا تنا ہوا ہو اور موصوف مکڑی کی حیثیت سے جالے میں اُلجھے ہوئے ہوں۔
مگر خیر یہ گمان ہے کیونکہ یہ سہ پہل قلم جھوٹے شیشے سے بنی ہوئی جس سے اچھی بھلی صورتیں بھی
مسخ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

جی ہاں اسی دروازے سے یہ بوڑھا، کمزور اور نحیف و نزار آدم، کئی بار جھانک چکا ہے
لیکن خدا معلوم کیوں نہ وہ اندر آتا ہے اور نہ میں بلاتا ہوں۔ بے چارا ٹھٹھک کر دیوار سے لگ کر
کھڑا ہو جاتا ہے۔ شاید یہ سوچا ہے کہ آنے جانے والوں کا سلسلہ ختم ہو تو اندر جا کر عرض حال کروں

میں اس آدمی کو خوب جانتا پہچانتا ہوں۔

اسے لیجیئے میں آپ کو ابھی اس کے بارے میں کچھ بتانا ہی چاہتا تھا کہ وہ ایک کار اور آکر رکی، ضعیف آدمی ٹھٹھک گیا۔ کار سے ایک نوجوان اترا۔ سیدھا میرے مکان کے برآمدے میں پہنچا گھنٹی بجائی لیکن ضعیف آدمی نے اُس کی رہنمائی کی۔ نوجوان میرے دارالمطالعہ میں داخل ہوا۔ میں اُٹھ کر اس کا استقبال کرتا ہوں اور اس سے بیحد مرعوب ہوں۔ باتوں کے دوران متعدد بار سہیل قلم میرے ہاتھوں میں آجاتی ہے اور بار بار میری نگاہوں کے بالکل قریب پہنچ پہنچ جاتی ہے۔

یہ پچیس چھبیس سال کا نوجوان، خوب لمبا تڑنگا سرخ وسپید اور اچھی صحت کا مالک ہے بہت عمدہ کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ انگریزی قیمتی لباس بھی ہے اور انگریزی زبان میں گفتگو بھی کر رہا ہے۔ بار بار قیمتی سگریٹ نکالتا ہے، کش لگاتا ہے بار بار انگریز مفکرین کے اقوال زریں بھی مجھے سناتا جاتا ہے۔ اس کو انگریزی زبان پر حیرت انگیز طریقے پر قابو ہے۔ میں سچ سچ اس سے مرعوب ہوں۔ یہ نوجوان ابھی ابھی اپنے دفتر سے یہاں آرہا ہے۔ بہت بڑا عملہ اس کے ماتحت ہے اور کہتے ہیں کہ بہت جلد یہ نوجوان اور بھی زیادہ ترقی کرنے والا ہے۔ اور بھی بڑا افسر بننے والا ہے۔ اوپر اور نیچے تمام عمال اس سے خوش ہیں۔ میں اسے صرف اس لئے جانتا ہوں کہ بدقسمتی سے چار سال تک اس نوجوان نے مجھ سے ”درس لیا ہے“ اور اب مستقل ”مجھے درس دے رہا ہے“۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس کے بعد بہت سے ساتھی کرتے رہے ہیں۔ یہ بھی یہاں سے جاکر اپنے ساتھیوں میں بیٹھ کر نہایت درجہ استہزا کن انداز میں کہے گا ”کیا اساتذہ بھی دانشور ہوتے ہیں“ میں اس سے مرعوب ہوں، ڈرتا ہوں۔ حالانکہ چار سال قبل یہ لڑکا نہایت بے ضرر تھا۔ میں اسے خاطر میں بھی نہیں لاتا تھا۔ بعض اس کے ساتھی آج بھی بے ضرر ہیں لیکن اس کو یہ احساس

ہے بلکہ شدت سے احساس ہے کہ وہ مجھے نہ صرف ضرر پہنچا سکتا ہے بلکہ مجھے اپنے انگوٹھے کے نیچے رکھ سکتا ہے۔

اب ذرا دوسرا پہلو دیکھیے ـــــــ نہایت کند ذہن اور غبی۔ آباو اجداد بہت بڑے زمیندار۔ انگریزوں کے زمانے میں بھی مقبول اور آزادی کے بعد بھی ہر دل عزیز۔ ان کی اولاد کو بھی اللہ نے ایسا ہی مقبول اور ہر دل عزیز بنایا ہے۔

اور اب تیسرا دیکھئے ـــــــ صفر صفر صفر۔ صاحبزادے موصوف کی ساری شخصیت اسی دائرے میں گم ہے لیکن ...... لیکن ...... توبہ توبہ جی گھبرا گیا، موصوف اس درویش کے پاس کچھ لینے آئے ہیں۔ جو میں بڑی خاموشی سے دے دیتا ہوں کیونکہ میں ان سے خائف ہوں، ڈرتا ہوں، مرعوب ہوں۔ مبادا مجھے حقیر چیونٹی کی طرح مسل کر پھینک نہ دیا جائے۔

یہ دونوں صاحبان جاتے ہیں۔

دونوں کچھ لینے آئے تھے۔

لہذا بامراد واپس جاتے ہیں۔

اور اب وہ ضعیف آدمی جو سہما ہوا کھڑا تھا، موقع پاتے ہی اجازت لے کر اندر آ جاتا ہے معمولی کپڑوں میں ملبوس ہے۔ گو میں تبسم مصنوعی طور پر پیدا کر کے اس کا استقبال کرتا ہوں لیکن میں اس سے بیزار ہوں، چاہتا ہوں کہ فوراً چلا جائے۔ اس کے منہ سے کچھ بھی سننا نہیں چاہتا ایک بات بھی سننا پسند نہیں کرتا لیکن یہ مردود پیر تسمہ پا کی طرح مجھ سے چمٹ گیا ہے۔ بغیر سنائے نہیں جائے گا اور جو کچھ سنائے گا وہ بھی مجھے معلوم ہے۔ میں اس کو بہت عرصے سے جانتا ہوں بلکہ اس کے آباو اجداد کو بھی جانتا ہوں۔ انگریز کے زمانے میں بھی اس کا یہی حلیہ، یہی نقشہ اور بالکل یہی انداز تھا۔ آج بھی اس کا وہی قد بت اور وہی چہرہ مہرہ کا کرب ہے۔ میں اس سے کیا کہوں

مجھے معلوم ہے کہ ابھی ابھی یہ کیا کہے گا ـــــ کہے گا:

"بابو جی کل سے گھر میں آٹا نہیں آیا ہے۔"

"بچے بیمار ہیں، دوا کے لئے پانچ روپے دے دیجئے۔"

"بابو جی گھر والی کے ٹیکہ لگوانا ہے، تین روپے چاہیئے ہیں۔"

مردود نے مجھے اپنا بینک سمجھ لیا ہے۔ اے لیجئے اس منحوس کا وہ منہ کھلا۔ اک ذرا ٹھہرئیے میں اس کانچ کے ٹکڑے کو آنکھوں کے سامنے ذرا رکھ لوں۔

توبہ توبہ ہر رُخ سے دیکھئے وہی ایک کریہہ منظر ـــــ عجیب آدمی ہے۔

مگر یہ کیا، یہ تو کچھ اور کہہ رہا ہے۔ کچھ لینے نہیں آیا ہے۔

"بابو جی آپ کی مہربانی سے آپ کا غلام بینک میں ملازم ہو گیا ہے۔ آپ نے مفت پڑھا کر مجھے بے داموں خرید لیا ہے۔ غلام باہر کھڑا ہے۔ یہ کہتے ہوئے ڈر رہا ہے کہ اس کا یہ تحفہ قبول کر لیجئے ـــــ یہ پارکر قلم ـــــ"

تو یہ ہے ایک سہ پہلی کانچ کا ٹکڑا جس سے بہت سے مناظر دھندلے دھندلے مبہم اور مسخ شدہ نظر آتے ہیں۔ یہ اصلی سہ پہل قلم نہیں ہے جسے نگاہوں کے سامنے پہلو بدل بدل کر رکھیئے تو رنگوں کی توس قزح سی کھل جاتی ہے۔ اس سے مناظر اور بھی بھدے نظر آتے ہیں لیکن معلوم نہیں کیوں اس نقلی سہ پہل قلم سے صرف یہی ایک منظر صاف شفاف اور اجلا اجلا سا نظر آرہا ہے۔

ھار

دادی جان تخت پر گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی تھیں پیش خدمتیں حاضر تھیں۔ پاندان کھلا تھا
ناگردان میں پان دھرے تھے۔ دو چار بیبیاں سروں سے دوپٹے اوڑھے نہایت ادب سے تخت
کے کناروں پر بیٹھی تھیں کہ ناگاہ محلدار نے آکر کہا کہ "میم صاحب ڈیوڑھی پر کھڑی ہیں" دادی جان
نے نہایت تمکنت سے کہا "اندر بلاؤ"۔ ایک پیش خدمت کو کرسی لانے کا حکم دیا گیا۔ میم صاحب
اسکرٹ پہنے تھیں۔ سر پر رومال بندھا تھا اور ان کے پیچھے پیچھے ایک نہایت خوبصورت گڑیا سی
بچی فراک پہنے۔ بالوں میں ربن باندھے چلی آ رہی تھی۔ میم صاحب نے آکر دادی جان کو بڑے
بے ہنگم طریقے سے سلام کیا: "ہم بہوت ڈن سے آنے مانگتا تھا، بہوت ڈن سے دیکھنے مانگتا تھا۔
ہمارا بے بی آپ کو سلام بولنا مانگتا ہے"۔ اور پھر گڑیا سی بچی نے کہا "سلام" ـــــ میم صاحب کرسی پر بیٹھ گئیں
اور دادی جان تمام بیبیوں کا تعارف کرانے لگیں۔ میم صاحب کا "بے بی" رینگتا ہوا میرے کمرے میں
پہنچ گیا، جہاں میں بڑے انہماک سے پتنگ اڑانے کے لئے چرخی پر ڈور چڑھا رہا تھا۔ بے بی میری

ہی عمر کی بچی تھی ــــــ یہی کوئی نو دس سال کی۔ اُس نے کھڑی کھڑی اردو میں کہا: "ہم بھی کنکوا اڑائیں گا۔" میں نے کہا "ضرور اڑاؤ ــــــ آؤ ہم اوپر کوٹھے پر چلیں۔"

"ضرور اوپر چلیں گا ــــــ ہم ممی سے پوچھنے مانگتا ہے۔"

اور یہ کہہ کر بے بی دوڑتی ہوئی ماں کے پاس چلی گئی۔ میم صاحب کی گردن میں جھول گئی۔ پھر چپکے سے کان میں اجازت مانگی۔ ماں نے جلدی سے بوسہ لے کر اجازت دے دی لیکن دادی جان کی تیوری پر بل آگیا۔ مروتاً کچھ نہ بولیں۔ بے بی دوڑتی ہوئی واپس آگئی اور بڑی بے باکی اور بے نیازی سے میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر زینے پر تقریباً دوڑتی ہوئی پہنچ گئی۔ اوپر آسمان پر لاتعداد کنکیاں اڑ رہی تھیں جنھیں دیکھ کر بے بی نے خوشی سے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ میں نے بھی کسی نہ کسی طرح کنکیا اڑائی لیکن بے بی اچھل اچھل کر پتنگ کی ڈور کو کھینچ لیتی۔ اُلٹی سیدھی ٹھمکیاں دینے سے پتنگ کا توازن بگڑنے لگتا جس پر عام حالتوں میں مجھے غصہ آجایا کرتا تھا لیکن بے بی کی کوئی حرکت مجھے قطعاً ناگوار نہیں گزر رہی تھی بلکہ اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ دل میں خوشی کی پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ پتنگ نوچم کھسوٹ میں دوسری پتنگ سے زبردستی بھڑ گئی اور جس طرح کوئی چوہا خود ہی بلی کے پنجے میں پہنچ کر اس کا لقمۂ تر بن جاتا ہے۔ پتنگ کٹ گئی۔ ڈور بے بی کے ہاتھ میں رہ گئی۔ وہ ڈر گئی۔ اس کے منہ سے نکلا ــــــ "اوہ، سوری!"

میں نے کہا: "کوئی بات نہیں بے بی ــــــ میرے پاس تو ڈھیروں کنکوے رکھے ہیں۔"

لیکن بے بی شرمندہ ہو کر نیچے چلی گئی اور اپنی ممی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ مجھے اس کے جانے سے عجیب دکھ سا محسوس ہوا۔ میں بھی نیچے چلا گیا، لیکن دادی جان کی نگاہوں سے ڈرتا تھا، دالان میں نہیں گیا۔ صحن کے چبوترے پر اپنی ٹرائی سائیکل چلانے لگا۔ بے بی دوڑتی ہوئی آئی۔ پھر ٹھٹھک کر دالان کے ستون سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ لیکن رفتہ رفتہ ٹرائی سائیکل نے اسے لبھا لیا اور وہ خود ہی

آ کر بولی "اب ہم بھی چلائیں گا۔"

میں فوراً سائیکل سے اُترا۔ وہ جا بیٹھی اور دالان کے سامنے بنے ہوئے صحن کے وسیع اور عریض چبوترے پر ٹرائی سائیکل چلانے لگی۔ ہر بار اس کے بال چہرے پر آ آجاتے۔ وہ جھٹکے سے بال پیچھے پھینک کر پھر چلانے لگتی۔ اس کا گورا گورا شہابی رنگ ونگ اٹھا، چہرہ تمتما گیا، اور جاڑے کے باوجود پیشانی پسینہ آ گیا۔ مجھے بے بی پر رحم آگیا۔ ٹرائی سائیکل کا کھیل چھوڑ کر چبوترے سے متصل سیڑھیوں سے میں نیچے پائیں باغ میں اتر کر مہندی کی لگی ہوئی دو رویہ روشوں کے درمیان ایک روش پر چلنے لگا وہ بھی دوڑ کر آ گئی۔

"یہ تمہارا گارڈن ہے؟ —— باغ باغ۔"

میں بھی آخر لا مارٹینز میں پڑھتا، انگریزی سمجھتا اور بولتا تھا۔ جب میں نے اسے نہایت فصیح انگریزی میں بتایا کہ یہ میری دادی جان کا باغ ہے تو وہ تقریباً اچھل پڑی اور بے تکلفی سے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر روشوں پر اُچھلتی پھری۔ کبھی کسی درخت کے پاس لمحے بھر کو رُک جاتی، کبھی کسی چمن میں ٹھہر جاتی۔ یہ امرود کا درخت ہے، یہ شہتوت ہے۔ یہ آم ہے۔ یہ بڑھل ہے۔ یہ کٹھل کہلاتا ہے۔ یہ کمرق ہے۔ اسے شریفہ کہتے ہیں۔ یہ چمپے کا جھاڑ ہے۔ یہاں گل چاندنی اپنی فصل پر بہار دیتی ہے۔ اسے ہارسنگھار کہتے ہیں۔ اسے کروندہ کہتے ہیں اور یہ موتیے اور بیلے کے پودے ہیں۔ یہ فوارہ ہے —— دادا جان نے دادی جان کے لئے بنوایا تھا۔ دادی جان کو سنگ مرمر بہت پسند ہے۔ سنگ مرمر کی یہ چوکیاں بھی دادا جان نے منگوائی تھیں —— میں اُسے سیر کرا رہا تھا اور وہ خوب ہنسی خوشی ٹہل رہی تھی کہ ناگاہ باہر سے میرا مہر کارہ آیا کہ رائیڈنگ کو چلو۔ میں کپڑے تبدیل کر کے رائیڈنگ کو گیا تو اصطبل سے تین گھوڑے نکالے گئے تھے۔ ایک پر بے بی، دوسرے پر کاؤچ پہلے سے موجود تھے، تیسرا میرے لئے خالی تھا —— ہم نے دریا کنارے والی سڑک پر خوب سیر کی۔ سر شام

واپس ہوئے تو میں، بے بی اور رائیڈنگ کا وُرج تینوں اپنے اپنے گھوڑے اصطبل کے سائیس کو دے کر واپس آرہے تھے کہ بے بی کی ممی نے پیار بھرے غصے سے صرف اتنا کہا کہ تم نے دیر کر دی بے بی ماں کی گردن میں جھول گئی اور بولی "ممی یہاں روز آیا کرو، مرزا بہت اچھا لڑکا ہے"۔ ماں نے بیٹی کی انگلی پکڑی، اور تانگے پر بیٹھ کر یہ جا وہ جا، میں دیکھتا ہی رہ گیا۔

عرصہ گزر گیا۔ یاد نہیں کتنے سال بیت گئے۔ بے بی اور اس کی ممی نے بھول کر قدم نہ رکھا مجھے تعلیم کے سلسلے میں علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ جہاں پورے انہماک کے ساتھ میں پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ بی۔ اے کا پہلا سال شروع ہو گیا۔ سرما کی تعطیلات شروع ہوئیں تو بجائے لکھنؤ پہنچنے کے دہلی چلا گیا۔ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا اور کرسمس کا تہوار۔ نئی دہلی تقریباً دلہن بنی ہوئی تھی۔ ہر شہر جس طرح اپنے مخصوص بازاروں سے پہچانا جاتا ہے اور جس طرح ہر شہر میں کسی ایک سڑک کو مرکزیت اور خصوصیت حاصل ہو جاتی ہے، یہ خصوصیت دلّی میں کناٹ پیلیس کو حاصل ہے۔ لکھنؤ میں حضرت گنج کو، لاہور میں مال کو اور کراچی میں بندر روڈ کو۔ علی گڑھ میں اگر دنیا میں اپنی طرز کی اس انوکھی یونیورسٹی کی بنیاد نہ پڑتی تو بھلا دو کوڑی کو بھی کوئی اس شہر کو پوچھتا؟ ظاہر ہے کہ اقامتی زندگی کی یکسانیت سے تنگ آ کر تنوع اور رنگا رنگی تلاش کرنے کے لئے طلبہ تعطیلات میں ضرور دوسرے ٹھکانوں کی سیر کرتے پھرتے ہیں۔ مجھے دلّی کی سوجھ گئی اور پرانی دلّی میں ایک دوست کے گھر جا کر ٹھہر گیا۔ کرسمس کا تہوار، انگریز کا زمانۂ اقتدار، جنگ کے باوجود کناٹ پیلیس پر جو رونق تھی وہ ناقابل بیان حد تک پرکشش تھی۔ میں اپنے دوست کی معیت میں محض تفریحاً گشت کرتا پھر رہا تھا کہ معاً کسی نے میرا بازو پکڑ لیا، مڑا تو سامنے مرمریں پیکر، سرخ و سپید رنگ، خوب مضبوط اور بھری بھری پنڈلیاں، بھورے بھورے صحت مند بالوں میں ربن بندھا ہوا۔ انگریزی زبان میں مترنم آواز نے کہا: "اگر میں غلطی نہیں کرتی تو تم ضرور مرزا ہو ——— مرزا دی گریٹ پرنس آف لکھنؤ"۔

"یس نے بے بی کو پہچان لیا اور بے تکلفی سے بولا" تمہارے لئے میں شہزادہ سہی لیکن ہوں میں ضرور مرزا۔"

اس نے میرے ہمراہی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا: "ہائے میرے خدا، کتنے لمبے عرصے کے بعد تمہیں دیکھا ہے اور وہ بھی کیسا اتفاقیہ ـــــ اور تم کتنے پیارے جوان نکل آئے ہو۔ طویل القامت اور حسین ـــــ وہ تمہارا المحل نما مکان، باغ اور وہ خوبصورت شاندار بوڑھی خاتون ـــــ تمہاری دادی جان ـــــ ہائے کوئی مجھے ایک بار، صرف ایک بار وہاں لے چلے۔ میں اس پر سکون ماحول میں مرنے تک کے لئے تیار ہوں ـــــ پیارے! تم یہاں کس جگہ ٹھہرے ہو؟"

میں نے اپنے دوست کی طرف اشارہ کیا جسے وہ تقریباً بھول چکی تھی۔ وہ تو اتنی بڑی دلّی کو بھی بھول چکی تھی۔ جو ہزاروں لوگوں کے اس ہجوم میں گویا میرے ہمراہ بالکل تنہا کھڑی تھی پھر بغیر میرے دوست سے ایک فقرہ بھی کہے اس نے گھڑی دیکھی اور پرس سے اپنے پتہ کا کارڈ دیتے ہوئے یوں بھاگ کھڑی ہوئی جیسے گاڑی پلیٹ فارم سے رینگ کر چھوٹ رہی ہو اور وہ اسے پکڑنے کو دوڑی ہو۔ "کل شام کو ضرور آنا ـــــ تنہا ـــــ میں اور ممی تمہارا انتظار کریں گے۔ شدت سے انتظار ـــــ ٹھیک پانچ بجے، اس پتہ پر ـــــ بائی بائی ـــــ" میں نے پتہ کو پڑھا بڑی نفاست سے چھپا ہوا تھا۔

آنسہ اینی ہیٹر
سرکلر روڈ۔ نئی دہلی

تو بے بی کا نام اینی ہے۔ اب جو میں نے اپنے دوست کی طرف رخ کیا تو وہ اینی کے ہتک آمیز رویے پر خاصا کڑھا ہوا نظر آرہا تھا ـــــ "تنہا" پر اس نے خاصا زور دیا تھا۔ وہ اب بھی نظر آرہی تھی، تیز رفتاری سے جارہی تھی۔ ہجوم میں دور تک وہ مجھے نظر آتی رہی۔ پھر میں نے دیکھا ایک ـــــ

مٹیالے رنگ کی آسٹن کا دروازہ کھول کر وہ جا بیٹھی۔ گاڑی گھوم کر جب میرے سامنے سے ہو کر گزری تو میں نے دیکھا کہ ایک جوان انگریز گاڑی چلا رہا تھا اور اس کے پہلو میں آینی بڑی فراغت سے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ جوان فوجی تھا اور کیپٹن یا میجر کے رینک کا تھا۔ جنگ کا زمانہ تھا کلکتے پر ہمہ وقت حملے کا اندیشہ تھا اور اسی لئے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں کی چھاؤنیوں میں فوجیوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ گلی گلی، کوچے کوچے ڈی، کا نشان بنا ہوا تھا۔ بعض اہم عمارتوں کو کیموفلاج کیا گیا تھا اور تمام عمارتوں کے سامنے حفاظتی دیواریں اٹھا دی گئی تھیں۔ ریت کی بوریاں جگہ جگہ دھری نظر آتی تھیں اور تمام بجلی کے کھمبوں میں سیاہ رنگ کے بلب چڑھے تھے جن کی روشنی بڑی مدھم اور بے ضرر سی ہوتی تھی۔ ایسی فضا تھی کہ ہر لمحے سائرن بجنے اور ہوائی حملے کا خدشہ تھا۔ ڈرے اور سہمے ہوئے دنوں میں بھی کرسمس منانے کا جذبہ عقیدت پایا جاتا تھا — اور یہ کتنا اچھا تھا کہ میں پیٹر خاندان کا مہمان بن کر کرسمس منا سکتا تھا۔ لیکن انگریز نوجوان کو آینی کے پہلو میں دیکھ کر حسد کا ایک عجیب و غریب شعلہ سا میرے دل میں پیدا ہوا اور ایسی آنچ اٹھی کہ میں نے جی ہی جی میں کہا: "میں نہیں جاؤں گا — میں بھلا کیوں جاؤں — آینی میری کون ہے ؟ !" — دل جل بھن کر کباب ہو گیا اور میں اپنے دوست کے ہمراہ کناٹ پلیس کے دو چار چکر لگا کر واپس آ گیا۔

دوسرے دن دوپہر ڈھلتے ہی لباس تبدیل کر کے میں سرکلر روڈ پہنچ گیا۔ اس وقت دن کے چار بج رہے تھے۔ چھوٹے سے لکڑی کے دروازے پر آینی کے نام کی تختی لگی تھی۔ چھوٹا سا صحن تھا جہاں پھولوں کے لاتعداد گملے رکھے ہوئے تھے۔ برآمدے میں چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور چند گلدانوں میں موسم کے بڑے خوبصورت پھول سجے ہوئے تھے۔ دروازے پر چھوٹی سی صلیب کا نشان مور پنکھیوں سے بنا کر لگایا گیا تھا۔ میں نے دستک دی۔ اندر سے نحیف نسوانی آواز میں کہا گیا "اندر آ جاؤ"۔ میں جالی کا دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا اور ایک لمحے کو ٹھٹکا۔ وہ بیڈ روم تھا

جہاں اوسط درجے کا تمام فرنیچر موجود تھا۔ انگلش بیڈ، ڈریسنگ ٹیبل، پینٹنگز اور قالین وغیرہ چند کرسیاں اور چند نیچی میزیں مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ بیڈ روم سے متصل ایک اور کمرہ تھا جہاں سے آواز آئی "کون ہے ادھر آجاؤ ——"۔ میں پردہ اٹھا کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا۔ ایک ادھیڑ عمر کی انگریز عورت چھوٹے سے نرم اسٹول پر آتش دان کے سامنے بیٹھی تھی۔ دسمبر کا مہینہ تھا لیکن سردی اتنی زیادہ بھی نہیں تھی کہ کچھ دن رہے سے آگ تاپی جائے لیکن ادھیڑ عورت نحیف و زرد تھی۔ مجھے بغور دیکھتے ہوئے بولی "اس سے پہلے میں نے تم کو کہاں دیکھا ہے؟ کیا تم یہ بتانے میں میری مدد کروگے؟"

میں نے آہستہ سے کہا "کیوں نہیں مسز پیٹر —— آپ نے آج سے دس سال قبل مجھے لکھنؤ میں دیکھا تھا —— اُس وقت میں کافی چھوٹا تھا ——"

عورت ایک دم جوش میں آکر کھڑی ہوگئی "اوہ مائی ڈارلنگ بے بی —— مرزا —— کل ہی تو مجھے بے بی نے بتایا کہ تم یہاں ہو۔ ہائے اب تو لکھنؤ کو چھوڑے ہوئے بھی مدت گزر گئی۔ لکھنؤ کی یادیں —— آہ لکھنؤ کی یادیں —— کیا حال ہے بڑی بیگم صاحب کا ——؟"

مسز پیٹر کی مراد دادی جان سے تھی۔ میں نے بتایا کہ ان کا انتقال ہوچکا ہے —— مسز پیٹر دیر تک افسوس کرتی رہی۔ اچانک چونک کر بولی "اُف میں بھی کیسی دیوانی ہوگئی ہوں تم سے بیٹھنے تک کو نہیں کہا۔" آتش دان کے قریب میں بھی بیٹھ گیا اور وہ بھی —— پھر مختصراً اس نے اپنے بارے میں خود بتانا شروع کیا کہ کن حالات میں مسٹر پیٹر سے اُس کی کرسمس کے موقع پر لکھنؤ کے کیتھڈرل چرچ میں ملاقات ہوئی تھی —— پیٹر جو ایک دلیسی عیسائی تھا۔ اُسے دیکھ کر اُس کا عاشق زار ہوگیا اور وہ والدین کی مخالفت کے باوجود کالے دیسی عیسائی سے منسوب ہوگئی اور اس طرح اپنی جاسل ہوئی —— پھر اس نے یہ بھی بتایا کہ پیٹر نے اُسے ہر طرح کے دکھ پہنچائے۔ شراب پی پی کر اُسے مارتا تھا لاتوں، گھونسوں اور تھپیڑوں سے لیکن اپنی کی خاطر وہ تمام دکھ جھیلتی رہی۔ پھر بھی پیٹر نے اُسے چھوڑ دیا اور

ایک دیسی عورت سے ،ایک ہندو دیسی عورت سے شادی کرلی ـــــ اور اب آینی کو زندہ رہنے کے لئے فوجی دفتر میں ٹائپسٹ کی حیثیت سے ملازمت کرنا پڑ رہی تھی ـــــ میں ظاہر ہے کہ اینی کی آواز سننے کا منتظر تھا۔ میں نے کناٹ پلیس پر کھڑے ہوکر اسے انگریز نوجوان کے ساتھ جاتے دیکھ کر جو کیفیت محسوس کی تھی اور جس آگ میں میں سلگتا رہا تھا وہ خدا معلوم کہاں نابود ہوچکی تھی اور دل میں شوق کی آگ دھیمی دھیمی آنچ میں سلگ رہی تھی۔ دل رہے رہے دھڑک اٹھتا تھا۔اینی کا نام آتے ہی عجیب سی کیفیت پیدا ہو جاتی ـــــ میں نے بطور معذرت مسز ہیڑ سے کہا: معاف کیجئے گا اینی نے مجھے پانچ بجے بلایا تھا۔میں پہلے سے جان بوجھ کر آگیا ـــــ سوچا پانچ بجے سے سارا وقت تو اینی لے لے گی ـــــ میں کچھ وقت آپ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا ـــــ جی بھر کے آپ سے باتیں کرنا چاہتا تھا ـــــ میں نے آپ کا قیمتی وقت ضائع تو نہیں کیا؟"

نہیں نہیں ،اتنی اچھی صحبت تو بہت عرصے کے بعد مجھے ملی ہے ـــــ بڑا اچھا وقت گزر رہا ہے۔ اور میں اس خاص توجہ کا شکریہ ضرور ادا کروں گی ـــــ بات یہ ہے کہ میں گھٹنوں کے درد میں مبتلا ہوں اسی لئے تو آگ تاپ رہی ہوں، اسی وجہ سے تو میں نوکری نہیں کر سکتی۔کتنا اچھا زمانہ ہے کہ جنگ ہو رہی ہے۔میں کسی بھی محاذ پر زخمیوں کی دیکھ بھال کر سکتی تھی ـــــ لیکن بدقسمتی ـــــ" مسز ہیٹر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس کس موضوع پر کیا کیا گفتگو کرے۔ بار بار اس کا ذہن بہک جاتا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر پہنچ جاتی تھی ۔پھر بمشکل تمام موضوع کو گرفت میں لے کر گفتگو کا آغاز کرتی تھی۔ اچانک سائیکل کی گھنٹی بجی۔مسز ہیٹر کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ ساتھ ہی زبان سے نکلا " وہ آگئی بے بی ـــــ او وہ کتنا خوش ہو گی تمہیں دیکھ کر"

اینی نے ممی کو مجھ سے باتیں کرتے ہوئے برآمدے ہی سے سن لیا تھا۔ ڈرائینگ روم میں آتے ہی بولی" مرزا مجھے تمہاری خوشبو مل گئی تھی۔برآمدے ہی میں تمہاری ٹوپی رکھی ہے نا ـــــ ہائے تم کو دیکھ کر مجھے کیا کیا یاد آرہا ہے ـــــ لکھنؤ، تمہارا اٹل، باغ، گھوڑوں پر دریا کنارے کی سیر اور وہ پتنگ بازی

۔۔۔۔۔ اور ہاں وہ تمہاری بہت پیاری سی شاندار بوڑھی دادی ۔۔۔ یہ سب کتنا رومانی ہے کتنا خوبصورت ۔۔۔ کیوں ممی یاد آرہا ہے نا؟" اور مسز پیٹر نے تائید کی۔ پھر اینی نے کہا۔" میرے بیڈروم میں ایک خوبصورت سا پارسل پڑا ہوا ہے ممی؟" میں نے نہایت معذرت کے ساتھ کہا "وہ آپ دونوں کے لئے میری طرف سے کرسمس کا معمولی سا تحفہ ہے" اینی اچھل کر میری گردن میں غیر متوقع طور پر جھول سی گئی اور مجھے بیڈروم میں لے گئی۔ پھر تحفہ ہاتھ میں اٹھا کر اُسے کھولنے لگی۔ پارسل کھول کر جب اُس کے سامنے سچے موتیوں کا ایک لڑا ہار آگیا تو اُس نے اس طرح مجھے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا جس طرح کوئی اپنی پیاری بلّی کو دبوچ کر پیار کر لیتا ہے۔ پھر دوڑ کر ماں کے پاس گئی اور اچھل اچھل کر اور رکو رکو کر وہ قیمتی ہار (جو کسی طرح بھی پانچ ہزار روپے سے کم کا نہیں ہوگا اور جسے میری مرحوم ماں نے میری ہونے والی منگیتر کے لئے مجھے بخشا تھا۔ در میں نے جوش میں آکر اینی کو بخش دیا تھا) یوں دکھا رہی تھی جیسے شوخ اور ضدی بچے کو اُس کی پسند کی ٹافیاں اچانک مل گئی ہوں اور پھر اس ہار کو جلدی سے پہن کر وہ ڈریسنگ ٹیبل پر اپنی خمدار گردن کے حسن کا جائزہ لینے لگی۔ بے چاری اینی! ۔۔۔ شاید ایسی مسرت اُسے اب تک خواب میں بھی میسر نہیں آئی تھی ۔۔۔ اپنے ہار کی جلدی میں پارسل سے وہ قیمتی اسکارف نکالنا بھول گئی تھی جو اس کی ماں کے لئے میں نے خریدا تھا ۔۔۔ میں نے خود وہ اسکارف مسز پیٹر کو دیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑی ۔۔۔ ہائے اینی مرزا کو تو دیکھو کہ اُسے میرا کتنا خیال ہے ۔۔۔ کتنے پیارے رنگ کا اسکارف ہے اور کس قدر گرم ۔۔۔ شکریہ میرے پیارے تم سچ مچ اپنی بہت پیاری سی دادی کی طرح سخی ہو ۔۔۔ بے چاری عورت نے اسکارف لپیٹ لیا ۔۔۔ شاید اس عورت کو کرسمس پر صرف یہی تحفہ ملا تھا۔

کرسمس ٹری میرے سامنے ہی لگا تھا اور کرسمس کیک غالباً ڈائننگ روم میں رکھی ہوئی میز پر سجا تھا۔ معاً مسز پیٹر کو کچھ یاد آیا۔ بمشکل اُٹھتے ہوئے بولی: "بے بی میں مرزا کے لئے چائے بناتی ہوں

تم باتیں کرو۔"

اینی بولی "ممی یہ آج ہمارے ساتھ کھانا کھائے گا اور کرسمس منائے گا اور ہم اتنی باتیں کریں گے، اتنی باتیں کریں گے کہ ہماری زبانیں گھس جائیں گی ——— کیوں مرزا؟"

مسز پیٹر بولی "ضرور ضرور ——— ہمیں اس سے زیادہ مخلص مہمان تو مل ہی نہیں سکتا ——— لیکن اگر جیکب آ گیا تو؟"

میں بات کے رُخ کو پہچان گیا۔ جیکب غالباً کل والا انگریز نوجوان تھا لیکن اچانک ہی اینی فیصلہ کن انداز میں بولی "جہنم میں جائے جیکب ——— میں کسی قیمت پر اُس کے ساتھ نہیں جا سکتی۔"

میں پوچھنا چاہتا تھا، جیکب کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا اب اس لمحے جبکہ اینی مجھے جیکب پر ترجیح دے رہی تھی میں جیکب سے ڈوئیل تک لڑ سکتا تھا۔ "جہنم میں جائے" ——— میرا دل خوشی سے اچھل پڑا ——— کہ یہ لمحہ جس میں جیکب جہنم میں پہنچ گیا ہے ہر طرح سے میرا اور صرف میرا ہے۔ کیا اس لمحہ کی جنت کو پانچ ہزار کے ہار میں میں نے خریدا ہے؟ نہیں نہیں اینی مخلص ہے ——— اس کا ماضی اور اس کے ماضی کا بہترین حصہ میری ذات میں محفوظ ہے، اور چونکہ یہ ماضی بڑا حسین اور شاندار ہے لہذا میری ذات بھی کم از کم اینی کے لئے بے حد شاندار ہے۔

مسز پیٹر اندر چلی گئی، اور اس کے اندر جاتے ہی اینی نے تمام پردے کھینچ دیئے اور جس طرح کوئی میزبان دسترخوان سجا کر اور مہمان کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر اس سے درخواست کرتا ہے کہ ما حضر تناول فرمایئے۔ اینی نے کچھ اسی طرح اپنے آپ کو میرے اوپر گرا دیا اور میرے سر کو دونوں ہاتھوں میں لے کر بولی: "تم نے اتنا قیمتی تحفہ مجھے کیوں دیا؟ ——— کیا تمہارے دل میں میرے لئے اس سے بھی زیادہ قیمتی جگہ ہے؟" ——— اور پھر خود ہی جلدی سے بولی "ہاں ہاں ضرور ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہارے خلوص پر شبہ کر رہی ہوں ——— اور تم، تم تو اس سے بھی زیادہ شاندار نوجوان نکلے جو میرے خوابوں میں

رہا کرتا تھا ــــ جو مجھ پر کسی بادشاہ کی طرح حکومت کرتا ہے ــــ کسی بادشاہ کی طرح، کیا سمجھے میرے پیارے مرزا دی گریٹ پرنس آف لکھنؤ،، ــــ پھر اس نے مجھے صوفے سے اٹھنے کو کہا اور بیڈ روم میں آ کر آئینے کے سامنے بالکل میرے سینے سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور آہستہ سے بولی،"کیسی لگتی ہوں میں؟"

میں نے کہا،" میری دلہن،،

"دلہن؟" اس نے بے حد حسرت سے کہا۔ پھر ایک قہقہہ لگایا لیکن جس طرح کوئی بچہ صابن کے جھاگ سے بلبلے اڑاتا ہے اور بلبلہ بنتے ہی پھوٹ جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح قہقہہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ ٹوٹ گیا اور اس کی آنکھوں میں جو بے حد شوخ اور بیباک تھیں آنسو کے دو قطرے چھلکنے لگے اور پھر معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ وہ مغربی تہذیب کا تراشیدہ پیکر، جو تمام تر جسم ہی جسم تھا۔ مشرقی حیا اور مشرقی نسوانیت میں ڈوب سا گیا۔ شاید عورت کے خمیر میں کہیں نہ کہیں نسوانیت اور حیا ضرور چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ عورت، مشرقی ہے کہ مغربی، شریف ہے کہ فاحشہ۔ اینی اس لمحہ اداس ہو گئی اور بولی،" پیارے مرزا ــــ،، وہ ایک اسٹول پر بیٹھ گئی ــــ "تم اگر مذاق نہیں کر رہے ہو تو کیا یہ ممکن ہے؟"

میں نے لاپروائی سے کہا:"یہ ہار جو میں نے تم کو پہنایا ہے ــــ میری مرحومہ ماں نے میری منگیتر کے لئے مجھے دیا تھا۔"

اینی نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر بولی:"مجھے یقین نہیں آتا مرزا ــــ کاش مگر کاش یہ سچ ہو ــــ وہ شاندار محل ــــ وہ نوکر چاکر ــــ وہ سارا ماحول کس قدر الف لیلوی ہے اور اس ماحول میں ــــ میں اور تم ــــ،،

شاید الف لیلوی منظر ابھی کچھ دیر جاری رہتا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اینی نے درشتی کہا،" اندر آؤ۔" اندر آنے والا کس والا نوجوان تھا۔ لمبا تڑنگا اور خوبصورت چہرے والا جیکب۔ میرا

تعارف ہوا اور جیکب نے فوراً اینی سے جانے کی تجویز پیش کی جسے سن کر اینی نے نہایت درشت لہجے میں کہا: "کیا میں نے تم سے کل نہیں کہہ دیا تھا کہ میں گھر پر رہوں گی ؟ ـــــ میں ایسی بداخلاق نہیں ہوں کہ مہمان کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ آوارہ گردی کرتی پھروں۔"

اس کے جواب میں جیکب نے نہایت گھٹیا پنے سے اپنی افسری جتانا شروع کی لیکن معاً اینی پر غصے میں تقریباً ہسٹریائی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ چیخ چیخ کر بولی: "میں نے کہہ دیا کہ میں نہیں جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی، نہیں جاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جیکب اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مجھے اپنی طرف نگراں پاکر جھینپی ہوئی ہنسی ہنس کر بولا: "عورت بھی عجیب وغریب جانور ہے دنیا میں کیا خیال ہے مرزا؟"

میں نے یوں ہی شانے اچکا کر کہا: "مجھے کوئی پتہ نہیں۔"

جیکب نے جیب سے پائپ نکالا، اطمینان سے پائپ بھرا اور سلگا کر دو ایک کش لئے۔ پھر معاً کھڑا ہوگیا چلا کر بولا ـــــ "اینی میں ایک گھنٹے بعد آؤں گا۔ اس وقت تک تم اپنا ذہن بدل چکی ہوگی" اور باہر نکل گیا۔

لیکن اینی تقریباً دوڑتی ہوئی کمرے میں آکر کھڑکی سے منہ نکال کر بولی: "نہیں ـ نہیں ـ نہیں"

لیکن گاڑی اسٹارٹ کرتے کرتے جیکب بولا: "مگر میں بھی آؤں گا ضرور ـــ ضرور آؤں گا ـــــ"

اور وہ چل گیا۔

اینی کھڑکی سے ہٹ کر بولی: "تم جہنم میں جاؤ ـــ میری اتنی پیاری شام کو برباد کردیا" اور میری طرف مخاطب ہوکر بولی: "مجھے نفرت ہے ان افسروں سے جو عورت سے کھلونے کی طرح کھیلتے ہیں اور جی بہلاتے ہیں اور جیسے سگریٹ ختم ہوتے ہی خالی پیکٹ اچھال دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح اٹھا کر یہ اسے پھینک دیتے ہیں۔

مسز پیٹر ٹرے لئے داخل ہوئی۔ خاموشی سے ہم نے چائے پینا شروع کر دی۔ نہ مسز پیٹر نے کوئی بات
کہی نہ ہیں نے اور نہ ایمی نے کوئی تبصرہ کیا —— لیکن اس کو فت کو کم کرنے کے لئے مسز پیٹر نے کہا:
جب جنگ نہیں تھی تو یہی کرسمس کتنے شاندار طریقے سے منتا تھا —— لکھنؤ ہیں کتنے شاندار چرچ بنے
ہوئے ہیں اور وہاں کیسی اچھی روشنی کی جاتی ہے جگہ جگہ۔ چراغاں ہوتا ہے —— لیکن آہ
یہ بلیک آؤٹ، یہ سیاہ راتیں —— ہم چراغاں بھی نہیں کر سکتے۔ کیا تم سوچ سکتے ہو کہ سلطنتِ
برطانیہ جہاں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا، آج تاریکی میں ڈوبی کھڑی ہے —— ہم تاریخ کے
کتنے اہم اور فیصلہ کن موڑ پر آگئے ہیں —— جرمنی اور جاپان ہمارے دشمن ہو رہے ہیں، اور
ہر آن حملے کا خطرہ ہے —— اور آج کرسمس کے موقع پر بھی —— ہمارے سپاہی مورچوں
ہیں بیٹھے ہوئے ہیں —— ہاں تو لکھنؤ کا کرسمس کیسا اچھا ہوتا تھا ۔ گھر گھر چراغاں۔ گلی گلی
کوچے کوچے خوشیاں منتی تھیں —— اسپتالوں اور اسکولوں میں مٹھائیاں بٹتی تھیں ——
غریب عیسائیوں کی بستی میں رات کو ڈھولک بجتی تھی —— "آج کوئی پیدا ہوا —— خدا کا
بیٹا —— پیارا مسیح ہمارا پیدا ہوا —— آج ——"

میں بولا: "مسز پیٹر کیا ہم دلی ہیں ایسی بستیوں میں نہیں جا سکتے"؟

ایمی بولی: "نہیں، پیارے، میری پیاری ممی کے پیروں میں درد رہتا ہے —— جنگ کا زمانہ بھی
ہے —— سردی قیامت کی ہے۔ یہ کرسمس تو ہم گھر پر منائیں گے —— تمہارے ساتھ"!

لیکن میری پیاری"! چائے کی پیالی ٹرے میں رکھتے ہوئے مسز پیٹر نے کہا "کیا رات کی دعا
میں تم کسی قریبی چرچ میں مرزا کو نہیں لے جا سکتیں —— مجھے مسلمانوں کی ایک بات بہت پسند ہے کہ
وہ ہمارے مسیح کو پیغمبر مانتے ہیں ——"

جب چائے پینا ختم ہو ا وقت تھا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا اور بلیک آؤٹ کے زمانے میں جیسی روشنیاں ہوتی

تھیں وہ روشن ہو چکی تھیں —— ہم سب ڈرائنگ روم میں آگ کے قریب بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ کبھی کبھار مسز پیٹر باورچی خانے کا اور کبھی اینی ایک آدھ چکر لگا لیتے تھے۔ مجھے رہ رہ جیکب کا خیال آتا تھا۔ شاید یہی حال اینی کا بھی تھا۔ مجھے اینی اور مسز پیٹر کے دل کا حال نہیں معلوم لیکن اس وقت مجھے جاپان اور جرمن کے حملے کا اتنا خوف نہیں تھا جس قدر جیکب کے آجانے کا تھا لیکن وہ نہیں آیا —— ہم باتیں کرتے رہے —— وہ نہیں آیا۔ ہم نے رات ہوتے ہی بڑا پر تکلف کھانا کھایا اور وہ نہیں آیا۔ پھر ہم ڈرائینگ روم میں کرسمس ٹری کے پاس آکر بیٹھ رہے اور وہ نہیں آیا، ہم آگ تاپتے رہے اور مختلف باتیں کرتے رہے لیکن وہ نہیں آیا —— اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہم اس کے بارے میں سب کچھ بھول بھال کر باتوں میں مگن ہو گئے۔ خوب جی بھر کے قہقہے لگائے اور خوب باتیں کیں۔ یہاں تک کہ مسز پیٹر کو جمائیاں آنے لگیں لیکن ۲۵ دسمبر کو عیسائی تمام رات جاگتے ہیں اور حضرت مسیح کی ولادت کا کیک ٹھیک بارہ بجے رات میں کاٹتے ہیں لہذا مسز پیٹر کے سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور ابھی بارہ بجنے میں کم از کم ڈھائی گھنٹے باقی تھے، معاً اینی کو جانے کیا سوجھی کہ اس نے باہر سڑک پر گھومنے کی تجویز پیش کی اور ماں سے کہا کہ وہ کرسمس ٹری کے سامنے بیٹھی رہے۔

ہم اوورکوٹ پہن کر سڑک پر آگئے۔ سڑک تقریباً سنسان پڑی تھی۔ دو رویہ درختوں کے بیچ میں سڑک دور تک چلی گئی تھی۔ بھلا بلیک آؤٹ کی روشنی میں ہم سڑک کہاں دیکھ سکتے تھے۔ ہمارے سروں پر چاند چمک رہا تھا اور جاڑے کی بے مہر چاندنی نے سڑک کو قدرے واضح کر دیا تھا۔ اینی نے میری کمر میں ہاتھ ڈال رکھا تھا اور میں اس کے ہاتھ میں گویا ایک کھلونا بنا ہوا تھا۔ میں آج بھی یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ اینی پر محبت کا کوئی جذبہ غالب تھا یا محض جنسی غلبہ تھا، بہرحال ہمارے جسم گرم تھے اور دل کی دھڑکنیں تیز تھیں۔ ہم ایک دوسرے کے ہاتھوں

میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے اور آگے پیچھے سے قطعاً بے فکر چلے جارہے تھے، خاموش، بے مقصد اور بلا ارادہ۔ ہماری کوئی منزل نہ تھی، کوئی جگہ نہ تھی۔ کبھی کبھار ہم چند ثانیوں کے لئے کسی جگہ ٹھہر جاتے اور اینی کی محبت اس قدر گرم جوش اور ولولہ انگیز ہو جاتی کہ اس کے تشددانہ رویے سے میں گھبرا جاتا ——ایک جگہ بس ایک کا رہم کو گھورتے ہوئے ملگجی روشنی کے ساتھ گزر گئی لیکن اینی کی گرم جوشی میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس سے قبل اور اس کے بعد آج تک مجھے کسی عورت نے اتنی شدت سے نہیں چاہا—— ایک سنسان سے میدان میں ایک اداس سا مندر چاندنی میں ڈوبا ہوا کھڑا تھا۔ جہاں دن کی تیز دھوپ میں بعض عمارتیں غیر دلچسپ اور بے کیف نظر آتی ہیں، وہی عمارتیں چاندنی راتوں میں پرکشش اور رومانی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر دن میں مَیں نے اس مندر کو دیکھا ہوتا تو شاید اس کے مہیب تنہا تنہا اداس سے کلس مجھے یہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے پر مجبور کر دیتے لیکن چاندنی میں وہ خنک احساس اور دھیما پن ہوتا ہے جو دھوپ کی تمازت سے ابھرے ہوئے زخموں پر ٹھنڈا ٹھنڈا مرہم رکھ دیتا ہے۔ ہم دونوں پر اس عمارت کے سناٹے نے نہ جانے کیا جادو کیا کہ ہم خود بخود اس طرف چل دیئے۔ چاروں طرف گھما ونے پتا در کی لمبی لمبی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ بیچ سے کچا راستہ بنایا گیا تھا ہم اس راستے پر چلنے لگے۔ مندر کی کرسی قدِ آدم بلند تھی۔ سیڑھیوں پر چڑھ کر مندر کے بند دروازے کے سامنے ہم بیٹھ گئے۔ درختوں کے جھنڈوں میں سے چاندنی چھن چھن کر ہم پر پڑ رہی تھی۔ —— معاً اس خود سپردگی کے عالم سے چونک کر اینی نے اوورکوٹ کی جیب سے ایک بوتل نکالی اور مجھے بڑھا دی۔ میں نے نفی میں گردن ہلا دی تو اس نے خود ہی بوتل خالی کر کے جھاڑیوں میں اچھال دی۔ یہ سب کچھ اس قدر آناً فاناً ہوا کہ میں کچھ نہ کر سکا۔ اینی کو شراب پینے سے روک بھی نہ سکا۔ ہم تقریباً دو میل گھر سے دور آگئے تھے۔ شراب کے نشے

میں اینی کو سنبھالنا خاصا مشکل کام تھا اور میں اندر ہی اندر گھبرا رہا تھا کہ اب دیکھئے کیا نیا گل کھلتا ہے لیکن سرد ہوامیں شراب کا اثر اینی پر صرف اتنا ہوا کہ اُس نے میری گود میں سر ڈال دیا۔ میں سمجھا کہ اس پر غنودگی طاری ہو رہی ہے یا نشہ چڑھ رہا ہے لیکن وہ تقریباً بے حس و حرکت پڑی رہی اور میں آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ مجھے معلوم نہیں کیوں ایسا تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ ہم نے زبان سے بہت کم گفتگو کی، تقریباً سفر کے برابر۔ یہاں تک کہ چاند اپنے سفر کا ایک حصہ طے کر کے مغرب کی طرف جھک گیا اور ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے لیکن اسی دوران اینی کے آنسوؤں سے میں چونکا۔

”تم رو رہی ہو؟“

اور اینی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا صرف سسکیوں کی ضرب سے اس کا سارا وجود ہلنے لگا۔ میں اس کو لے کر اٹھ بیٹھا اور جس طرح کسی مریض کو اسٹریچر میں لاد کر اسپتال کی میز پر ڈال دیا جاتا ہے۔ میں اسے اپنی باہوں میں لے کر اس کے گھر آگیا۔ باہر جیکب کی گاڑی کھڑی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی بپھرے ہوئے شیر کی طرح جیکب نے میرے اوپر مکّے سے حملہ کر دیا اور میں ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ اینی کو گود میں اٹھا کر باہر لے گیا اور کار میں ڈال دیا۔ قبل اس کے کہ میں اس سے لڑنے کا پروگرام بناتا جیکب مجھے گالیاں دیتا ہوا کار اسٹارٹ کر کے اینی کو لے اڑا۔ ٹھیک بارہ بجے میں مسز پیٹر کے ساتھ کرسمس ٹری کے پاس بیٹھا ہوا وہ دعائیں پڑھ رہا تھا جو مسز پیٹر کو یاد تھیں اور کیک کاٹا جا رہا تھا۔ مسز پیٹر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

یہ واقعہ بجائے خود اس قدر تلخ تھا کہ میں اُسے بھول جانا چاہتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ دبلی علی گڑھ جانے کے بعد واقعات اس قدر تیزی سے پیش آئے کہ میں اینی کو یاد بھی رکھنا چاہتا تو ناممکن تھا۔ مجھے بی۔ اے کی تیاری کرنا پڑتی جائداد کے مقدمات کے سلسلے میں بار لکھنؤ جانا پڑتا۔

اسی اثنا میں جنگ ختم ہو گئی اور میں نہ چاہتے ہوئے فوج کے محکمے میں جانے کے لئے انگلینڈ (سینڈھرسٹ) بھیج دیا گیا۔ جب وہاں سے فارغ التحصیل ہوا تو ملک آزاد ہوا ملک آزاد ہو چکا تھا اور متعلقین پاکستان پہنچ چکے تھے۔ بہت جلد مجھے لاہور پہنچنا پڑا اور یہاں میری چچا زاد بہن سے شادی کر دی گئی۔ زمانہ اچھا تھا۔ ترقیاں ملتی رہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے میں چند سال کے عرصے میں کیپٹن اور پھر میجر ہو گیا۔ میری گھریلو زندگی اس قدر مطمئن اور آسودہ تھی کہ اس مدت میں مجھے بھول کر بھی ایتی کی یاد نہ آئی ـــــ ہاں کبھی کبھار یہ ضرور ہوتا کہ کسی یورپین خاتون کو دیکھتا اور اس کی چھب ایتی سے ملتی جلتی ہوتی تو ایک ٹھنڈی سانس بھر لیتا۔ کرسمس آتا اور گزر جاتا۔ مجھے خبر بھی نہ ہوتی۔ قیام پاکستان کے بعد جو برصغیر میں پھیلے ہوئے طرفین کے اعزا میں افراتفری مچی تھی اس کا شکار میرا خاندان بھی تھا۔ جب اعزا کے بارے میں پورے طور پر کچھ پتہ نہ تھا تو بھلا ایتی کے بارے میں کیا سوچا جا سکتا تھا۔

ایک بار یورپ کے ایک ملک میں ہمارا فوجی وفد ایک خاص مشن سے روانہ ہوا۔ اتفاقاً میں اس وفد کا لیڈر تھا۔ سفر بھی پی آئی اے کے بجائے بی او اے سی سے کرنا تھا اور ایک خاص ملک تھوڑی دیر قیام کر کے منزل مقصود پر روانہ ہونا تھا۔ اس سفر کی زیادہ تشہیر بھی نامناسب تھی لہٰذا بڑی خاموشی سے منزل مقصود پر روانہ ہو گیا۔ یورپ کے ایک ملک میں کچھ وقت گزار کر میں آگے روانہ ہوا تو بی او اے سی کا جہاز اور عملہ بدلا ہوا تھا۔ میں نے اس بات پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔ جہاز روانہ ہوتے ہی ایئر ہوسٹسوں نے خاطر مدارات شروع کر دی کہ اچانک ایک ایئر ہوسٹس میری نشست کے پاس پہنچ کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ میں نے رسالے کو منہ پر پھیلاتے ہوئے انکار کر دیا۔ لیکن ایئر ہوسٹس نے میری نشست کے پاس سے جنبش بھی نہ کی۔ مجھے قدرے غصہ آیا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ رسالہ سامنے سے ہٹا کر جو نظر ڈالی تو ایتی ـــــ ایتی مجھے بغور دیکھ رہی تھی اور میں ایتی کو

ہم نے ایک دوسرے کو ایک بار تقریباً کوئی دس بارہ سال کے بعد دیکھا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں
زیادہ تندرست اور صحت مند ہو گئی تھی اور چہرے پر ایک خاص قسم کی ملاحت بھی پیدا ہو گئی تھی
یورپ کی اکثر خواتین کو "ٹین" کرنے کا جو خبط ہوتا ہے اور اس سے وہ اپنی جلد کے سفید سفید
ذرات کو بھورا بنا کر خوبصورت بنایا کرتی ہیں وہ صفت قدرتی طور پر اپنی کی جلد میں موجود
تھی اور اب اور بھی زیادہ نکھر آئی تھی۔ وہ خون کے لحاظ سے دوغلی تھی لہذا جلد میں ایک ایسا
نمک بھی دمک رہا تھا جس سے اس کی شخصیت پر کشش بن گئی تھی۔ بال بدستور بھورے اور
صحت مند تھے۔ کمر کولھے کسی قدر مائل بہ فربہی تھے۔ ایر ہوسٹس کے مخصوص لباس میں بڑی بھلی معلوم
ہو رہی تھی ـــــ چاق و چوبند، ہشاش بشاش مسکراتا ہوا چہرہ، آنکھوں میں وہی شوخی اور
وہی محبت موجود تھی۔ دھیرے سے بولی "کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں یا سچ مچ میری
نگاہوں کے سامنے مرزا کا چہرہ ہے ـــــ مرزا دی گریٹ پرنس آف لکھنؤ کا چہرہ۔

میں مسکرا دیا۔ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ کچھ منصب مانع تھا، کچھ اپنے
کام کی نوعیت کا وقار اور حالتِ سفر میں گرد و پیش کا ماحول، میں نے صرف اتنا کہا "نہیں اپنی
پرنس نہیں، اپنے ملک پاکستان کا ایک سپاہی ـــــ ہم پھر ملیں گے ـــــ جلد ہی"

اور اپنی تمام ماحول کو بھانپتے ہوئے گردن ہلاتی ہوئی چلی گئی۔ میرے قریب ہی بعض
مسافروں کو اتنی باتیں بھی غالباً اچھی معلوم نہ ہوئیں۔ انھوں نے ہم دونوں کو شک و شبہ کی
نگاہوں سے دیکھا ـــــ اپنی ادھر ادھر آتے جاتے۔ کاک پٹ کی طرف مڑتے ہوئے کبھی پیچھے
کی طرف ٹھہرتے ہوئے مجھے دیکھتی رہی ـــــ اور میں آنکھوں سے نہ دیکھنے کے باوجود کنکھیوں سے
دیکھتا رہا ـــــ دل کی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور اس احساس کی وجہ سے کہ اپنی اس جہاز پہ میری
ہم سفر ہے۔ دل زوروں سے نہ سہی ـــــ آج سے دس بارہ سال پہلے کی طرح نہ سہی ـــــ مگر

دھڑکتا ضرور رہا اور میں کسی بات پر ٹھیک ٹھیک دھیان نہ دے سکا۔ میری جغرافیہ اس قدر کمزور ہے کہ میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ میرا جہاز کس منطقے سے گزر رہا تھا لیکن بہت کافی بند وبست کے باوجود سردی اس قدر تھی کہ کبھی کبھی تو دانت بجنے لگتے تھے کمبل اور اوورکوٹ ٹانگوں پر پڑے ہوئے تھے اور ہم میں سے بہت سے لوگ ہونٹوں سے آتش سیال کے جام جدا نہیں کر رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اپنی کی ہدایت پر پورا پورا عائل ہوا۔ کوئی ایرہوسٹس جھوٹوں بھی میرے پاس شراب لے کر نہ آئی — ہاں کافی میں نے پی — کئی کئی بار پی اور کئی کئی بار میں نے اپنی کو دیکھا۔ جب بھی دیکھا اپنی طرف نگراں پایا۔ مجھے معلوم ہے اور میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ میں غیر معمولی وجیہہ و شکیل واقع نہیں ہوا ہوں لیکن اپنی کو جو ایک خصوصی ربط مجھ سے رہا ہے وہ اور کسی سبب سے ہے —— وہ سبب کیا ہے، مجھے معلوم نہیں۔

یہ سارا رات کا سفر تھا کہ اچانک ہمیں بتایا گیا کہ چند وجوہ کی بنا پر چند لمحوں میں ہمارا جہاز لینڈ کرے گا حفاظتی پیٹیاں چڑھالی جائیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا، جہاز دھند اور ابر کے اتھاہ ساگر میں ڈوبتا ہوا نیچے پہنچا۔ ایک بے حد اداس اور چپ چاپ ایروڈروم پر جہاز پہنچ گیا۔ پھر اعلان ہوا خدا کا شکر ہے کہ ہم صحیح سلامت زمین پر پہنچ گئے۔ ایک بے حد ہولناک برفانی طوفان میں جہاز کے پھنسنے کا احتمال تھا۔ ہم سے یہ بھی کہا گیا کہ ہم صبح سے پہلے اس جگہ سے روانہ نہیں ہو سکتے۔ مسافر آرام کرنے کے لئے لاؤنج میں پہنچ کر رات گزاریں۔ سب سے آخر میں جو مسافر جہاز سے اُترا وہ میں تھا اور میرے ساتھ اپنی۔ اپنی مجھے کھینچ کر ایک ایسے گوشے میں لے گئی جو ہر طرح محفوظ تھا اور مجھے اچھی طرح پتا تھا کہ وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ میں نے کہا: "تمہاری ممی کہاں ہیں؟ تم کس دیس بستی ہو، جیکب کہاں ہے؟"

اس نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا: "جیکب جہنم میں گیا۔ ممی مرگئیں اور میں زندہ رہنے کے لئے دیس دیس کی ہوا کھا رہی ہوں۔ آج کل لندن میں ہوں۔ کل مجھے کہاں رہنا پڑے گا مجھے معلوم نہیں۔ اب تم کہو اپنی ــــ کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو؟ اب تک کتنی دیسی اور بدیسی لڑکیوں سے دوستی گانٹھ چکے ہو؟"

ہم جس جگہ بیٹھے تھے وہ لاؤنج کے ایک بالکل سنسان سے حصے کا ریستوراں تھا جہاں بار کا بھی انتظام تھا اور جس صوفے پر ہم بیٹھے تھے۔ اسے بآسانی کسی مختصر سے کیبن میں بھی بدلا جا سکتا تھا۔ اینی نے یہی کیا اور ہم ایک ہی کمبل میں لپٹ کر باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا: "میں نے تو ایک ہی لڑکی سے دوستی گانٹھی ہے جو بیک وقت دیسی بھی ہے اور بدیسی بھی۔"

وہ مسکرائی اور میرے بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے۔ بولی "میں سمجھتی ہوں ــــ میں جانتی ہوں، میں جانتی ہوں مرزا ڈیر! ــــ وہ لڑکی میرے سوا کوئی نہیں ہو سکتی ــــ اور ہاں مرزا، یاد رکھو میں بڑی سچی عورت ہوں۔ میری زندگی میں لاتعداد مرد آچکے ہیں بلکہ دنیا کی کسی قوم کا مرد ایسا نہ ہوگا جو میری زندگی میں نہ آیا ہو لیکن مجھے کسی سے پیار نہیں ہوا۔ کسی سے نہیں ہوا ــــ تم سے ہے، کیوں ہے؟ مجھے کچھ پتہ نہیں کیوں ہے ــــ ہائے جیکب اگر مجھے اُس رات نہ لے جاتا تو میں تم سے اس طرح نہ بچھڑتی ــــ جانتے ہو اُس نے کیا کیا؟ ــــ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ خوب شراب پی اور اُس کے تین اور ساتھیوں نے مل کر مجھے خوب بھنبھوڑا۔ رات بھر ان ٹامیوں نے میرے جسم کو نوچا کھسوٹا۔ اُس کے بعد جیکب مجھے پھر کبھی نہ ملا۔ ممی مرگئیں لیکن وہ نہ آیا۔ میں نے اپنے باپ کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اُس سے مدد چاہی لیکن اُس نے کوئی توجہ نہ دی پھر میری زندگی میں مختلف مرد آتے رہے مجھے کسی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جنگ ختم ہوگئی۔ پھر پاکستان بن گیا اور ہندوستان اور پاکستان آزاد ہوگئے اور ایک رحمدل بوڑھا انگریز جو زندگی بھر

تبلیغی کام کرتا رہا تھا۔ مجھے میرے ایما پر لندن لے گیا۔ جہاں میں بی او اے سی میں ملازم ہو گئی اور اب، اب میں یہاں تمہارے ساتھ ہوں اس علاقے میں جو بہت غیر آباد ہے۔ جہاں برف پڑتی رہتی ہے۔ اس وقت بھی آسمان سے برف کے گالے اتر رہے ہیں۔ ہوائیں ایسی سرد ہیں کہ ہڈی کے مغز تک پہنچ جائیں۔ ہم اس ہوائی اڈے کے لاؤنج کے ایک بالکل غیر آباد کونے میں ایک دوسرے کے پاس موجود ہیں۔ ہم بہت عرصے کے بعد ملے ہیں۔ یہ ہماری ہی قسمت سے موسم خراب ہو گیا ہے کہ جہاز کو اترنا پڑا ہے ـــــ اور ہم ایک بار پھر کوئی دس بارہ سال کے بعد ملے ہیں۔ ہمیں دلی کی وہ رات یاد آ رہی ہے جب ایک مندر کی سیڑھیوں پر ہم بیٹھے تھے ـــــ تو مرزا دی گریٹ پرنس آف لکھنؤ، اب تم بتاؤ کہ تم پاکستان کے کس شہر میں ہو؟ کراچی، ڈھاکہ، چٹاگانگ، لاہور، پنڈی، کھاریاں یا پشاور ـــــ؟"

میں نے نہایت آہستگی سے کہا "لاہور"

وہ بہت کچھ کہہ دینا چاہتی تھی۔ مجھ سے میرے بارے میں سننا چاہتی تھی لیکن میرے مختصر سے جواب سے اسے تشفی نہ ہوئی "اور تم وہاں کیا ہو؟"

میں نے کہا "سپاہی، اپنی فوج کا سپاہی۔"

میرے اس جواب سے بھی اسے کوئی اطمینان نہ ہوا تو وہ بولی "خیر تم کیپٹن یا میجر سے کیا کم ہو گے ـــــ پھر بھی مجھے اس سے کیا ـــــ میں نے تو آج تک اس ہار کو سنبھال کر رکھا ہے وہ میری منگنی کا ہار ہے نا ـــــ تم نے کہا تھا کہ تمہاری ماں نے وصیت کی تھی کہ یہ ہار تم اپنی منگیتر کو پہناؤ گے ـــــ تم نے مجھے اپنی دلہن کہا تھا ـــــ سنو مرزا، بہت سے مردوں نے مجھے پیار کیا ہے۔ میرے جسم سے کھیلے ہیں ـــــ لیکن کسی نے جھوٹ موٹ بھی کبھی نہ مجھے اپنی دلہن بنایا اور نہ منگیتر ـــــ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر تم مجھے نہ مل سکے تو میں زندگی بھر شادی نہ کروں گی ـــــ

شادی کوئی معمولی چیز نہیں ہے، بڑی چیز نہیں ہے، بہت بڑی چیز ہے ___ شادی عورت اسی سے کرتی ہے جو اس کا محبوب ہو ___ اور تم ___ تم میرے محبوب ہو ___ ہو نا؟ ___ کہیں تم بدل تو نہیں گئے ہو ___ نہیں نہیں تم بدل نہیں سکتے۔ یہ خیال نہ کرنا کہ میں تمہاری محبت پر شبہ کر رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے مرزا کہ تم اب لکھنؤ کے پرنس نہیں ہو، نہ تمہارے پاس محل ہے اور نہ باغ، نہ گھوڑے اور نہ وہ الف لیلوی ٹھاٹ باٹ ___ لیکن مجھے اس سے کچھ کام نہیں۔ ___ میرے لئے تم وہی مرزا دی گریٹ پرنس آف لکھنؤ رہو گے جو میرے ساتھ پتنگ اڑاتا تھا، ٹرائی سائیکل چلاتا تھا۔ گھوڑے پر سواری کرتا تھا۔ اور وہی ہیں کرسمس کے موقع پر جس نے مجھے قیمتی ہار پہنا کر دلہن بنایا تھا ___ تم کس قدر عجیب و غریب نوجوان ہو مرزا جب بھی مجھے مندر کے پاس بیٹھ کر رات کے وہ لمحات گزارنے کا خیال آتا ہے۔ میں سوچنے لگتی ہوں کہ دیوتا اگر ہوتا ہے تو وہ مندر میں نہیں تھا میرے پاس تھا، میرے پہلو میں تھا ___ وہ آج بھی میرے پہلو میں ہے ___ تمہیں کیا معلوم مرزا میں جب کبھی چیپل میں شریک ہوتی ہوں آنکھیں بند کر کے تمہیں یاد کرتی ہوں، تمہیں، صرف تمہیں۔"

میری ہمت نہیں پڑی کہ میں اُسے بتاتا کہ میں شادی شدہ ہوں لیکن مجھے یاد آیا کہ چند دنوں بعد جب میں یورپ سے پاکستان جاؤں گا تو کرسمس ہوگا۔ کیوں نہ اس کرسمس پر ایمی کو مدعو کر لیا جائے۔ سفر تو اسے تقریباً مفت ہی پڑ جائے گا۔ لاہور بھی گھوم لے گی اور میری شادی کا اس پر انکشاف بھی ہو جائے گا اور اس طرح یہ تنہا اداس عورت زمانے کے ستم سہنے سے کچھ تو بچ رہے گی چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ مجھے افسوس ہے کہ کچھ اخلاقی جرأت کے فقدان نے اور کچھ اس خوف نے کہ مبادا کوئی الٹی سیدھی حرکت اس سے سرزد نہ ہو جائے، مجھے یہ بات بتانے سے باز رکھا۔ بہرحال کرسمس کی دعوت اس نے قبول کر لی اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر موقع ملا تو وہ اسی کرسمس پر مجھ سے

شادی بھی کرلے گی کیونکہ اب اس تنہا، اداس زندگی کا بوجھ اس سے سہارے نہیں سہارا جاتا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ میرے پتہ پر بغیر اطلاع دیئے اچانک پہنچے گی وغیرہ وغیرہ۔

یورپ سے واپس آکر میں اپنے کارِ منصبی میں منہمک ہوگیا۔ دسمبر کا شروع تو تھا ہی۔ دن گن گن کر بیتنے لگے۔ ایک روز جب میں گھر واپس آیا تو میرے بچے اسکول سے آچکے تھے۔ بیوی طبی معائنہ کرانے گئی ہوئی تھی۔ میں انتظار کرنے کے لئے اخبار پڑھنے لگا تو معمولاً نوکر نے آکر بتایا "آج صاحب جی ایک میم صاحب آئی تھیں"۔ــــ میں نے کچھ سنا، کچھ نہیں سنا، ہوں ہاں کرتا رہا اور نوکر جھاڑ پونچھ کرتا رہا اور بتاتا رہا۔ــ آپ کو پوچھتی تھیں ــ مجھے یاد نہیں آپ کا کیا نام لے رہی تھیں ـــ کچھ انگریزی میں تھا ـــ بے بی سے پوچھ لیجئے ــــ"

بے بی کو بلایا گیا ـــ بچی نے کہا: "ابّو وہ تو کوئی انگریز عورت تھی ــــ کہنے لگی آپ کا نام لے کر، یہ مرزا کا گھر ہے ـــ ؟ مرزا دی گریٹ پرنس آف لکھنؤ کا گھر؟" گڈو بولا "ہاں ہاں یہ میجر صاحب کا گھر ہے ــــ وہ عورت ایک ٹیکسی سے اتری تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک اٹیچی تھی اور تھیلا ـــ چمڑے کا خوبصورت تھیلا ابّو! ایسے تھیلے ہمارے پاکستان میں نہیں بنتے

پھر اس نے کہا مرزا کہاں ہے؟ گڈو بولا، ہمارے ابو تو دوپہر میں آتے ہیں ــــ اور ابّو وہ بولی ـــ "کیا مرزا تمہارے ابّو ہیں؟ ـــ پھر وہ ایک دم سے یوں بیٹھ گئی جیسے گر پڑی ہو ـــ اُس کرسی پر جو برآمدے میں پڑی ہے جس پر ممی بیٹھ کر سوئٹر بنتی ہیں۔"

گڈو بولا: پھر وہ دھیرے سے اٹھی اور ڈرائینگ روم میں آگئی۔

"بچی نے کہا: ابّو وہ آپ کے بیڈ روم میں بھی گئی تھی ـــ اور وہ جو ممی کے ساتھ آپ کی تصویر ہے نا، اسے دیکھتی رہی تھی۔"

"ہاں ہاں،" گڈو نے کہا، "اور جانتے ہیں ابو پھر اس نے کیا کیا؟ ـــ اپنی اٹیچی سے

ایک ہار نکال لائی ــــ اس تصویر کو پہنا دیا۔ دیکھئے ابّو ــــ آیئے آیئے میں آپ کو دکھا دوں۔"
بچی نے کہا، پھر اس نے ایچی اٹھائی اور ہم دونوں کو باری باری سے پیار کیا۔
گڈو بولا "اور تم نے دیکھا تھا جب وہ پیار کر رہی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
نوکر نے کہا "صاحب جی! میں نے میم صاحب کو بہت روکا، میں نے کہا صاحب اور بیگم صاحب آنے ہی والے ہیں، آپ ٹھہر جائیے لیکن میم صاحب جب یہاں آئی تھیں تو اتنی خوش تھیں کہ کیا کہیے اور جب واپس جا رہی تھیں تو واپس جا رہی تو پاؤں نہیں اُٹھ رہے تھے۔
اس اثنا میں میری بیوی بھی آ گئی۔ یہ حکایت اُس کو بھی سنا دی گئی لیکن میں جیسے سُن بیٹھا ہوا تھا۔ میری بیوی نے سچے موتیوں کے ہار کو گلے میں ڈال کر کہا ــــ "کیسے بڑے بڑے موتیوں کا ہار ہے ــــ سچے موتی ہیں۔ بالکل سچے ــــ چھ سات ہزار سے اس کی قیمت کیا کم ہو گی ــــ اے بولیے نا ــــ"

میرے منہ سے صرف اتنا نکلا "بڑا قیمتی ہار ہے۔"
"جانے کون اللہ کی بندی تھی ــــ یاد نہیں آتا کوئی پرانی سہیلی ہو گی ــــ خیر ہار بہت عمدہ ہے"، اور میری بیوی یہ کہتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔
میں سُن ہو کر رہ گیا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ ایک بار پھر اپنی کے ہاتھ سے پتنگ کٹ گئی ہے بلکہ اپنی خود پتنگ کی طرح کٹ کر فضا میں ڈولتی چلی جا رہی ہے۔ ڈور میرے ہاتھ میں رہ گئی ہے اور میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا "اوہ سوری!"

رشوت

مبلغ ایک سو پینتیس روپے ماہوار کی ایک آسامی میرے دفتر میں خالی ہوئی جو ہر طرح میرے دائرۂ اختیار میں بھی تھی اور بالواسطہ و بلاواسطہ دونوں طرح میرے ماتحت تھی۔ درخواستوں کا انبار لگ گیا اور درخواستوں سے زیادہ سفارشی خطوط کا۔ سفارشی ٹیلی فون کا کوئی شمار و قطار ہی نہیں اور اب مجھے معلوم ہوا کہ میری جان کس قدر عذاب میں تھی۔ ایک کلرک کی آسامی کے لئے بڑی بڑی سفارشیں اور نہ معلوم کس کس طرح سے اشاروں اور کنایوں میں رشوتوں کی پیش کش۔ مجھے ایک ایماندار افسر ہونے پر اب تک بڑا ناز و غرہ تھا اور میں تہیہ کئے بیٹھا تھا کہ اس فخر کو باقی رکھوں گا خواہ کچھ بھی ہو۔

میں نے تمام سفارشی خطوط پڑھے بغیر ضائع کر دیئے ٹیلی فون سنتا اور سفارشی کلمات سن کر فون بند کر دیتا اور اس طرح اللہ اللہ کر کے انٹرویو کا دن پہنچا تو برآمدے کے سامنے ہر ہر وضع اور ہر ہر قماش کے لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے۔ دراصل دفتر میں ایک ایسے محرر کی ضرورت تھی جو

ٹائپ بھی جانتا ہو۔ ظاہر ہے میٹرک تک تعلیم کو کافی سمجھا گیا تھا لیکن درخواست دہندہ انٹر وبی آئے ہی نہیں ایم اے بھی آئے تھے۔ اس بات سے ملک کی بیروزگاری اور بے ربط و بلا منصوبہ بندی کے تعلیمی نظام کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ خیر انٹرویو شروع ہوا اور ایک ایک کر کے لوگ آتے جاتے رہے۔

انٹرویو میں سب سے پہلے میں یہ واضح کر دیتا کہ اگر آپ میں سے کسی صاحب کا سفارشی خط درخواست میں منسلک ہوگا تو وہ ضائع ہو چکا ہے۔ آپ اپنی ذاتی قابلیت پر یہ اسامی حاصل کر سکتے ہیں۔ نہ معلوم کتنے لوگوں کے منہ لٹک گئے۔ بعض نے مجھے شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا لیکن میں دھن کا پکا تھا اس کی کیا پرواہ کرتا۔

بعض خواتین بھی انٹرویو دینے آئی تھیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان میں سے کوئی ہرگز اس اسامی کی اہل نہیں تھی۔ ان میں سے ہر ایک نے کاسمیٹکس کا بے دریغ استعمال کیا تھا اور کپڑوں، اور جسم کو بری طرح خوشبوؤں میں بسایا تھا۔ اس حساب سے اگر دیکھا جائے تو ان کی تنخواہ کسی طرح بھی ان کا تکفل نہیں کر سکتی تھی۔ مجبوراً سب سے انکار کر کے رخصت کر دیا گیا اور دوسرے امیدواروں کے لئے انٹرویو جاری رہا۔

بعض مرد امیدوار ایسے ضرور تھے جنھیں دیکھ کر رحم آتا تھا لیکن رحم سے کام نہیں چلتا دفتر نہیں چلتے۔ دفتر کے لئے تو چاق و چوبند، مستعد، ہوشیار اہل اور کسی قدر سلیقہ شعار آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پورے تیس آدمیوں میں مجھے صرف چار لڑکے پسند آئے اور اسامی تھی محض ایک۔ شام ہوتے ہوتے فائلیں نپٹا کر چاروں کی فائلیں گاڑی میں رکھیں اور گھر آ پہنچا۔ اب میرے سامنے ان چاروں میں سے کسی ایک کے صحیح انتخاب کا معاملہ تھا جو ظاہر ہے کہ آسان نہ تھا بلکہ پل صراط سے گذرنے کے مصداق تھا۔

مجھے معلوم ہے کہ انتخاب عموماً اس طرح عمل میں آتے ہیں کہ سفارشیوں میں جو زیادہ زور دار

سفارشی ہو اس کو انتخاب کرو چلو پاپ کٹا۔ البتہ سفارش کنندہ کی حیثیت کو خوب ناپ تول کر سفارش قبول کی جاتی ہے۔ یا تو سفارش کنندہ سے لالچ ہو یا خوف۔ لالچ یہ کہ کل یہی سفارش کنندہ تمہارے کام آئے گا۔ اور خوف یہ کہ اگر کام نہ ہوا تو تمہیں تباہ کر دے گا۔ عموماً برصغیر کے افسروں کی ذہنیت ایسی ہی غلامانہ واقع ہوئی ہے۔ لہذا میں نے اس سے اجتناب کیا۔ ایک قسم ان افسروں کی ہے جو سفارش سے زیادہ رشوت پر یقین رکھتے ہیں۔ میں نے ایسے تمام راستے مسدود کر لئے تھے۔ اور خود اپنے لئے مشکل پیدا کر لی تھی۔ اور یہ مشکل خود مجھے حل کرنا تھی۔

میں رات کے کھانے کے بعد ٹہلنے گیا اور واپس آ کر پھر چاروں فائلیں لے کر بیٹھ گیا۔ بڑے غور و خوض کے بعد میں نے دو فائلیں مسترد کر دیں اور اب دو رہ گئی تھیں جن میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا کہ ناگاہ گھنٹی بجی اور میں جز بز ہوتا ہوا باہر گیا تو دیکھا رات کے اندھیرے میں سیاہ برقع پوش خاتون مجھ سے میرا نام پوچھ رہی تھیں۔ سردی کا زمانہ تھا اور خاتون کی آواز کپکپا رہی تھی۔ اور آج میرا اکلوتا نوکر تک موجود نہیں تھا لہذا اکیلے گھر میں خاتون کو بلانا بھی مجھے پسند نہ آیا اور اس طرح گھر کے باہر کسی خاتون کو کھڑے رکھتے ہوئے اپنی بداخلاقی پہ سخت غصہ بھی آیا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلا دی اور خاتون نے خود ہی کہا۔

"کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟"

"ضرور ضرور۔ تشریف لائیے" میں نے دروازہ کھول کر راستہ دیا اور پھر دروازہ بند کر کے کوری ڈور میں اس کے ہمراہ چلنے لگا۔ اس نے نقاب اُلٹ کر اپنی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بھابی کہاں ہیں؟" اور پھر وضاحت کے طور پہ بولی "میرا مطلب ہے آپ کی بیگم صاحبہ۔" مجھے یہ بے تکلفی کچھ اچھی نہ معلوم ہوئی کیونکہ میں کنوارا تھا اور یہ عورت اجنبی تھی۔۔۔ جب وہ

مجھ سے واقف ہی نہیں تھی تو جاڑے کی اس یخ بستہ رات میں تن تنہا جوان جہاں عورت کا کسی نوجوان کے مکان میں تنہا جانا کہ اس سے ایسا سوال کرنے کا کیا حق ہے لیکن میں نے مسکرا کر کہا۔

"ابھی شادی نہیں کی۔"

"ہائے اللہ ــــ" اس نے گورا گورا ہاتھ ماتھے پر مار کر کہا۔ اور کرسی پر دھم سے بیٹھتے ہوئے بدستور ہاتھ ماتھے پر جمائے رکھا۔ پورا ہاتھ شانے تک ننگا تھا۔ لیکن تندرست اور گورا چٹا۔ "اب کیا ہوگا؟"

"خیریت ہے؟" میں نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "فرمائیے کیا خدمت ہے میرے لائق؟"

اُس نے سردی میں سمسیاتے ہوئے کہا "اگر آپ اجازت دیں تو ایک بات کہوں۔" وہ اتنی احتیاط سے برقع اوڑھے ہوئے تھی کہ پاؤں کے گٹے تک چھپے ہوئے تھے۔

میں نے لیمپ کی روشنی کا زاویہ بدلتے ہوئے کہا۔ "کہیے۔"

"میرے بھائی کی درخواست۔"

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں چراغ پا ہوگیا اور اٹھ بیٹھا "بس بس محترمہ رہنے دیجیے ــــ میرا اصول ہے کہ نہ سفارش سنتا ہوں نہ کرتا ہوں، نہ رشوت لیتا ہوں نہ دیتا ہوں۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے۔" اس نے کہا "تبھی تو میں آپ کی بیگم کو پوچھ رہی تھی۔ ایک عورت ہی کسی عورت کے درد کو سمجھ سکتی ہے۔ آپ کیا سمجھیں گے۔" اس نے برقع کو گٹھوں تک تانتے ہوئے کہا۔

میں خاموش رہا۔ وہ مجھے خونخوار نگاہوں سے دیکھتی رہی اور میں اس کا منتظر رہا کہ وہ اب اٹھے گی اور چلی جائے گی لیکن وہ نہیں گئی اور بدستور جمی رہی۔ میں نے اخلاقاً کہا "معاف کیجیے گا میرا نوکر آج موجود نہیں ہے ورنہ آپ کو چائے پیش کرتا۔" ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب یہاں

چائے تک نہیں ملے گی۔ تم خواہ مخواہ کیوں بیٹھی وقت ضائع کر رہی ہو۔ لیکن خلاف توقع وہ بولی۔

"کوئی بات نہیں چائے میں خود بنا لوں گی۔ کچن کدھر ہے؟"

یا اللہ میں نے دل میں کہا یہ عورت تو شیطان کی طرح مسلط ہو گئی ہے۔ بغیر چائے پیئے نہیں ٹلے گی۔ میں اٹھا اور بولا۔

"آپ تشریف رکھئے میں بناتا ہوں۔"

وہ بولی "شکریہ ——— دیکھئے کچھ کھانے کو ہو تو ضرور لائیے گا۔ بھوک سے میرا برا حال ہے"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ سیدھا باورچی خانے میں گیا۔ اور کیتلی میں پانی بھر کر چولھے پر رکھ دیا۔ بجلی کا چولھا تھا لہذا کوئی زیادہ ہنگامہ نہیں تھا چند توسٹ پڑے تھے اور چند انڈے۔ لہذا میں میں انڈے فرائی کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے ہنسنے کی آواز آئی۔

"چہ چہ چہ بے چارے مرد ـــ، وہ بدستور سر سے پیر تک برقع میں تھی۔ صرف چہرہ کھلا ہوا تھا۔ مجھ سے مسکرا کر بولی" اچھا جناب آپ جا کر کمرے میں بیٹھیں یہ خادمہ ابھی چائے لے کر حاضر ہوتی ہے۔" اس نے کچن کا چارج مجھ سے لے لیا۔ میں بغیر کچھ کہے سنے کمرے میں واپس چلا آیا اور فائل کھول کر فیصلہ کرنے بیٹھ گیا۔ لیکن اب میرے کھلے ہوئے ذہن پر اس برقع پوش خاتون کا سایہ پڑ رہا تھا اور میں کوئی فیصلہ کرنے میں متامل تھا۔ میں نے سوچا کہ اس خاتون کے جانے کے بعد ہی فیصلہ کروں گا، تاکہ ذہن پر کسی قسم کا بار نہ ہو۔

بات کہتے میں چائے آ گئی۔ اس نے بڑی نفاست سے چائے بنا کر مجھے پیش کی۔ اس بار مجھے اس کا پورا ہاتھ شانے تک ننگا نظر آیا۔ تندرست اور خوبصورت جس میں چائے کی پیالی تھی میں نے شکریہ ادا کر کے چائے لے لی۔ اس نے کانٹے اور چھری کی مدد سے ٹوسٹ پر انڈے کا قتلہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

آپ تو کھائیں گے

میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔"

برقع سے اس کے دونوں ہاتھ نکلے ہوئے تھے اور تیزی سے انڈوں پر حملہ آور تھے مجھ سے رہا نہ گیا اور میں بولا۔

"جب آپ نے پردہ توڑ ہی دیا ہے تو برقع اتار کر اطمینان سے کیوں نہیں کھاتیں۔"

میری اس بات کے جواب میں وہ ذرا سا مسکرائی اور گردن نیہوڑا کر کھانے میں مصروف ہو گئی۔ چائے پی کر میرے سامنے قدرے بیباکی سے آ کر بیٹھ گئی میں سمجھا اب رخصت ہونا چاہتی ہے لیکن وہ بولی۔

"ہاں اب کہیئے۔"

اور میں نے کہا "کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔"

کیونکہ میں دل ہی دل میں ڈرا کہ کہیں اور دو تین گھنٹے یہ جم نہ جائے۔ مگر وہ بغیر تمہید کے بولی میں نے بڑی مشکل سے اپنے بھائی کو پڑھوایا ہے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہمارے گھر پر بم گرا تھا۔ ماں باپ شہید ہو گئے۔ ایک یہی بھائی ہے اور دو چھوٹی بہنیں۔ سب کا بوجھ میرے اوپر میرے اوپر ہے۔ سوچا تھا بھائی ملازم ہو جائے گا تو میری جان بچ جائے گی۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی اور میرے اوپر اپنی بات کا ردعمل دیکھنے لگی۔

میرا اندازہ یہ تھا کہ وہ کسی انڈسٹریل ہوم میں ملازم ہو گی یا کہیں استانی ہو گی کسی اسکول وغیرہ میں لیکن میں نے کرید کر پوچھا۔

"تم کیا کام کرتی ہو؟"

اس نے مجھے سر سے پاؤں تک گھورا جیسے مجھے کچا چبا جائے گی۔ اور کوئی جواب

نہ دیا۔ بس پیپر ویٹ سے کھیلتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد بولی۔

" آپ نے کوئی جواب نہ دیا کہ میرے بھائی کو ملازمت مل جائے گی یا نہیں ؟"

میں نے بڑی سرد مہری سے کہا" میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا کہ اپنا اصول توڑ دوں گا نہیں۔"

اس نے کہا "اچھا" اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔" اجازت ہے کہ میں برقع اتار دوں ؟"

میں نے کہا "کیا مضائقہ ہے بلکہ ذرا ہیٹر کے سامنے بیٹھ جایئے، جسم گرم ہو جائے تو چلی جایئے گا۔"

اس نے لیمپ کی مدھم روشنی میں برقع کے بٹن کھولنا شروع کر دیئے اور ایک جھٹکے کے ساتھ سارا برقع فرش پر آ رہا۔ اور اب وہ میرے سامنے کھلی ہوئی کتاب کی طرح کھڑی تھی۔ اس کا مرمریں جسم، اس کے بدن کے اعضا کا تناسب اور اس کی جلد کے اندر سے اٹھتی ہوئی ہلکی آنچ، بلوریں قمقموں کی مانند مدور چھاتیاں، کمر اور کولھوں کے خم کسی چابک دست فن کار کی سنگ تراشی کا نمونہ تھے۔ وہ میرے قریب آتے ہوئی بولی۔

آج تک میں نے خود سے یہ برقع کبھی نہیں اتارا تھا۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی اتارتا رہا ہے لیکن بھائی کی خاطر کوئی بہن اس سے زیادہ بڑی قربانی اور کیا دے سکتی ہے۔"

میں اٹھا اور اس کا برقع اٹھا کر اسے تھماتے ہوئے بولا

"یہ قربانی نہیں رشوت ہے۔"

رشتہ

میں آپ کو یہ ہرگز نہیں بتاؤں گا کہ کاروبار کس نوعیت کا کرتا ہوں لیکن اتنا ضرور بتاؤں گا کہ میں نے ملکوں ملکوں ہوائی سفر اس طرح کیے ہیں جیسے کراچی والے روزانہ بسوں پر سفر کرتے پھرتے ہیں۔ پھر یہ بھی بتاؤں گا کہ ہر ہر طرح کے مناظر اور ہر ہر قماش کے لوگوں سے میرا واسطہ پڑا ہے لیکن افسوس کہ جم کر کسی سے بھی واسطہ نہ پڑا۔ ایک سفر کے دوران، جب میں لندن سے کراچی واپس ہو رہا تھا۔ مجھے ایک پاکستانی مسیحی نوجوان ہمسفر پہلو میں بیٹھا ہوا مل گیا۔ یہ مجھے یاد نہیں کہ اُس نے کیا کیا باتیں مجھ سے کیں اور کتنی باتیں کیں۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس نے لاہور کا پتہ مجھے زبردستی تھما دیا اور وہ کارڈ کسی نہ کسی طرح میرے پاس پڑا بھی رہ گیا۔ اتفاق دیکھیے کہ کرسمس قریب پہنچا ادھر اُدھر کے دوستوں کو نئے سال اور کرسمس کے کارڈ بھیجے، معلوم کیسے اسے بھی بھیج دیا۔ چلیے یہاں تک بھی غنیمت تھا بات آئی گئی ہو جاتی لیکن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ مجھے لاہور جانا پڑ گیا۔ حسب معمول ہوٹل میں ٹھہرنے کا ارادہ تھا کہ نامعلوم کدھر سے میرا وہی مسیحی

ہم سفر نازل ہو گیا اور یوں ملا کہ جیسے میرا خونی رشتہ دار ہو۔ میں اخلاقی طور پر دو چار باتیں کرنے کے بعد کسی قسم کی پابندی کا قائل نہیں ہوں لیکن وہ شخص میرے سر ہو گیا کہ میں اسی کے ساتھ چل کر ٹھہروں۔ گھر وں میں ٹھہرنے کا جہاں تک سوال ہے میں عزیزوں تک کے گھر میں ٹھہرنے سے اجتناب کرتا ہوں چہ جائیکہ ایک بالکل غیر متعلق شخص کے گھر جا کر خواہ مخواہ دلّو کا دسہرہ بن کر رہوں نہ اپنی کوئی نجی زندگی رہتی ہے نہ دوسرے کی لیکن وہ اجنبی شخص میرے گلے پڑ گیا اور میں بھی زچ ہو کر یوں اس کے ہمراہ چلنے پر آمادہ ہو گیا جیسے جان بوجھ کر پھانسی کے تختے پر لٹکنے جا رہا ہوں۔

ائرپورٹ کے لاؤنج سے باہر نکلا، رات کی تاریکی میں پورٹیکو کی مدھم روشنی میں کھڑی ہوئی گاڑی پر جا بیٹھا یہ بھی نہ دیکھا کہ گاڑی کا رنگ کیسا ہے، گاڑی کونسی ہے پھر جب دروازہ بند کر کے اجنبی ہم سفر نے اسٹیرنگ سنبھالا تو میں نے پہلی مرتبہ اسے کسی قدر دلچسپی سے دیکھا۔ وہ ایک سیاہ رنگ کا معمولی خدوخال کا پستہ قد آدمی تھا۔ کوئی بتیس تینتیس کے پیٹے میں ہوگا۔ سوٹ بھی غیر معمولی نہیں تھا اور جس بھونڈے طریقے سے وہ بار بار کرسمس کارڈ کے بھیجنے کا مسلسل شکریہ ادا کر رہا تھا میں اس سے بیزار ہو گیا تھا اور اس قدر تھک چکا تھا کہ جی ہی جی سوچ رہا تھا کہ اس مردود نے اگر میرا پھر شکریہ ادا کیا تو یا تو میں چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں گا یا اسے گاڑی سے دھکیل دوں گا لیکن جس طرح تسبیح پر اللہ کے کسی ایک ہی اسم کی تکرار کی جاتی ہے وہ برابر شکریے کی تسبیح پڑھ رہا تھا اور میں نہ تو خود گاڑی سے کودا نہ اُسے دھکیلا بلکہ جاڑے کی یخ بستہ ہوا کی پروا کئے بغیر پہلو کا شیشہ گرا دیا اور چہرہ باہر نکال لیا۔ اس نے کچھ نہ کہا لیکن ہوا کے ایک ہی جھونکے سے وہ کپکپا گیا اور جب اُس نے تقریباً کانپتی ہوئی آواز میں کچھ کہا تو میں نے کچھ بھی نہ سنا۔ بس اس کی آواز کی کپکپاہٹ نے مجھے خواہ مخواہ شیشہ چڑھانے پر مجبور کر دیا۔ اُس نے دھیرے سے اپنی بات دہرائی تو مجھے پتہ چلا کہ میرے پیشے کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بڑا گول مول سا جواب دے کر

اسے خاموش کر دیا۔

شہر کی بہت سی سڑکیں، آبادیاں، ویرانے، ٹریفک سب سے بے نیاز میں خود میں مگن تھا اور اس دلچسپ تجربے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ گاڑی رک گئی، اجنبی اترا، اور مجھے ایک لمحے توقف کرنے کے لئے کہہ کر ایک مکان میں گھس گیا۔ نیم تاریک فضا تھی۔ آس پاس مکانوں سے دھندلی دھندلی روشنیوں کی جھریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ کہر آلود رات تھی۔ اتنے میں وہ اجنبی واپس آگیا، مجھے گاڑی سے برآمد کیا اور سامان خود ہی اٹھا کر اندر لے گیا۔ باڑھ کی بجوں سے مکان کی چار دیواری قائم کی گئی تھی۔ چھوٹے سے لان سے گزر کر ہم برآمدے میں آپہنچے اور برآمدے سے متصل ایک مستطیل کمرے میں جس میں ڈبل بیڈ لگا تھا اور قرینے سے ہر ہر شے لگی ہوئی تھی۔ چند تصویریں، چند میزیں، چند کرسیاں، پردے خوب اچھی طرح پڑے، لیمپ روشن تھا۔ آگ نگاری میں جل رہی تھی۔ اندر کی طرف جو دروازہ کھلتا تھا وہ غسل خانے پر مشتمل تھا اور اس سے ملحقہ مکان کے دوسرے حصے تھے۔ میں نے توجاتے اوورکوٹ ایک طرف پھینکا اور سیدھا آگ کے پاس جا بیٹھا۔ میرا میزبان اندر چلا گیا۔ اندر کچھ باتوں کی آوازیں آتی رہیں جیسے اچانک مہمان کے نازل ہونے سے بعض متوسط گھرانوں میں اندر ہی اندر ہلچل سی مچ جاتی ہے اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگتی ہیں۔ کچھ اس قسم کی بوڑھی، جوان، زنانی اور مردانی آوازیں آتی رہیں۔ کچھ پنجابی زبان میں کچھ ملی جلی آدھی اردو اور آدھی انگریزی میں! ایک ذرا میں سستایا تھا کہ میزبان میری گردن پر پھر آکر سوار ہو گیا۔ "کھانا کھا لیجیے۔"

اور میں غسل خانے میں آیا۔ بیسن میں ہاتھ دھوئے، ملحقہ کمرے میں قدم رکھا تو دیکھا ایک معمر عورت کرسی پر بیٹھی سوئٹر بن رہی ہے۔ سیاہ فام الٹا توا، بھدے اور بعید کریہہ خد و خال۔ شال اس کے پیروں پر پڑی ہے۔ برابر ہی لیمپ جل رہا ہے اور اس سے ذرا فاصلے پر ایک بوڑھا مرد ایسا ہی کالا اور

بھدا کوئی انگریزی ناول لئے بیٹھا ہے اور بخاری میں آگ دہک رہی ہے۔ میزبان نے میری تعریف میں چند تعارفی فقرے کہنے کے بعد انھیں اپنا والدین بتایا اور مجھے دوسرے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا میں نے پردہ اٹھا تو یہ ایک اور خواب گاہ تھی لیکن یہاں کوئی نہ تھا کمرہ خالی تھا۔ اس سے متصل کمرے میں ہم پہنچے یہ ڈائننگ روم تھا۔ فارمیکا کی خوبصورت سی میز، چند کرسیاں، شوکیس میں کراکری اور کٹلری، پہلو میں چھوٹا سا کسی قدر پرانا فریجڈیر، چند کھانوں کی دلکش تصویریں اور سب سے اوپر مسیحیت کی تھوڑی سی تبلیغ میں ایک آدھ بائیبل کا فقرہ جو حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق تھا اور ایک کونے میں کھڑی ہوئی ایک بیس بائیس برس کی لڑکی جس کا رنگ کالا، ناک نقشہ ویسا ہی بھدا اور جذب و کشش سے عاری جو اس سارے خاندان کا طرۂ امتیاز تھا لیکن سراپا اخلاق ــــــ بالکل اجنبی میزبان کی طرح لیکن میں نے چند جوابی کلمات کے سوا اور کوئی بات بھی نہ کی۔ کھانا بس غنیمت تھا کھا لیا۔ ڈرائنگ روم میں جا کر چند لمحے گزارے پائپ میں تمباکو بھر کر پیا اور اپنے کمرے میں آکر لیٹ رہا۔ حسب معمول تھوڑی دیر کروٹیں بدلتا رہا پھر سو گیا ــــــ صبح اٹھا تو ہر شے جنوری کی دھوپ کی دھیمی آنچ سے چمک رہی تھی اور کہرا چھٹ چکا تھا۔ گھڑی نو بجا رہی تھی اُف اللہ ــــــ میں کس قدر سویا غسل خانے میں گیا تو پانی گرم تھا غسل کیا طبیعت کی کسلمندی دور ہو گئی لباس بدلا تو دروازے دستک ہوئی، دروازہ کھلا اور نوجوان نے جس عورت کو امی کہہ کر تعارف کرایا تھا داخل ہوئی انگریزی میں بولی۔

"صبح بخیر نعیم ــــــ"

"صبح بخیر ــــــ مزاج شریف ــــــ" میں نے اخلاقاً ادھیڑ عمر کی سیاہ فام سے کہا۔

"کہیے آپ نے خوب آرام کیا ــــــ نیند خوب اچھی آئی ــــــ ناشتہ یہاں لاؤں یا ڈائننگ روم میں کیجیے گا؟" وہ سراپا اخلاق بنی ہوئی تھی اس کے ملبوترے دانت جن میں بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں

سخت تکلیف دہ تھے اور میں اب یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا ـــــ کیونکہ یہ سارا ماحول بے حد مخلصانہ ہوتے ہوئے بھی میرے احساس جمال کو مسلسل تکلیف پہنچا رہا تھا۔

فرانسس نے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔ صبح صبح ڈیوٹی پر چلا گیا، مجھ سے کہہ گیا ہے کہ آپ کو تکلیف نہ ہونے دوں ـــــ اسے ہر طرح اپنا ہی گھر سمجھئے ـــــ ہم لوگ بہت غریب ہیں۔ ہمیں اس کا افسوس ہے کہ آپ کے شایانِ شان ـــــ ہم سب مزدور ہیں، دیکھئے نا فرانسس زیادہ نہیں پڑھ سکا۔ وہ ایک امریکن کا ڈرائیور ہے ـــــ بڑی لڑکی ایڈنا اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ہیڈ مسٹریس ہے، میرے شوہر کو اس ضعیفی میں کچھ نہ کچھ کام کرنا پڑتا ہے ـــــ ایک لڑکی فلموں میں کام کرتی ہے، تب کہیں جا کر دن گزرتے ہیں ـــــ فرانسس اپنے آقا کے کسی کام سے لندن گیا تھا نا واپسی میں آپ سے ملاقات ہو گئی ـــــ یہ لوگ ـــــ (امریکن) بڑے مہربان ہوتے ہیں ـــــ تھوڑے سے کام کا اچھا بھلا معاوضہ دیتے ہیں ورنہ سوچئے ہماری گزر بسر کیوں کر ہوتی ـــــ تو بھلا ـــــ معاف کیجئے گا آپ ناشتہ یہاں کیجئے گا یا ـــــ"

ناشتہ کر کے میں نے پائپ بھرا۔ اور ایک آرام کرسی پر برآمدے میں لیٹ رہا۔ برآمدہ خوشنما پودوں کے گملوں سے بھرا ہوا تھا۔ گل داؤدی ختم ہو رہا تھا۔ کاسمس ڈیلیا اور نوسٹریشن کی بہار تھی سامنے کے لان میں ان گنت پودے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف سویٹ پینز کی بہار تھی۔ دوسری طرف گل اشرفی سونا لٹا رہا تھا۔ سرو سہی بھی استادہ تھے۔ اور دو ایک بادام کے درخت بھی۔ برآمدے میں دھوپ موجود تھی۔ میں نے سوچا ایک اُچٹتی سی نگاہ اخبار پر ڈال لوں پھر اپنے کام کے لئے چل دوں اور اس مہمانداری کے قلاوے کو کسی طرح اتار پھینکوں۔ لان سے ملحقہ مکان کا دروازہ تھا اور اس سے ملحق سڑک۔ یہ کوئی عام سڑک نہیں تھی لہذا یہاں شاذ و نادر ایک آدھ کار ٹیکسی یا رکشا آجاتا ورنہ سناٹا رہتا۔ ایسے ہی بہت سے مکانات تھے جو آس پاس

بنے ہوئے تھے۔ دراصل یہ ایک وسیع احاطہ تھا جہاں درختوں اور سبزے کی کثرت تھی۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا اور چھتنار درختوں سے سارا احاطہ پٹا پڑا تھا۔ سپیدار کے تنا در لمبے لمبے آسمان سے باتیں کرتے کورے چٹے درخت، شیشم کے چھتنار درخت۔ گل مہر کے اور املتاس کے درخت۔ اور ان درختوں میں جابجا اکّے دکّے سیدھے سادے گھر بنے ہوئے ہیں۔ ان گھروں کے درمیان سادہ لیکن پر نقار جدید نوعیت کا ایک چرچ ہے جس کے بلوریں شیشے خوب چمک رہے تھے دھوپ میں اور آسمان خوب خوب صاف اجلا اجلا چمک رہا تھا۔۔۔ بس اگر کوئی پرندہ بھی اڑتا ہوا گزر جاتا تو بھلا معلوم ہوتا معاً اس منظر سے محظوظ ہو کر میں نے ہوٹل جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔۔۔ اور میں ان کریہہ المنظر عیسائیوں سے جو گھبرا رہا تھا وہ گھبراہٹ بھی کہیں دب دیا گئی۔۔۔ یہ ماحول بڑا پرسکون تھا اور میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہونے لگی کہ کاش ایسا ہی کوئی ٹھکانہ مجھے مستقل طور پر مل جاتا تو میں ساری زندگی مزے سے گزار دیتا۔ یہ پرسکون ماحول مجھے کسی ملک کے کسی شہر میں میسر نہیں ہوا۔

"آپ کراچی میں رہتے ہیں؟"

میری کرسی کے برابر بیٹھی ہوئی بوڑھی عورت نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں مختصر جواب دیا۔ لیکن خوش اخلاقی سے اس نے کہا "کراچی والے تو لاہور کے سبزے پر لوٹ ہو جاتے ہیں۔"

میں نے بے خیالی میں کہا: "میں تو مشرقی پاکستان کا سبزہ بھی دیکھ چکا ہوں اور یورپ کا سبزہ بھی دیکھا ہے ۔۔۔ اور اس سے کہیں زیادہ سبزہ دیکھا ہے ۔۔۔ لیکن جو بات اس سبزے میں ہے وہ کہاں ہے؟"

یہی بات سب لوگ کہتے ہیں۔"

"سب لوگ سچ کہتے ہیں۔"

سچائی کتنی بڑی حقیقت ہے اور اس حقیقت کو لاکھ لفظوں میں قید کیجیے اس کی قدر کہیں نہیں بدلتی۔ مجھے نہیں معلوم شاعری کیا ہے اور مصوری کس بلا کا نام ہے، سنگ تراشی کسے کہتے ہیں اور سرگیان کیا ہے لیکن اگر اسی سچائی کا اظہار ان ذرائع سے ہوتا ہے تو یہ حقیقت ہے۔ سچائی بھی خوبصورت ہے اور خوبصورتی یہاں بکھری پڑی تھی۔ قدرت نے بڑے تناسب سے اسے بکھرا دیا تھا۔

عورت کرسی پر بیٹھی نٹنگ کر رہی تھی۔ دھوپ قدرے کراری ہوتی جا رہی تھی اور آسمان کی نیلاہٹ زیادہ واضح ہوتی جا رہی تھی۔ میں آنکھیں بند کر کے اس منظر میں اپنے آپ کو جذب کر رہا تھا۔

سرِ شام اس گھر کے تمام افراد اپنے اپنے کاموں سے لوٹے تو میں چائے پی کر فارغ ہو چکا تھا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا مزے سے پائپ پی رہا تھا۔ اور ڈرائینگ روم کے قالین قیمتی صوفوں اور اسپینچ کے قیمتی کشنوں، نہایت عمدہ اور قیمتی پینٹنگز پر غور کر رہا تھا کہ کیا ایک امریکن ڈرائیور ہمارے ملک میں اتنے ٹھاٹ باٹ سے رہ سکتا ہے لیکن پھر میں نے سوچا کہ اس گھر میں کئی آدمیوں کی کمائی کی برکت ہے۔ تھوڑا تھوڑا بہت ہو جاتا ہے۔ قطرہ قطرہ دریا می شود اس گھر کے تقریباً تمام افراد کماتے ہیں، سلیقہ ہے لہٰذا مزے سے رہتے ہیں۔ میں بھلا کون ہوں یہ سب کچھ سوچنے والا۔ اللہ اللہ کر کے فرانسس آیا وہ خوب ہشاش بشاش تھا اور بڑا مستعد (SMART) معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔

"آپ نے چائے پی لی ——؟"

"ہاں۔"

"آئیے پھر آپ کو ذرا گھما لائیں ——"

میں نے کہا "چلیں میں تیار ہوں۔"

میں نے اسے بتایا کہ میں اس شہر اور اس احاطہ کے ماحول سے کس قدر متاثر ہوا ہوں اور یہ کہ میں نے مشرقِ بعید اور مشرقِ وسطیٰ کے تمام ممالک دیکھے یہ بات کہیں نہیں ہے یورپ کا بھی یہ حال نہیں ہے وغیرہ وغیرہ ـــــ اور میں نے یہ بھی کہا کہ میں تمہارے گھر میں بہت خوش ہوں۔ میں نے تقریباً عمرِ عزیز کا بڑا حصہ ہوٹلوں ہی میں گزارا ہے لیکن یہ مزا کہیں نہ پایا اور اس اور اس سارے ماحول نے مجھے کچھ ایسا مسحور کر لیا ہے کہ میں جن مقاصد سے یہاں آیا تھا وہ بھول چکا ہوں۔ ان سب باتوں سے وہ خوش ہوا۔ ہم پا پیادہ نہر کنارے چل رہے تھے۔ مغرب میں سورج چھپا جا رہا تھا سناٹا ہوتا جا رہا تھا۔ اِکا دُکا لوگ دکھائی دے جاتے تھے سوادِ مغرب میں غروبِ آفتاب کی سرخی سے جو سماں پیدا ہوا تھا بڑا سہانا تھا۔ دھیرے دھیرے سیاہی پاؤں پھیلا رہی تھی اور ہلکی ہلکی دھند کی چادر ہر شے پر پھیلتی جا رہی تھی۔ اب فرانسس کی باری تھی وہ بولا:

”مسٹر نعیم ـــــ آپ نے میرے بارے میں کچھ غور کیا؟“

میں نے کہا: ”کیا؟“

بولا: ”یہی کہ کیا ایک معمولی سا ڈرائیور اتنی اچھی حیثیت سے رہ سکتا ہے اور یہ کہ کیا وہ لندن کا سفر کر سکتا ہے؟“

میں نے مسکرا کر اور ایک آنکھ دبا کر کہا: ”اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے ـــــ یعنی الٰہ دین کا چراغ کسی کو بھی مل سکتا ہے ـــــ میں نے امریکہ بھی دیکھا ہے اور امریکہ میں امریکن کو بھی دیکھا ہے لیکن اس کے ٹھاٹ باٹ کچھ اس کے ملک کے باہر ہی نظر آتے ہیں اور تم ہو ایک معزز امریکی کے معزز ڈرائیور ـــــ“

میں نے پائپ جلایا اور پینے لگا۔

آپ کو یاد ہو گا کہ اوپر میں نے ایک جگہ یہ اعتراف کر لیا ہے کہ میں اپنے پیشے کے سلسلے میں ساری دنیا میں مارا مارا پھرتا ہوں لیکن پیشے کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ یہی نہیں بلکہ میں کسی شخص کے کسی بھی پیشے پر کسی نوعیت کا اعتراض نہیں کر سکتا لہٰذا میں نے صاف صاف فرانسس سے کہہ دیا کہ میاں اللہ کسی نہ کسی حیلے سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دیتا ہے۔ فرانسس جو میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا ایک چرچ کے سامنے رک گیا۔ آنکھیں جھکا کر شانوں پر صلیب کا نشان بنایا پھر آگے بڑھ گیا۔ مجھ سے بولا "جناب یوں تو میں بھی بہت کچھ جانتا ہوں کہ ملک آزاد ہونے سے پہلے کون کیا تھا، اور اب کیا ہے اور کیسے ہوا ہے لیکن میرا معاملہ بالکل الگ ہے —— میں آپ کو یہ بات ضرور بتاؤں گا۔"

نہر پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا خوبصورت پل بنا ہوا تھا۔ نہر کے دونوں طرف چار چار فٹ چوڑی فٹ پاتھ سیمنٹ کے پختہ فرش سے تیار کی گئی تھی۔ اس سے ملحقہ سڑکیں بنی تھیں اور دور دیہ گھنے اور چھتنار درخت لگے ہوئے تھے۔ ہم دونوں نہر کے پل پر جا کھڑے ہوئے اور نہر کے پانی کو دیکھتے ہوئے جو بجد خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ میں نے پائپ کا ایک کش لے کر کہا میں ضرور سنوں گا فرانسس —— تم جو کچھ کہو گے میں ضرور سنوں گا۔"

اس نے پل کے کٹہرے کو ہاتھوں سے پکڑ کر میری طرف تکتے ہوئے کہا: "میں زیادہ نہیں پڑھ سکا نعیم —— ایک تو پڑھنے میں میرا جی نہیں لگا دوسرے مجھے پڑھنے کے زمانے میں عشق کرنے سے فرصت نہ ملی۔"

"اچھا، تم نے عشق بھی کیا ہے۔"

"ایک دو نہیں —— آدھے درجن عشق۔"

میں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا: "بڑے دلچسپ آدمی ہو فرانسس ——

مجھ کو دیکھو کہ عمر میں تم سے بڑا ہی ہوں گا لیکن آج تک عشق تک کرنے کی فرصت نہ ملی وہ جو سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے کہ ؎

چناں قحط سالی شد اندر دمشق   کہ یاراں فراموش کردند عشق

وہ تو آج تک ہم پر صادق آرہی ہے ——— خیر تم اپنی کہو۔"

اُس نے کہا: "یار بات یہ ہے کہ میری ممی نے گورنس کی حیثیت سے کئی انگریز اور امریکن گھرانوں میں نوکریاں کی ہیں اور وہی میرے شباب کا زمانہ تھا۔ ایک سویڈیش عورت نے جو کسی حالت میں بھی پینتیس سے کم نہ تھی اور جس کا شوہر پچاس سے کم نہ ہوگا سب سے پہلے مجھے اپنے غسل خانے میں گھسیٹ لیا تھا اور میرے تمام عشق کے جذبات اسی مکتب میں بیدار ہوئے۔ وہ جب تک یہاں رہی مجھے کسی بات کی کمی نہ ہوئی۔ جاتے وقت اس کا قیمتی فرنیچر میں نے کوڑیوں کے مول خرید لیا۔ دوسرا عشق میں نے خود اپنے ایک امریکن آقا کی بیوہ سیکرٹری سے کیا۔ اس سے کوئی مالی فائدہ نہ ہوا۔ لیکن اس کے جسم نے مجھے بہت سے اسرار سے واقف کرایا اور میں بہت مشاق و بیباک ہوگیا۔ اس کا ڈرائیور میرا دوست بن گیا۔ اُس نے مجھے گاڑی چلانا سکھا دی اور گاہے بگاہے میرے توسط سے بیوہ سیکرٹری کو وہ بھی گاڑی میں بٹھلا کر راوی کی سیر کرانے لے جاتا۔ تیسرا عشق میں نے ہالینڈ کی ایک ایسی عورت سے کیا جو چالیس سال کی عمر میں بھی کنواری تھی۔ مجھ سے قد و قامت میں دوگنی تھی۔ اس سے عشق کرنے میں وہی مزہ آیا جو سویڈن کی شادی شدہ عورت سے آیا تھا۔ یہ دونوں عورتیں مجھے اس طرح سمجھتی تھیں کہ جیسے ہم تم کشن اٹھا کر کبھی پیٹھ کے پیچھے رکھ لیتے ہیں کبھی گھٹنوں میں دبا لیتے ہیں، کبھی کہنیاں ٹکا لیتے ہیں، بلکہ یوں کہو کہ ہالینڈ والی عورت تو مجھے تو اپنے کتّے سے بھی کم پیار کرتی تھی۔ چوتھا اور پانچواں عشق اسی نوعیت کا ——— یار

یورپ کی عورت ہوتی ہی جذباتی ہے اور مردوں میں تنوع تلاش کرتی ہے ــــــ خیر یہ سب کی سب اپنے اپنے راستے آتی جاتی رہیں پھٹا عشق مجھے راس نہ آیا ــــ اور اسی نے میری دنیا بدل دی۔"

"اچھا"

میں نے کسی قدر حیرت اور رشک آمیز حسد سے فرانسس کو دیکھا جو بڑھتی ہوئی سردی کے سبب کوٹ کے کالر کھول رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ جھوٹا ہے۔ عورت کتنی ہی گر جائے ایسی بد ذوق کبھی نہیں ہوگی کہ فرانسس جیسے سیاہ فام سے بے تکان عشق کرے۔ یہ ڈینگ مارتا ہے اور اپنے احساس کمتری کو دور کرنے کے لئے زبانی جمع خرچ پہ بے چارہ اکتفا کر رہا ہے۔ ایسے مردوں کی دنیا میں کمی نہیں ہے جو خواہ مخواہ واقعات گھڑ کر اپنی زبان لال کر لیتے ہیں۔ پھر مجھے ترس آیا کہ بے چارہ حسرتِ اظہار کے لئے مر جاتا۔ اگر میں اسے میسر نہ آتا۔ سن لو، سن لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔ پل سے ہم لوگ اتر آئے اور فٹ پاتھ پر چلنے لگے وہ بولا: "وہ ایک یوریپین عورت تھی ــــ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کس ملک کی تھی ــــ بڑی خوبصورت اور گٹھیلے جسم کی سرخ و سفید چھوٹی سی سرخ سرخ ناک بھورے بھورے بال خوب بھری بھری پنڈلیاں اور بلّی کی سی نیلی نیلی آنکھیں ــــ لیکن یہ عورت تو پٹھے پر ہاتھ ہی نہ دھرنے دیتی تھی۔ روز اوّل ہی سے اس کے انداز کچھ جدا گانہ تھے اور عام عورتوں سے مختلف بھی۔ وہ ایک بڑے ہوٹل میں رقاصہ کی حیثیت سے آئی تھی۔ چال بھی چلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ رقص کر رہی ہے پاؤں اس پھرتی سے اٹھتے اور جسم اس چستی سے گھومتا کہ معلوم ہوتا ترنم میں ساوَنیں پڑ رہی ہیں۔ پانی میں موجیں اٹھ رہی ہیں پھیل رہی ہیں ــــ اس نے شروع ہی سے ایک فاصلہ اپنے اور میرے درمیان قائم رکھا۔ مجھے وہ شوفر کی وردی کے بغیر دیکھنے کی ہرگز روادار نہ

نہ ہوتی بلاوجہ مجھ سے کوئی بات نہ کرتی اور جو بات کرتی وہ نپی تلی اور واجبی سی۔ یہ نوکری مجھے میرے استاد ڈرائیور نے دلوائی تھی کیونکہ وہ ریزرو فوج کا ڈرائیور تھا اور سرحدی جھڑپوں میں تیزی آجانے کے سبب اسے بلا لیا گیا تھا۔"

"اچھا ——" میں نے چلتے چلتے جیبوں میں ہاتھ ٹھونس لئے، سردی بڑھ رہی تھی اور اب ہر شئے تقریباً گہرا آلود اندھیرے میں غرق ہو چکی تھی مکانوں میں روشنیاں ہونے لگی تھیں

"ایک روز ——" اس نے کہنا شروع کیا " اس نے مجھ سے کہا کہ رات دو بجے مجھے فلاں فلاں ہوٹل سے آکر لے جانا —— میں نے مزے سے سیکنڈ شو فلم دیکھی اور ہوٹل جا پہنچا۔ یہاں پر ہر شخص مجھے اس کے شوفر کی حیثیت سے جانتا تھا رات کے ایک بجے کا وقت لیکن ہوٹل کے باہر کاروں کا ہجوم ایسا تھا کہ راستہ چلنا دشوار تھا پٹھان ریسپشنسٹ (RECEPTIONIST) نے میرے کان میں کہا: "آج اپنی میم صاحب کا ننگا ناچ دیکھ لے —— خدا کی قسم شعلہ ہے شعلہ"۔

میں جانتا تھا اس مقام پر جہاں یہ رقص منعقد ہوگا میرا پہنچنا محال ہے لیکن ریپشنسٹ کی مہربانی سے میں چھپتا چھپاتا اس ہال کے ایک کونے میں جا پہنچا جہاں رقص ہو رہا تھا۔ وہ ناچ رہی تھی لیکن اس کے جسم پر ہزارہا پٹیوں کے لباس تھے۔ روشنیوں کے زاویے بار بار بدلے جا رہے تھے —— اور ان بدلتے ہوئے زاویوں میں ایک ایک لباس رفتہ رفتہ جسم سے علیحدہ کر رہی تھی۔ دو آدمی مستعدی سے آکر ایک میز رکھ گئے پھر اسی میز پر ایک بہت بڑے برتن میں صابن کا جھاگ (فوم) لاکر رکھ دیا گیا۔ عورت نے ناچتے ناچتے تمام کپڑے اتار دیئے حتیٰ کہ اس کے جسم پر صرف ستر پوشی کا لباس رہ گیا۔ اس نے صابن کے جھاگ سے کھیلنا شروع کر دیا۔ رقص کرتی جاتی تھی اور صابن کے جھاگ جسم کے مختلف حصوں پر گھماتی جاتی اسی عالم میں اس نے

بڑی پھرتی سے ستر پوشی کا لباس بھی اتار دیا اور صابن کے جھاگ سے ستر پوشی کا کام لیا —— وہ لمحہ نقطۂ عروج تھا رقص کا اور تمام حاضرین زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے وہ جھک جھک کر سب کو سلام کرنے لگی —— میں چپکے سے کھسک آیا اور گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔"

میں نے کہا "یورپ میں اسٹرپٹیز عام ہیں لیکن یہاں حیرت ہوتی ہے"—— اس نے سردی میں تقریباً سمسیاتے ہوئے کہا: "یہاں —— یہاں تو انھیں بھیجا جاتا ہے —— انھیں بھیجے جانے کا ایک مقصد ہوتا ہے ——"

"اچھا؟"

میں نے حیرت سے پوچھا "وہ کیا مقصد ہوتا ہے؟"

فرانسس ہنسا اور اس کا ہنستا ہوا چہرہ اندھیرے میں مطلق نظر نہ آیا لیکن اس نے کہا: میری بات سنتے جاؤ تمھیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ مقصد کیا ہوتا ہے —— میں نے دروازہ کھول کر اسے بٹھایا۔ گاڑی حسب معمول گھر سے آیا وہ گڈ نائٹ کہہ کر جانے لگی تو میں نے ہاتھ پکڑ لیا میں نے کہا، آج میں نے تمھارا رقص دیکھ لیا —— تم بہت اچھا رقص کرتی ہو —— اس نے میرے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا اور ہزاروں گالیاں دیں۔ میں نے اپنی ہتک محسوس کی لیکن میں اس کے بیڈ روم میں داخل ہو گیا اور میں نے کہا: "میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو —— اور تم کو یہاں کیوں بھیجا گیا ہے"۔

اس نے مڑ کر مجھے دیکھا تو وہ کسی قدر خائف تھی اور اس نے فوراً مجھ سے سمجھوتہ کر لیا —— اور بیڈ روم کے تمام دروازے بند کر کے وہ رشوت مجھے دے دی جس کا میں طلبگار تھا۔

تو کیا تم جانتے تھے کہ وہ کون تھی؟ میں نے پوچھا۔

اس نے کہا: "نہیں بالکل نہیں محض اندھیرے میں تیر پھینکا تھا اتفاقیہ وہ نشانے پر پڑا۔"

میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بے دریغ ہنستے اور گھٹیا انداز میں دبایا "یار بڑے چالاک ہو۔"

اس نے کہا: نعیم بات صرف اتنی نہیں ہے ـــــ کچھ اس سے زیادہ ہے۔"

"اچھا ـــــ وہ کیا؟"

"بات یہ ہے کہ جب اس نے مجھ سے سمجھوتہ کر لیا دوسرے دن اتوار تھا، ہم لوگ چرچ گئے تو پادری دعا پڑھ رہا تھا۔"

ہم گورے اور کالے
مشرق اور مغرب کے رہنے والے
ایک ہی خدا کے حضور میں سر جھکاتے ہیں اور اس کے بیٹے یسوع مسیح کو انسانیت کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔
ہم جو گورے ہیں گورے نہیں ہیں
ہم جو کالے ہیں کالے نہیں ہیں
دونوں رنگ ایک ہیں ـــــ کیا تم سپید کاغذ کو جلاتے ہو تو وہ سیاہ نہیں ہو جاتا اور جب اس سیاہ راکھ کو کریدتے ہو تو وہ سپید نہیں نکلتی ـــــ پس ہمارا آغاز اور ہمارا انجام ایک ہے۔
ہم ایک ہیں ـــــ"

اُس نے میرا ہاتھ دبا کر کہا: "کیا ہم شادی نہیں کر سکتے؟"

میں نے شوخی سے کہا: "رات کو شادی تو ہم کر چکے ہیں۔"

میں سوچ رہا تھا کہ یہ سمجھوتہ اُس نے مجھ سے کیوں کیا اور وہ شادی کیوں کرنا چاہتی ہے۔"

"تم نے کیوں نہ کی شادی" میں نے پوچھ ہی لیا۔

"نعیم ـــــ وہ میری بیوی نہیں بن سکتی تھی اور نہ میری ماں اسے بہو بنا سکتی تھی ـــــ پھر یہ بھی تو سوچو کہ وہ یہاں کس مقصد سے بھیجی گئی تھی ـــــ تمہیں معلوم بھی ہے؟

"نہیں مجھے کیا معلوم ـــــ"

"وہ جوش سخن میں ایک جگہ ٹھہر گیا۔ بولا" اس نے مجھے ہزاروں روپے کے تحفے اور ضروریات زندگی کا بیحد قیمتی سامان خرید خرید کر دینا شروع کر دیا اور جب مجھے اپنی دانست میں خوب اعتماد میں لے لیا تو چند ملفوف خطوط دے کر اس نے مجھے لندن روانہ کر دیا جہاں مختلف ٹھکانوں پر اور مختلف لوگوں کو مجھے وہ خطوط پہنچانے تھے اور اس کے لئے بھی جی بھر کے میں رشوتیں وصول کر چکا تھا اور ہزار ہا تحائف میرے گھر میں پڑے تھے اور مجھے یہ کرید تھی کہ یہ کیا ہے، لفافوں میں ـــ کیا خطوط ڈاک کے ذریعے نہیں بھیجے جا سکتے کیا ٹیلیفون پر یہی باتیں نہیں کہی جا سکتیں لیکن یا تو اب کا مجھے ہوائی سفر کے دوران خیال آیا میں اس عورت کے پاس ہر قسم کے لوگوں کو آتے جاتے دن رات دیکھا کرتا تھا اور مجھے ہر قسم کے لوگوں کے پہچاننے میں تھوڑا بہت وقوف ہے میری چھٹی حس مجھ سے بار بار کہہ رہی تھی کہ یہ ضرور کوئی راز ہے جو میرے ذریعے سے بیرون ملک جا رہا ہے کیا پتہ ہے کہ اس میں میرے ملک کے خلاف کتنی باتیں ہیں مجھے معلوم تھا کہ لندن پہنچتے ہی مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور اس کے بعد میری اور میرے اس سفر کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ مجھے کچھ کرنا چاہیئے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ تہران آگیا یعنی میں اپنے ملک سے باہر آگیا مثلاً مجھے کچھ خیال آیا میں باہر آیا ٹیکسی لی اور پاکستان ایمبیسی پہنچ گیا اور ہنگامی تمام متعلقہ افراد سے رابطہ قائم کر کے کسی طرح ساری بات ان کو بتا دی ملفوف خطوط ان کے حوالے کئے جن کی بعجلت فوٹو کاپیاں بنوائی گئیں اور مجھے ضروری ہدایات کے

ساتھ لفافے بالکل اسی طرح اسی حالت میں واپس کر دیئے گئے اور بریک جرنی کے بعد جب میں منزل مقصود پر پہنچا تو متعلقہ لوگ میری طرف سے خاصے متوش تھے کیونکہ جس جہاز سے مجھے پہنچنا چاہیئے تھا میں اس سے نہیں پہنچا ——— اور جب میں پہنچا تو یہ اطلاع بھی پہنچی کہ ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے۔

مجھے معلوم ہے نعیم کہ میں بھی پاکستانی ہوں اور تم بھی ——— معلوم نہیں اس جنگ کے بارے میں تمہارا کیا ردعمل ہوا ہوگا لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے یوں لگا کہ جیسے اس جنگ کا ذمہ دار میں ہوں۔"

"تم؟" میں نے پوچھا۔

ہاں ——— اگر میں اس عورت کے چکر میں نہ پڑا ہوتا اور یہ راز ملک کے اندر ہی کھل جاتا تو شاید جنگ نہ ہوتی ———"

مجھے اس کی معصوم منطق پر ہنسی آگئی لیکن بعض بین الاقوامی سطحوں پر مذموم حرکتیں کرنے والے اداروں کے مکروہ کارنامے میرے سامنے بھی تھے میں خود زمانہ جنگ میں وطن میں نہیں تھا یورپ میں تھا اور میں نے اہل یورپ کے جذبات اور احساسات کو اس زمانے میں قریب سے دیکھا ہے ہمارا کس کس طرح مضحکہ اڑایا جاتا رہا ہے اس کا بھی مجھے احساس تھا اور پھر جب جنگ کا نقشہ بدلنے لگا اور بعض دوسرے ذرائع سے خبروں کی نوعیت بدلنے لگی تو اہل یورپ کے طرز فکر میں تبدیلی تو ہو گئی لیکن غیر متوقع یورپ میں عموماً ایشیا کے لئے جو تعصب پایا جاتا ہے وہ واضح طور پر دو طرح کا ہے کالے اور گورے کا اور مسیحی اور غیر مسیحی کا، سیاسی سطح پر اس کی ایک نوعیت اشتراکی چین سے تعصب کی بھی ہے غرضیکہ بطور ردعمل مسلمانوں کے مشترکہ بلاک یا عالم اسلام کے اتحاد کی ضرورت یورپ میں رہ کر جس قدر محسوس ہوتی ہے اتنی ایشیا میں رہ کر محسوس نہیں ہوتی یورپ کا سرمایہ دار طبقہ اس طرح

سوچتا ہے کہ اگر عالمِ اسلام متحد ہو کر اشتراکی بلاک سے مل گیا تو یورپ کی پسماندگی یقینی ہے اور سرمایہ داری کا خاتمہ لازمی۔ شاید بیچارہ فرانسس اس سطح پر نہیں سوچ سکتا تھا۔۔۔۔ اس نے کہا "میں باوجود کوشش کے زمانۂ جنگ میں وطن واپس نہ ہو سکا لیکن میرے وطن پر حملہ ہوا تھا، میں بے چین تھا۔ میں وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ میں اپنے ماں باپ بھائی بہن، پاس پڑوس سب کی خیریت کا خواہاں تھا۔۔۔۔ میں اڑ کر پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن جب پہنچا۔۔۔۔ تو جنگ تمام ہو چکی تھی۔۔۔۔ نعیم! ہم تم ساتھ ہی تو پہنچے ہیں وطن۔۔۔۔ ہاں تو وہ عورت یہاں سے غائب تھی جب یہاں آیا تو معلوم ہوا کہ وہ میرے جاتے ہی کہیں روانہ ہو گئی۔۔۔۔ میرا استاد ڈرائیور مجھے ملا تو کہنے لگا کہ "وہ سالی دشمن کی ایجنٹ تھی۔۔ ہمارے افسروں سے راز لینے کے لئے بھیجی گئی تھی۔۔۔ جس افسر سے اس نے راز حاصل کرنے چاہے وہ راز نہیں تھے، اسے تو گرفتار کر لیا جاتا لیکن وہ جنگ سے پہلے ہی کہیں نکل گئی۔۔۔۔"

اب ہم مکان پر واپس پہنچ چکے تھے اور میں اس کے قیمتی ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا پائپ پی رہا تھا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وطن سے انسان کا کیا رشتہ ہوتا ہے اور وہ کام جس کے لئے میں نے لاہور کا سفر کیا تھا وہ خود بخود پورا ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے قریب فرانسس کو بٹھایا اور کہا "تو یار یہ سب رشوت ہی رشوت ہے" وہ زور سے ہنسا اور اب مجھے اس کے چہرے کی سیاہی مگر وہ معلوم نہ ہوئی۔ میں نے آہستہ سے پرس کھولا اور ایک تصویر نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔۔۔ اور میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ فرانسس اچھل پڑا، اور وہ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ وہ ڈر گیا لیکن وہ سمجھ گیا کہ میں کون ہوں اور میرا اپنے وطن سے کیا رشتہ ہے۔۔۔ پھر بھی میں آپ کو بتا دوں جو کام میں نے انجام دیا وہ میرا فرض منصبی تھا اور جو کارنامہ فرانسس نے انجام دیا وہ ایک ایسا فرض تھا جو صرف وہی شخص انجام دے سکتا ہے جس کو وطن سے سچی محبت ہوتی ہے۔ فرانسس مجھے بلند اور بے حد بلند نظر آنے لگا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا، سامان لیا اور دوسری مہم پر روانہ ہو گیا۔

ٹوٹی چمنی

میں اپنے مکان کی کھڑکی سے یوں تو بہت سے نظارے کرتا رہتا ہوں، لیکن وہ جو
سامنے ایک لیمپ پوسٹ ہے میری توجہ کا اکثر مرکز بنا رہتا ہے۔ کبھی غور کرتا ہوں کہ سامنے
گلی کے نکڑ پر جو ایک عدد لیمپ پوسٹ ہے یہاں پر کبھی کبھی میونسپلٹی کی لالٹین لگی ہوئی تھی اور
سرِشام ایک شخص سیڑھی لے کر آتا۔ لالٹین کو جھاڑ پونچھ کر صاف کرتا، تیل بھرتا اور روشن کر کے
یہ جا وہ جا۔ ایسا بہت کم ہوتا کہ لالٹین درست اور صحیح حالت میں پائی گئی ہو۔ اکثر محلے کے
شریر بچے اینٹوں اور پتھروں سے شہید کر دیتے اور پوری گلی اندھیرے میں ڈوبی رہتی۔ کبھی
کبھار کوئی بھولا بھٹکا اناڑی مسافر آ جاتا تو ہزاروں صلواتیں سناتا ورنہ اپنی جگہ تمام لوگ بالکل
مطمئن تھے کہ گلی کی قسمت میں اندھیرا اور لالٹین کی قسمت میں ٹوٹنا لکھ دیا گیا ہے۔

لیکن دیکھتے دیکھتے گلی کے دن پھرنے لگے۔ کچے مکانات پختہ ہونے لگے اور لالٹین
کے بالکل برابر والے مکان میں تو جیسے ہن برسنے لگا۔ آس پاس کوٹھیاں کھڑی ہونے لگیں۔

بنگلے بننے لگے اور یہ اندیشہ ہونے لگا کہ آج نہیں تو کل برقی رو کے آتے ہی اس گلی کی قسمت بھی
بھی ضرور جاگ جائے گی۔ لیکن اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ گلی کے آگے تو جس قدر کوٹھیاں بنگلے اور مکانات
بنے تھے۔ ان کی قسمت واقعی جاگ گئی لیکن گلی بدستور اندھیری رہی، ناپختہ رہی، بلکہ اس کی گندگی
میں اضافہ بھی ہوا، کیونکہ مکانات میں سیوریج کا معقول بندوبست نہ ہونے کے سبب تمام
غلاظت کے ڈھیر گلی میں لگے رہتے کہ ناک بند کئے بغیر چلنا دشوار ہو جاتا۔ اور اندھیرے
میں اگر کبھی کیچڑ میں پاؤں جا پڑتا تو بس کچھ نہ پوچھئے کیسا اندھیر ہو جاتا۔

لالٹین کے بالکل برابر والے مکان میں ایک غریب عیسائی خاندان آباد تھا۔ یہی وہ جدی
اور پشتینی واحد مکان تھا جو غالباً اس پوری بستی میں سب سے پہلے بنایا گیا ہوگا۔ معلوم نہیں اس گھر
کے افراد کا پیشہ شروع میں کیا تھا، لیکن کچھ عرصے بعد کے حالات تو یہ تھے کہ چند نوجوان لڑکیاں
سرِ شام بن سنور کر اچھے کپڑے پہن کر نکل جاتیں، رات میں کب، کس وقت اور کیسے واپس ہوتیں
اسے جاگنے والا آسمان اور چمکنے والے ستارے جانتے ہوں تو جانتے ہوں، اور کسی کو پتہ نہیں تھا
البتہ یہی خاندان پھیلنے شروع ہوئے۔ آس پاس کے کچے مکانات میں اضافہ ہونے لگا لیکن نہ گلی کی
قسمت جاگی نہ لالٹین نے دوسرا جنم پایا۔ البتہ نکڑ پر جیسے پختہ سڑک نکلی مکانات، بنگلے اور کوٹھیاں
اس قدر تیزی سے بننے لگے جیسے برسات کے پہلے چھینٹے سے زمین میں قوت نمو بیدار ہو کر سبزہ
ہی سبزہ پھیل جاتا ہے۔ تاحدِ نگاہ اسی طرح یہ کالونی تیار ہو گئی ——— اور لالٹین کی اس لیمپ
پوسٹ کا تقرر عمل میں آ گیا اللہ اللہ خیر صلا۔ اس سے زیادہ اس گلی کے حصے میں کچھ نہ آیا۔ وہی
ناپختہ گلی، وہی غلاظت، وہی کیچڑ۔ اور وہی کچے مکانات اور وہی اُس کے مکین۔

لیمپ پوسٹ کی جگہ جب لالٹین لگی رہتی تھی تو اسے شریر بچے توڑ دیتے تھے۔ البتہ
ایک آدھ بار یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ عیسائی خاندان کے ضعیف العمر سربراہ نے پتھر اٹھایا اور

اسٹیشن پہ دھڑام سے ڈے مارا، ایک چھناکا ہوا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو خود ہی اس ضعیف سربراہ نے چیخ کر کہا:

"ارے کون لونڈا ہے — کس نے توڑ دی چمنی ؟"

اور اگر کسی نے نہ دیکھا تو اطمینان سے گھر میں جا بیٹھے۔

لیکن جب سے لیمپ پوسٹ آویزاں ہوا۔ اور سفید مرکری بلب سے سارے مکانات منور ہوگئے تو ہر طرف اتنی خوشیاں منائی گئیں کہ نہ پوچھئے۔ لیکن نہیں خوشی ہوئی تو چار جوان عیسائی لڑکیوں کے بوڑھے باپ کو کہ ہر وقت وہ اسے یوں تکتا رہتا جیسے وہ لیمپ پوسٹ نہ ہو کوئی اس کا دشمن ہو۔ لیکن بے چارہ پتھر اٹھا اٹھا کر رہ جاتا۔ ہمت نہ پڑتی کہ مبادا بلند و بالا کوٹھیوں کی کھڑکیوں سے کوئی دیکھ لے۔ جس مکان کی پشت پر یہ لیمپ پوسٹ واقع تھا وہ مکان کاہے کو تھا، قلعہ تھا قلعہ۔ لوہے کا ایک وسیع و عریض پھاٹک مکان کی پشت پر لگا رہتا تھا اور ایک ضعیف العمر بوڑھا اکثر اسی پھاٹک کے گرد منڈلایا کرتا۔

رات گئے کبھی کبھار بھاری اور وزنی ٹرکوں کی آواز سے آنکھ کھل جاتی تو بڑی کوفت ہوتی۔ یوں لگتا جیسے ٹرک بھر بھر کے اسباب ڈھویا جا رہا ہو ——— سویرے دیکھئے تو نہ ٹرک، نہ اسباب کچھ بھی نہیں ——— ایک رات میں نے اوپر کی منزل میں گزاری۔ رات کو جب ٹرکوں کی آوازیں سنیں تو کھڑکی کھول کر دیکھا کہ قلعہ نما مکان کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور ٹرک پر ٹرک پھاٹک کے اندر چلے جا رہے ہیں۔ معاملہ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

میری طرح اور لوگ بھی اس بات پر حیران تھے کہ یا اللہ یہ معاملہ کیا ہے کئی آدمیوں نے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے منصوبے بنائے لیکن کوئی منصوبہ کارگر نہ ہوا۔ تمام

ٹرک زوالِ شب کے بعد آنا شروع ہوتے ۔ روزانہ بلا ناغہ نہیں آتے کبھی دو چار روز کے وقفے سے آتے، کبھی ہفتہ ہفتہ بھر بعد آتے ۔ اپنی راہ آتے اور اپنی راہ چلے جاتے البتہ کوٹھی کا ضعیف العمر مالک لوگوں کی تشویش کو بھانپ چکا تھا ۔ پہلے تو اس نے باری باری اہلِ محلہ کی دعوتیں کر کر کے یہ تاثر دیا کہ وہ درآمد اور برآمد کا بیوپاری ہے لیکن یارانِ طریقت کو پھر بھی اطمینان نہ ہوا، تو اس نے جگہ جگہ پہرے بٹھائے کہ ٹرک ذرا فاصلے پر روک کر سامان لایا لے جایا جائے ــــــ مسئلہ اپنی جگہ باقی رہا ۔ مرکری بلب کا لیمپ پوسٹ ہر شے کو روشنی کے نور میں نہلا دیتا ۔

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، ایک روز طلبہ کا ایک پرجوش جلوس نکلا اور ادھر سے گذرا ۔ بڑے میاں کے سامنے ایک لڑکے نے پتھر اٹھا کر بلب توڑنا شروع کئے تو بولے

"ارے بھئی یہ نکڑ والے لیمپ پوسٹ کا بلب کیوں چھوڑے جا رہے ہو ــــ"

وہاں کہنے کی دیر تھی ۔ ایک چھناکا ہوا اور لیمپ پوسٹ کا مرکری بلب سڑک پر ڈھیر ہو گیا ۔

جلوس گذر گیا ۔

لوگ مکانوں سے نکل نکل کر اپنے اپنے مکانوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کا معائنہ کرنے لگے اور بڑے میاں لیمپ پوسٹ کے ٹوٹے ہوئے بلب کی کرچیاں اٹھا کر لوگوں کو دکھا دکھا کر ہنس ہنس کر کہنے لگے ۔

"دیکھ لی آپ نے لونڈوں کی شرارت ــــ؟"

اسی وقت عیسائی بزرگ بھی آ پہنچے بولے "صاحب اس گلی میں پہلے میونسپلٹی کی لالٹین جلتی تھی، اس کی چمنی ہمیشہ ٹوٹتی رہی ۔ لیجئے اب سرکار نے کیسی اچھی روشنی کا انتظام کیا

تھا۔ اسے بھی لونڈوں نے ستیاناس کر دیا۔"

پہلے بزرگ بولے "اور صاحب جیسے بلی کے منہ کو کبوتر کا خون لگ جاتا ہے تو پھر اسے کبوتر کا شکار کئے بغیر چین نہیں آتا۔ یہی حال ان لونڈوں کا ہے ـــــ اب نہیں رو سکتا یہ بلب۔"

دوسرے پھر بولے ـــــ "بالکل بالکل ـــ میں تو کہتا ہوں کہ یہ لیمپ پوسٹ ہی بیکار ہے۔ اسے یہاں سے اکھاڑ کر ہی پھینک دیا جائے تو اچھا ہے۔"

لوگ حیران و پریشان دونوں کا منہ تک رہے تھے کہ یہ ان دونوں کو ہوا کیا ہے دنیا تاریکی کے خلاف نبرد آزما ہے، روشنی چاہتی ہے ـــــ اور یہ بزرگ خود بھی اندھیرے میں ہیں، اور پوری بستی کو تاریکی میں ڈبو دینا چاہتے ہیں۔

بازی گر

میں ہوائی سفر تو کرتا ہی رہتا ہوں لیکن کبھی ہوائی بیمے کی نوبت نہیں آئی، یوں بھی موت وزیست اللہ کے ہاتھ ہے۔ بیمہ کرائیے یا نہ کرائیے کیا فرق پڑتا ہے، اس لئے نہیں کہ بیمہ کی صورت میں آپ کو کچھ رقم فوری طور پر دینا پڑتی ہے بلکہ خواہ مخواہ تمام سفر ناخوشگوار گزرتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر موت کا تصور بندھا رہتا ہے۔ اس وقت سے جب کہ آپ سفر کی تیاری میں پیٹیاں باندھ لیتے اور جہاز ایک غیر معمولی تیزی سے اُٹھتا ہے اور جب موسم کی خرابی کے باعث اس میں بمپنگ ہوتی ہے یا کسی مقام پر فضا میں کسی ہوائی خلا کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ زمین پر واپس آتے آتے انسان خواہ مخواہ ہولیں کھاتا رہتا ہے اور سفر کا مزہ نہیں آتا۔ لیکن اس بار جیسے ہی میں نے گاڑی کو پورٹیکو میں چھوڑ کر ہوائی اڈے پر لاؤنج میں قدم رکھا کہ لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہونے لگا کہ ڈھاکے کی پرواز کے لئے جہاز تیار ہے میں جھپا جھپ تمام مراحل طے کر کے جلدی سے جہاز تک پہنچنا چاہتا تھا کہ اسی وقت ایک

نوجوان خوبصورت لڑکی مسکراتی ہوئی میرے پاس آئی اور بڑی خوش اخلاقی سے بیمے کرا لینے کی درخواست کرنے لگی۔ ایسا بارہا ہوا ہے اور میں نے بیمہ والوں کو جھڑک دیا ہے لیکن اس قدر عجلت کے باوجود میں نے اس درخواست کو رد نہیں کیا بلکہ فوری مطلوبہ رقم اس کے حوالہ کرکے رسید جیب میں ٹھونسی اور یہ جا وہ جا، لڑکی کی مترنم آواز دیر تک میرے کانوں میں گونجتی رہی "شکریہ" حتیٰ کہ جہاز زمین سے اٹھا، فضا میں آیا اور نہ معلوم کتنی قسم کی آوازیں میں نے اور بھی سنیں لیکن ان تمام آوازوں پر جیسے وہ آواز چھائی ہوئی تھی —— "شکریہ" ——

ایسی من موہنی صورتیں بھی کم دیکھی ہیں جیسی اس بیمہ کمپنی کی ایجنٹ نے پائی تھی۔ یوں غور کیجئے تو کچھ بھی نہیں —— وہی حوا کی بیٹی۔ رنگ روپ کی اچھی اور نکھ سکھ کی درست، ماشاءاللہ خیر صلا۔ لیکن کوئی ایک بات اس میں ایسی ضرور تھی کہ ایک بار دیکھ کر پھر دیکھنے کو بے تحاشا ضرور جی چاہتا اور آج بیمہ کی رسید ہاتھ میں لئے ہوئے نہ مجھے موت کا تصور ستا رہا تھا اور نہ مجھے کسی طرح کی کوئی وحشت ہو رہی تھی۔ میں تو یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ میرے ساتھ ہے اس کی خوشبو میرے اندر جذب ہے اور وہ لمحہ جو انتہائی اضطراری اور عجلت کی کیفیت کا حامل تھا اور جو حقیقت میں بے حد مختصر تھا میرے لئے بے حد جاں بخش اور فرحت زا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ لمحہ جس میں وہ میرے پاس آئی —— درخواست کی، رقم لے کر رسید دی اور چلی گئی اپنے اندر بہت کچھ رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اب تک میرے ساتھ ساتھ تھی اس کی مسکراہٹ اس کی چال اور مورنی کی طرح آواز کی جھنکار جس میں کیا کیا کیفیتیں چھپی ہوئی تھیں کہ ان کا تجزیہ ممکن نہیں، میرے سفر پر وہ چھائی ہوئی تھی

ڈھاکے کا سفر بارہا کیا ہے۔ کاروبار کے سلسلے میں لاہور ڈھاکہ کراچی، پنڈی میرے لئے کوئی خاص معنی نہیں رکھتے، لیکن اس بار ڈھاکے میں چند دن گزارنے دشوار ہو گئے۔ لاہور کے ہوائی

اڈے کا لاؤنج مجھے برابر کھینچتا رہا اور کام پورا کرکے اپنی جان چھڑا کے میں بھاگا تو سیدھا لاہور پہنچ کر میں نے دم لیا۔ دھڑکتے ہوئے دل سے لاونج میں قدم رکھا، میری طرح نہ معلوم کتنے مسافر اور بھی آئے تھے۔ بیمہ کمپنی کے چھوٹے سے اسٹال نما دفتر پر نگاہ ڈالی، اِدھر اُدھر نگاہوں میں اسے تلاش کیا۔ لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ میرا سامان باہر نکل آیا۔ میں نے الوداعی نظروں سے تمام ہجوم میں اسے تلاش کیا، لیکن وہ نہ ملی اور میں بادل نخواستہ گھر واپس آگیا۔

حسن اتفاق سے مجھے پنڈی جانا پڑ گیا۔ میں یہ سفر ریل یا موٹر سے بھی کر سکتا تھا لیکن عمداً میں نے ہوائی سفر کو ترجیح دی۔ کچھ پہلے ہی سے ہوائی اڈے پر پہنچ گیا اور لاؤنج میں پڑے ہوئے ایک صوفے پر جا بیٹھا اور اسے نگاہوں نگاہوں میں تلاش کرنے لگا۔ معاً کوکا کولا کے اسٹال پر وہ مجھے نظر آئی اس کے ہمراہ ایک اور لڑکی تھی دونوں کوکا کولا پی رہی تھیں کسی نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت کوئی جہاز آیا ہوا تھا۔ مسافر مسلسل باہر آرہے تھے۔ آنے والے مسافروں سے بیمہ والوں کو بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اس لئے وہ نہایت اطمینان سے مسکرا مسکرا کر کوکا کولا پی رہی تھیں اور باتیں بنا رہی تھی، میرے جی میں آیا کہ جاؤں اور کچھ نہیں تو ایک کوکا کولا لے کر پاس کھڑے ہو کر پینے لگوں، مجھے یہ بات بڑی بھونڈی اور چھچھوری سی معلوم ہوئی۔ میں بدقسمتی سے جس ماحول میں رہا ہوں اس میں ہر بات کو وقار اور سلیقے سے کیا جاتا ہے۔ لہٰذا میں اس وقار اور سلیقے پر غور کرنے لگا۔ معاً اس نے مجھے دیکھا اور یوں دیکھا جیسے ہاں کہیں دیکھا ہے، شاید اس نے مجھے نہ پہچانا ہو ــــ بھلا ہزاروں مسافروں کی ریل پیل میں کوئی کب تک کس کس کو یاد رکھ سکتا ہے یا شاید اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہو۔ غرضیکہ اس کی سہیلی نے کسی بات پر اسے ہلکے سے ایک دھمکا رسید کیا اور وہ اس طرح کھلکھلا کر ہنسی کہ ہزار ہا نقرئی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں اس کے باوجود اس طرح بیباکی سے اس کا ہنسنا اچھا معلوم نہ ہوا، اس کی دوست پر بھی غصہ آیا جو خواہ مخواہ

سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ کوکا کولا ختم کر کے دونوں بیمہ کمپنی کے سٹال نما دفتر میں چلی گئیں، اور کیبن کے اندر غروب ہوگئیں۔

لاؤنج اب صاف ہوگیا اور آنے والوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ معاً اس لڑکی کی سہیلی باہر آئی بیمہ کے لئے لوگوں سے درخواستیں کرنے لگی، میں ٹہلتا ہوا بیمہ کمپنی کے سٹال پر چلا گیا اور اندر جھانک کر دیکھا تو وہ بڑی دل جمعی سے بیٹھی ہوئی کچھ لکھ رہی تھی۔ کاغذات اس کے سامنے بکھرے پڑے تھے۔ ابھی بہت وقت تھا اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ میرے اور اس کے درمیان شیشے کی ایک دیوار حائل تھی۔ اس نے اٹھ کر چھوٹا سا دروازہ کھولا اور بڑے اخلاق سے بولی۔

"اندر تشریف لے آیئے۔"

میں چلا گیا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا اور پوچھا کہ وہ میری کیا خدمت کر سکتی ہے ظاہر ہے کہ یہ سارا اخلاق اور تمام باتیں کاروباری نوعیت کی تھیں۔ میں نے بیمہ کرایا اور اس نے شکریہ ادا کیا، لیکن اس شکریہ میں جیسے یہ بھی اشارہ تھا کہ اب بس ملاقات ختم ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ یہ بیمہ کمپنی کا دفتر تھا، نہ کلب تھا نہ ڈرائنگ روم۔ لہذا میں نے بھی خوش اخلاقی سے شکریہ ادا کیا اور مسکراتا ہوا باہر آگیا۔ اعلان کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ وہ باہر آگئی۔ اس نے میرا بریف کیس سنبھال رکھا تھا۔

مسٹر غنی یہ آپ کا بریف کیس۔"

آپ یقین کیجئے، میں نے عمداً بریف کیس وہاں نہیں چھوڑا تھا، کیونکہ اس میں بے حد قیمتی کاغذات تھے۔ اس بریف کیس کو تو میں جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا، لیکن اس کی مسحور کن شخصیت میں کچھ ایسا جادو تھا کہ میں اٹھا اور یوں ہی چلا آیا۔ بریف کیس اس سے لے کر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا "اس بریف کے بغیر یہ سفر بالکل فضول ثابت ہوتا۔"

"شکر ہے کہ آپ کے جانے کے بعد میری نگاہ آپ کی کرسی پر پڑ گئی۔"

"میں ممنون ہوں، باقاعدہ شکریہ پنڈی سے واپسی پر ادا کروں گا۔"

میری یہ بات سن کر وہ مسکراتی ہوئی اپنے کیبن میں واپس چلی گئی اور جب میں دوسرے دن لوٹا تو وہ وہاں نہیں تھی، نہ لاؤنج میں نہ کیبن میں۔ سہ پہر کا وقت تھا میں باہر نکلا تو بیمہ کمپنی کی مائیکرو ویس میں میں نے اسے سوار ہوتے ہوئے دیکھا، بالکل اتفاقیہ میری گاڑی بھی اسی وین (VAN) کے پیچھے چلتی رہی۔ گلبرگ کے ایک عالیشان بنگلے میں وہ ویں داخل ہو گئی اور میری گاڑی آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد جب ویں واپس ہو کر میری گاڑی کے پیچھے پیچھے چلنے لگی تو میں نے دیکھا وہ اس میں نہیں تھی ـــــ یعنی وہ اس عالیشان مکان میں رہ گئی تھی۔

اس طرح گویا مجھے اس کا مکان تو معلوم ہو گیا تھا، جانے کے لئے ایک بہانہ بھی تھا لیکن دو قباحتیں تھیں، ایک تو یہ یقین کرنے کو دل کسی طرح بھی تیار نہیں تھا کہ اتنے عالیشان مکان میں رہنے والی بیمہ ایجنٹ ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ رسید پر اس کے دستخط واضح نہ ہونے کے سبب اس کا نام معلوم نہیں تھا لیکن پہلی وجہ بہت گمبھیر تھی۔ یہ طلسم سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مکان کی اگر وہ مالکہ ہے تو ظاہر تھا کہ وہ لکھ پتی ہو گی اسے بیمہ ایجنٹ بننے کا کیا شوق چرایا تھا اور اگر وہ کرایہ دار تھی تو وہ ہزاروں روپیہ ماہوار کہاں سے لاتی ہو گی جو سینکڑوں روپیہ ماہوار محض مکان کا کرایہ ادا کر سکے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ کسی سہیلی سے ملنے کے لئے گئی ہو اور وہ اس کا مکان نہ ہو یا بیمہ کے سلسلے میں کسی سے ملاقات کرنے گئی ہو۔ بہر حال کوئی بات واضح نہ ہو سکی۔

اور میں شش و پنج میں پڑا رہا کہ مجھے پھر کچھ عرصہ کے بعد ایک اور سفر درپیش ہوا۔ میں سیدھا اس کے کیبن میں اس کی میز کے سامنے جا بیٹھا اور بڑی بے تکلفی سے کراچی کے ٹکٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے بیمہ کمپنی کی مطلوبہ رقم اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ مجھے

دیکھ کر مسکرائی اور ایک ادا سے مجھے اس نے سلام کیا اور میں بولا۔

"محترمہ، میں آپ کا دوہرا شکر گزار ہوں"

"وہ کیسے"؟ اس نے پوچھا

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں بیمے کا قائل نہیں تھا لیکن ہونا پڑا"

"اچھا؟ — پھر اس نے کہا — مگر وہ کیسے"

"بس یہ نہ پوچھیے، ہوگیا ایک روز قائل"

"اچھا چلیئے دوسری بات" اس نے دلچسپی سے کہا۔

"دوسری بات، وہی بریف کیس — بات دراصل یہ ہے کہ مجھے آپ کا مکان تو معلوم ہے" اتنی بات سن کر اس نے مجھے غور سے دیکھا، میں گھبرا گیا۔ اور اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا — "چونکہ ایک بار میری گاڑی آپ کی بیمہ وین کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی" — بات بنتی نظر نہ آئی تو میں نے کہا — "میں وہیں گلبرگ میں رہتا ہوں، بس ذرا آپ سے آگے — دراصل میں آپ کے گھر پر جاکر آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا — لیکن ڈرا کہ مبادا آپ کو بن بلائے مہمان کا آنا —"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں، شکریہ کی کیا بات ہے غنی صاحب، وہ تو میرا فرض تھا — گھر آپ کا ہے جب جی چاہے آئیے اماں کو آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوگی — لیکن ابھی تو آپ کراچی جا رہے ہیں"

میں چار روز کے بعد واپس آجاؤں گا مس —، میں نے بڑی بے چینی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر بولا:

"معاف کیجیئے گا، آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں"

"نام کی کیا ضرورت ہے، ویسے مجھے فوزیہ کہتے ہیں۔" وہ بولی۔

"مس فوزیہ آپ کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے، میں ضرور آؤں گا۔"

یہ کہہ کر میں اُٹھ بیٹھا۔ اس نے بریف کیس اُٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دیا اور میں بے اختیار ہنسنے لگا اور اُسے بھی ہنسی آ گئی اور آج غالباً پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ اس کی نگاہیں بھی مجھ پر مرکوز ہیں۔ میں چلتا ہوا لاؤنج کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ ایک بار بھی گھوم کر پیچھے نہ دیکھا لیکن مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ نگاہیں مجھے برابر دیکھ رہی ہیں، میری نگراں ہیں، پیٹھ میں گڑی ہوئی ہیں۔ اور اگر میں نے مڑ کر ذرا بھی دیکھ لیا تو سیدھی دل میں جا کر پیوست ہو جائیں گی۔ لاؤنج سے رن وے کی طرف جاتے ہوئے میں نے ایک بار دیکھ ہی لیا۔ اُف میرے اللہ وہ سچ مچ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے رن وے کی طرف مڑنے سے پہلے بھرپور نگاہوں سے اسے دیکھا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر الوداع کہا۔ میں ذرا سا جھکا اور ہاتھ ہلاتا ہوا چل دیا۔ سفر اچھا گزرا۔ کراچی ہمیشہ میرے پاؤں جکڑ لیتا تھا وہاں کے عمدہ و نفیس ہوٹل وہاں کے کھانے، رقص اور شراب میرے لئے بڑے جذب و کشش کے حامل ہوتے تھے لیکن اس مرتبہ تو میں سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگا۔ یار دوستوں نے بہت کچھ لالچ دیئے۔ ایک بڑے اچھے ڈنر کی دعوت ملی وہ رد کر دی اور سیدھا لاہور آ پہنچا اور میری توقع کے عین مطابق فوزیہ میری منتظر تھی۔ اس نے آتے ہی مجھ سے کہا:

"آپ آ گئے ـــــ بڑا اچھا ہوا ـــــ پرسوں شام کو آپ میرے غریب خانے پر چائے نوش کیجئے ـــــ اماں اور بھائی احسان بھی آپ کے منتظر ہوں گے۔"

میں پھولوں نہ سمایا۔ یہ کیسا اچھا مژدہ تھا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا بالآخر اللہ اللہ کر کے وقت معینہ سے کچھ پہلے ہی تیار ہو کر ٹہلنے لگا۔ گاڑی تیار کھڑی تھی، میں لپکتا ہوا

پورٹیکو میں گیا شوفر کو گاڑی میں نہ بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود ہی گاڑی میں جا بیٹھا اور چند ہی سیکنڈ میں فوزیہ کے گھر آ پہنچا۔

جیسا میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ وہ ایک عالیشان مکان تھا۔ جن لوگوں نے لاہور دیکھا ہے اور گلبرگ کے مکانات بھی دیکھے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ گلبرگ میں مکانات کس تکلف اور اہتمام سے بنے ہوئے ہیں جس وقت کسی ایک مکان کو دیکھیں اور خوب داد دے چکیں تو یہ سوچیں گے کہ اب اس سے بہتر کوئی اور مکان کیا ہوگا۔ لیکن یہاں ایک سے ایک عمدہ مکان نکلتا چلا آئے گا اور آپ دیکھتے دیکھتے تھک جائیں گے اور یہ فیصلہ کریں گے کہ گلبرگ میں مکان اچھے ہی اچھے ہوتے ہیں، برے نہیں ہوتے سو یہ مکان بھی گلبرگ میں واقع تھا۔ باہر سے دیکھئے تو سبزہ زار پر سپید سپید شبنم کے قطرہ کی طرح دمکتا نظر آئے گا اندر آ جایئے تو قدم قدم پر حسن و خوبصورتی کے جلوے بکھرے نظر آئیں گے اور آپ کی توجہ کو جذب کریں گے پورٹیکو میں داخل ہوتے ہی شیشے کے دروازے سے ملازم برآمد ہوا، کار کا دروازہ کھولا مجھے خوش آمدید کہا دروازہ کھول کر مؤدب انداز سے اندر جانے کے لئے قدرے جھک کر ہاتھ سے راستہ بنایا۔ میں اندر داخل ہوا تو یہ ایک وسیع و عریض برآمدہ تھا، جہاں جا بجا سنگ مرمر کے مجسمے دھرے تھے قالین بچھے تھے چھتوں پر جھاڑ اور فانوس لٹک رہے تھے اور پورے ماحول میں عجب مرعوب کن سناٹا سا چھایا ہوا تھا جہاں خود بخود انسان تکلف پر مائل ہونے لگتا ہے قدم بھی ناپ ناپ کر اور تول تول کر اٹھاتا ہے اور پھونک پھونک کر چلتا ہے میں جہاں پر کھڑا ہوا سوچ رہا تھا اور عالم محویت میں تھا کہ اس کی بغل سے ایک بڑا ہی نفیس چوبی زینہ جس پر قالین بچھے تھے، اوپر چلا گیا تھا ـــــ فوزیہ میری طرف آتی ہوئی نظر آئی، اس نے صرف نیلگوں ساری باندھی تھی، نیلگوں بلاوز اور نیلے آویزے کانوں میں ہلکورے لے رہے تھے۔

ہلو مسٹر غنی ——— آیئے آیئے ——— بڑی مترنم آواز گونجی۔ کچھ میں بڑھا، کچھ وہ بڑھی اور ہم نے خلاف توقع بے تحاشا ہاتھ ملائے۔ اوپر کا ماحول اس سے بھی زیادہ پرتکلف تھا۔ ہم ڈرائینگ روم میں پہنچ گئے جس کے اہلو پہلو کشادہ لاؤنج تھے اور بہترین بلوریں دیواریں تھیں لکڑی کا نفیس فرش جس پر قالین بچھے ہوئے کہ چلیئے تو آواز مطلق نہ ہو اور ڈرائینگ روم اس قدر کشادہ اور وسیع کہ اسے چھوٹا موٹا ہال کہیئے۔ یہاں بھی جھاڑ فانوس اور بلوریں میزیں اور قیمتی آرائشی سامان موجود تھا۔ میری نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، اللہ اکبر یہ فوزیہ آخر کیا بلا ہے۔ میں سوچنے لگا صوفے دیکھئے تو دیکھتے ہی رہ جایئے۔ قدیم اور جدید دونوں وضعاؤں کے مختلف سیٹ، بیحد آرام دہ فوم کے کشنوں سے آراستہ ——— تو یہ ہے فوزیہ'

میں سوچنے لگا اور آج پہلی بار موازنہ کرنے لگا کہ ابھی تک مکان کو باہر سے دیکھ کر اسے لکھ پتی سمجھتا تھا۔ اب تو اس کے کروڑپتی ہونے میں کلام نہیں اور ایک میں ہوں کہ سال کے سال محض دو تین لاکھ کما لیتا ہوں تو گویا زمین پر پاؤں نہیں دھرتا ———

"آپ تشریف رکھئے، میں ذرا اماں کو بلا لوں، انھیں آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔

"ضرور ضرور ——— مجھے بھی ہے"

میں بیٹھ گیا اور ہر شے کو بغور دیکھنے لگا ——— میرے سامنے ہی سے فوزیہ گزر گئی۔ ساری میں ملبوس وہ ایسی سبک روی سے چلتی ہوئی دروازے تک گئی جیسے دریا کی سطح پر موج۔ فوزیہ میرے لیئے بڑی پر اسرار بن گئی تھی کہاں ایک بیمہ ایجنٹ اور کہاں یہ عالی شان محل اور یہ ساز و سامان۔ ڈرائنگ روم میں وسیع و عریض پینٹنگز لگی تھیں جو قطعی غیر ملکی مصوروں کے موقلم کا نتیجہ تھیں۔ ان میں سے کسی پینٹنگ کی قیمت دس پندرہ ہزار سے کم نہ ہوگی۔ اصلی ریشم اور مخمل کے پردے پڑے ہوئے تھے اور جگہ جگہ پر ایسا نفیس آرائشی سامان چنا ہوا تھا کہ دیکھتے رہیئے۔

میں اٹھ بیٹھا۔ شمالی پردوں کو اٹھایا تو ایک ڈائینگ ہال نظر آیا۔ جہاں بیک وقت چالیس پچاس آدمی بآسانی کھانا کھا سکتے ہیں۔ طرح طرح کے قیمتی شلوز اور کراکری اور کٹلری سے آراستہ اور تصاویر سے مزین ـــــ جنوبی پردہ اٹھایا تو کونے میں بار بنا ہوا تھا، جہاں عمدہ عمدہ شرابوں کے قرابے لگے ہوئے، اور نفیس بوتلوں شیشوں اور پیمانوں سے جھلکتے ہوئے سامنے چار لمبے لمبے سٹول دھرے ہوئے تھے۔ گویا صرف پردے شمالی اور جنوبی کھینچ دیجیے تو ڈرائنگ روم، بال روم اور بار روم میں تبدیل ہو سکتا تھا ـــــ تو یہ ہے فوزیہ ـــــ میں نے سوچا کہ اس مکان کا صرف اتنا قصور رہے کہ بدقسمتی سے اسے مشرق بعید کے ایک ایسے حصے میں بنایا گیا ہے جہاں فضاؤں میں ہواؤں میں مشرقیت ہے۔ مکان کی ایک ایک نس میں مغربیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپ یورپ کے کسی امیر کبیر گھرانے میں آ گئے ہوں ـــــ تو یہ فوزیہ ہے کیا بلا ـــــ اور یہ میں کہاں آ گیا ہوں ـــــ اللہ اللہ یہ ملک کتنی ترقی کر چکا ہے۔ سچ ہے جو قوم تاج محل لال قلعہ، فتحپور سیکری، لاہور اور کشمیر کے باغات لگا سکتی ہے وہ ایسے مکانات بھی تعمیر کرا سکتی ہے میں نے سوچا کہ میں بلا وجہ حسد میں مبتلا ہو گیا۔ ہو سکتا ہے چند سال میں میں بھی لکھ پتی سے کروڑ پتی بن جاؤں اور ایک ایسا ہی مکان میں بھی بنوا سکتا ہوں ـــــ لیکن فوزیہ ایک بیمہ ایجنٹ کیا وہ ایسے مکان کی مالک ہو سکتی ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ مکان فوزیہ کے بھائی کا بھی تو ہو سکتا ہے۔ ابھی میں یہ باتیں بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ فوزیہ اپنی اماں کو ہمراہ لے کر داخل ہوئی، اس کی اماں سپید ریشمی ساری میں ملبوس تھی ـــــ پینتالیس اور پچاس کے پیٹے میں ہو نگی سک سک ناک نقشہ چیخ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ جوانی میں وہ فوزیہ سے مشابہ تھا۔ سرخ و سپید رنگت وہ سراپا خلوص و محبت کا پیکر تھیں۔ میں سرو قد کھڑا ہو گیا۔ صاحب سلامت کی اور بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک باوردی ملازم ٹرالیاں دھکیلتا ہوا آیا اور چائے کا سامان سج گیا۔

فوزیہ کی اماں نے میرا انٹرویو لینا شروع کیا۔

فوزیہ نے تمہاری بڑی تعریف کی ہے غنی میاں"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دوں۔ میں نے بلاشبہ اس سے بھی زیادہ نفیس اور قیمتی ماحول دیکھا ہے لیکن یہ سب کچھ خلاف توقع تھا میں اکثر تجارتی وفود میں شامل ہو کر غیر ملکوں کی سیر بھی کرتا رہا ہوں اور سرکاری اور غیر سرکاری دعوتیں ہزاروں کی تعداد میں کھکی ہیں، لیکن فوزیہ کے بارے میں جو میں نے تصورات قائم کئے تھے اور مستقبل کے کچھ منصوبے بنائے تھے وہ دھڑام سے نیچے گرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میں نے جواباً کہا:

دراصل میں فوزیہ کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا مجھے معلوم نہیں تھا کہ ــــ" میں خود ہی سٹپٹا گیا کہ اب کیا کہوں اور یہ کہ میں کہنے والا کیا تھا، بھلے کو زبان رک گئی۔ میں نے میزوں پر پھیلے ہوئے چائے کے پر تکلف سامان کی طرف اشارہ کیا ــــ "آپ لوگ اتنا تکلف کریں گے، ــــ"

"تکلف کیا ہے بیٹا ــــ ذرا سی نگوڑی چائے ہے آدمی تو کچھ ڈاڑھ تو گرم کرے ــــ"

سامان اس قدر وافر تھا اور اس قدر متنوع، کہ ایک نہیں اکٹھا بارہ آدمیوں کے پیٹ کا تنور بھی اس سے گرم کیا جا سکتا تھا، ڈاڑھ کا کیا ذکر ہے۔ خیر میں نے تھوڑا بہت کھایا، چائے پی گئی اور ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اسی اثنا میں ایک نوجوان نے پردہ ہٹا کر جھانکا۔ مجھے خیال آیا کہ اسے کہیں میں نے دیکھا ہے۔ نوجوان نے منہ اندر ڈال کر کہا۔

"اماں میں کلب جا رہا ہوں ــــ فوزیہ تم وہیں آ جانا۔

"اچھا ــــ" فوزیہ نے اثبات میں گردن ہلا دی، اماں کچھ نہ بولیں اور نوجوان چلا گیا۔

فوزیہ بولی ــــ "یہ میرے بھائی جان ہیں کلب کے بڑے رسیا ہیں" ــــ پھر بولی ــــ

"غنی صاحب آپ کلب نہیں جاتے؟"

میں فوزیہ کے بھائی جان کی بداخلاقی پر غور کرتے ہوئے بولا۔۔۔ "کبھی کبھار چلا جاتا ہوں"

اماں بولیں۔۔۔ "احسان تو کلب کے پیچھے دیوانہ ہے۔۔۔ اپنے ساتھ فوزیہ کی مٹی بھی پلید کر رہا ہے، کیا کہوں"

اماں کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر کہہ نہ سکیں، فوزیہ نے اسی لمحے انھیں گھورا وہ چائے کی پیالی میں چینی ملا کر گھمانے لگیں۔ چائے پی کر میں نے چلنے کا قصد کیا تو فوزیہ بولی۔

"غنی صاحب، کیا آپ مجھے کلب تک پہنچا دیں گے؟"

"کیوں نہیں"۔۔۔ میں نے خوش اخلاقی سے کہا، لیکن طارق کی بداخلاقی مجھے بدستور کھٹک رہی تھی۔ وہ مغرور تھا وہ مجھے حقیر سمجھتا تھا۔ بہرحال میں نے اماں سے اجازت لی اور گاڑی میں میرے پہلو بہ پہلو فوزیہ آ بیٹھی، اور جب میں کلب اسے چھوڑنے گیا تو بات مجھے اور بھی بری لگی۔ طوعاً و کرہاً میں اسے وہاں پہنچایا اور خود چلا آیا۔ گھر واپس آیا جس خوشی سے فوزیہ سے ملنے گیا تھا وہ خوشی کافور ہو چکی تھی۔ معلوم نہیں کیوں فوزیہ کی شخصیت میں مجھے گرہیں پڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اور ان گانٹھوں کو کھولنا اچھا خاصا مسئلہ تھا۔ میں دیر تک گھر میں ٹہلتا رہا۔ اماں نے پریشانی کا سبب بھی پوچھا۔ میں ٹال گیا۔ پھر نجانے کیا سوچ کر میں نے لباس دوسرا تبدیل کیا۔ گاڑی لی اور کلب جا پہنچا۔ اب رات ہو چلی تھی۔ گھنے گھنے تناور درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ کلب کی سادہ عمارت کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے تھے۔ میں نے نہ بلیرڈ کی طرف رخ کیا نہ پنگ پانگ اور دوسرے اسی قسم کے کھیلوں کی طرف، سیدھا بار روم کی طرف چلا گیا۔ سامنے ہی مجھے دو مردوں کے بیچ میں جو تیسری ہستی نظر آئی وہ فوزیہ کی تھی لیکن اس نے مجھے نہیں دیکھا، میں گردن جھکائے بار پر جا پہنچا اور سٹول پر جا بیٹھا۔ چند جرعے چڑھا کر رخصت ہو جانا چاہتا تھا کہ مجھے اپنی بیٹھ کے پیچھے جو

آواز سنائی دی وہ احسان کی تھی وہ فوزیہ کو لے کر ایک طرف ہو گیا تھا وہ کہہ رہا تھا۔

"مجھے تو بالکل چڑی کا غلام لگتا ہے۔"

فوزیہ بولی ــــ "نہیں ــــ لکھ پتی ہے۔"

اچنبھے کے ساتھ آواز آئی ــــ "سچ کہو۔"

"بالکل سچ ہے بھیا۔"

"پھر تو سونے کی چڑیا ہے۔"

"ہاں مگر ــــ؟"

"آدمی شریف ہے۔"

"ہنہ" ــــ مرد کی آواز تھی ــــ "خیر سیدھی انگلیوں گھی نہ نکلے تو انگلیاں ٹیڑھی کرنا ہی پڑتی ہیں۔"

معاً دونوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں اور ان دونوں پر ایک اور مردانہ آواز غالب آ گئی۔

"ہلو فوزی ــــ یہاں کون سی سازش کر رہے ہو تم دونوں ــــ"

"ہلو ہلو ــــ" فوزیہ بولی ــــ "آیئے آیئے جناب اللہ والا ــــ کب آئے آپ کراچی سے ــــ سازش تو آپ ہی کے خلاف ہو رہی ہے۔"

اللہ والا کا قہقہہ گونجا ــــ "اچھا اچھا ــــ بھئی میں آج ہی آیا ہوں، کل چلا جاؤں گا ــــ سنا ہے آج یہاں خاص رقص ہو گا۔"

"جی ہاں جناب۔ کیا آپ ناچیں گے؟" ــــ فوزیہ نے پوچھا۔

"جب تم نچاؤ گی تو بھلا کیوں نہ ناچیں گے۔ آخر کتنوں کو نچایا ہے تم نے ــــ کیوں

احسان نے بے حیائی کے ساتھ ایک قہقہہ لگایا۔

اب میری باری تھی۔ میں نے جام تو میز پہ دھرا اور مڑ کر دو قدم چل کر ان کے پاس پہنچ گیا اور مجھے دیکھتے ہی فوزیہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، زرد پڑ گئی ــــ "وہ آپ ــ آپ یہاں ــــ کب آئے ــــ"

پھر اس نے میرا سب سے تعارف کرایا اور میں معذرت کر کے باہر چلا آیا۔ گاڑی میں بیٹھا تو سر چکرا رہا تھا کہ اب کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس طرح میری کار خود بخود ایک بار پھر فوزیہ کے گھر جا پہنچی۔ خلاف توقع صرف پورٹیکو کی بتی جل رہی تھی اور سارے گھر میں سناٹا تھا۔ پہرے دار دوڑ کر آیا اور اندھیرے میں مجھے پہچان نہ سکا۔ میں بھی گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔ اس نے گاڑی میں منہ ڈال کر کہا کہ

"صاحب لوگ تو بہت دن سے ولایت گئے ہوئے ہیں۔"

"کون صاحب لوگ؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا ــــ وہی صاحب جو ہمارے مالک ہیں، علی فتح جنگ اور کون ــــ جن کا مکان ہے۔

اب مجھے خیال ہوا کہ شاید میں کسی غلط مکان میں آ گیا ہوں۔ میں نے پہرے دار سے کہا:

"اچھا اچھا ــــ تو وہ احسان اور فوزیہ کہاں رہتے ہیں؟"

"وہ ــــ وہ؟" پہرے دار نے کہا اور کسی قدر مضحکہ خیز طریقے سے کہا "صاحب وہ تو اس مکان کے پیچھے جو ایک گراج پڑا ہوا تھا۔ اس میں رہتے ہیں ــــ لیکن وہ اس وقت آپ کو ملیں گے نہیں ــــ ہاں ان کی اماں ہوں گی ــــ وہ صاحب بڑی نیک بی بی ہیں ــــ آیئے میں لے چلوں۔"

میں گاڑی سے نکل آیا۔ "چلو" ــــ میں نے کہا اور گراج کے پاس پہنچ کر جو شے مجھے سب سے پہلے یاد آئی وہ توبۃ النصوح کے مرزا ظاہر دار بیگ کی مضحکہ خیز حالت تھی۔ پہرے دار کو

رخصت کرنے سے پہلے میں نے اس سے کہا — "سنو آج اس بڑی کوٹھی میں ایک نوجوان آیا تھا، اس کی دعوت ہوئی تھی۔"

وہ بولا — "ہاں ہاں، ہوئی تھی۔" — پھر زور سے ہنسا اور رازدارانہ انداز میں بولا — احسان میاں کی صاحب سے دوستی ہے نا، کبھی کبھی ان کا کوئی دوست یہاں آجاتا ہے۔"

"اچھا!"

دروازہ کھٹکھٹایا بوڑھی عورت نے آکر پوچھا — آپ کون صاحب ہیں؟"

میں نے کہا — "غنی۔"

دیر تک کوئی جواب نہیں ملا، یا عورت بے چاری پہچان ہی نہیں سکی یا سناٹے میں آگئی۔

میں بولا — "اماں کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"

رندھے ہوئے گلے سے بولی — "آجاؤ بیٹا۔"

میں اندر چلا گیا۔ گراج میں تین چارپائیاں، ایک نماز کی چوکی، دو ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ایک میز، چند ٹرنک اور کچھ کپڑے پڑے ہوئے تھے، عورت جو آج ہی مجھ سے ایک عالی شان ڈرائینگ روم میں مل چکی تھی اس اچانک تغیر پر نہایت پریشان تھی اور ضبط نہ کرسکی رونے لگی۔

میں نے کہا — اماں اس میں دکھ کی کوئی بات نہیں، بڑے بڑے ہادی اور نبی بھی غریب رہے ہیں۔"

دکھ کی بات یہ نہیں ہے غنی میاں" اس نے پھٹے ہوئے دوپٹے سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا — "دکھ کی بات یہ ہے کہ فوزیہ اور احسان کو اپنی اس حالت پر شرم آتی ہے اور اس حالت کو ظاہر کرتے ہوئے وہ ڈرتے ہیں — وہ کہتے ہیں کہ کوئی ان کی عزت نہیں کرے گا — انھیں وہ مرتبہ نہیں ملے گا جو آج سوسائٹی میں انھیں حاصل ہے۔"

ہیں ایک چار پائی پر بیٹھ گیا ـــــ "اماں یہی تو دکھ ہے کہ ہمارے معاشرے میں بڑا کھوکھلا پن ہے۔ ہم اسی نمائش اور دکھاوے میں کچھ سے کچھ بن گئے ہیں ـــــ جو ہم نہیں ہیں جو ہم نہیں بن سکتے وہ ہم بننے کی کوشش کیوں کرتے ہیں ـــــ آخر جو ہم ہیں وہی کیا بُرے ہیں ـــــ یہ بات ہماری سمجھ میں کیوں نہیں آتی ؟"

"بیٹا" ـــــ اماں نے نماز کی چوکی پر پاندان کھول لیا، ڈلی کترتے ہوئے بولیں ـــــ "تم سے اب کیا پردہ ـــــ ہم پہلے بھی رئیس ابن رئیس نہیں تھے ـــــ جتنی روٹی کھا کر موٹا جھوٹا پہن کر مگن رہتے تھے۔ یہاں بھی دونوں بہن بھائی ہزار بارہ سو کما لیتے ہیں ـــــ لیکن کس کام کے کپڑے، پارٹیاں، کلب، یہ وہ، خاک دھول بلا اور گھر دیکھو تو خاک پر بسم اللہ، نہ ناک اتے نہ پلّے پانی سے پیٹ بھرے ـــــ کہو کہ بھائی کیا غضب کرتے ہو، جوان جہان بہن ہے اس کا شادی بیاہ کرنا ہے تو اُلٹے صاحبزادے بھی لڑتے ہیں اور صاحبزادی بھی قائل معقول کرنے کی کوشش کرتی ہیں ـــــ" عورت نے ڈلی پھانک کر زور سے ہاتھ جھاڑے ـــــ

"اچھا بابا تم جانو تمہارا کام جانے ہمارا کام سمجھانا بتانا تھا سو بتا دیا ـــــ اب تم لوگ خود اپنے ہاتھ منہ کے ہو، اپنے خود مالک و مختار ہو جو چاہے سو کرو ـــــ ملمع ملمع ہی ہوتا ہے کبھی نہ کبھی اترتا ہے تو آدمی کی ساکھ ختم ہو جاتی ہے ـــــ سو بیٹا تم ہی ذرا کہو دو انصاف سے کہ ملمع کی گاڑی کب تک چلے گی ـــــ علی فتح جنگ کے رحم و کرم پر کب تک یہ دھندا چلے گا ـــــ اور یہ کلب جانا کوئی اچھی بات نہیں ہے ـــــ" عورت دیر تک بڑبڑاتی رہی جب ذرا تھمی تو میں نے وہ بات، جو ہر شخص کہنے کی ہمت نہیں رکھتا، میں نے کہا۔

"اماں میں کوئی بہت بڑا آدمی تو نہیں ہوں ـــــ لیکن ہاں، اللہ نے اس قدر دیا ہے کہ کھا پہن سکتا ہوں ـــــ اگر آپ مجھے فوزیہ کے لئے اپنی فرزندی میں لے لیں تو ـــــ میں خود کو

بے حد خوش نصیب سمجھوں گا ـــــ شاید اس طرح سارے حالات ٹھیک ہو جائیں"

میری یہ بات سن کر عورت پر خاص اثر ہوا۔ رقت طاری ہو گئی لیکن اسی حالت میں وہ اٹھی اس نے مجھے گلے سے لگا لیا، پیشانی چومی، صدقے قربان گئی اور کہا ـــ "مجھے ہر طرح منظور ہے"

میں نے محبت یا عشق کے ماتحت یہ سودا کر ڈالا، نہیں ایسا ہرگز نہیں بلکہ فوزیہ کے خاندان کو تباہی سے بچانے کا میرے نزدیک اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں رخصت ہو کر گھر آیا اور تمام نتائج و عواقب پر غور کرتے ہوئے سو گیا۔

صبح جب میری اماں نے ناشتہ پر بلایا تو میز پر میرے اور میری اماں کے علاوہ خود فوزیہ بھی موجود تھی۔ وہ سویرے ہی سویرے آ دھمکی تھی اور اس کے چہرے پر ایک خاص سرخی سی دوڑی ہوئی تھی جو صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی کنواری عورت سے اظہار محبت کیا جائے لیکن اس کی نگاہیں جھکی جھکی سی تھیں۔ ایک اصلی حالت کے ظاہر ہو جانے کی شرم تھی، دوسری بار حیا نے پلکوں کو جھکا دیا تھا۔

ناشتے کے بعد ہم تیار ہو کر گھومنے کو نکلے، ایک جگہ سناٹے میں گاڑی روک کر میں چند باتیں اس سے کرنا چاہتا تھا کہ وہ بولی:

"غنی تمہاری محبت سے مجھے خوشی ہے ـــــ مگر میں تم سے شادی نہیں کر سکتی"

"کیوں؟"

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی ـــــ "شادی" ـــ اس نے کہا اور دوپٹے کے آنچل کو مروڑتے ہوئے کہا ـــ شادی شاید میری کبھی نہ ہو سکے" ـــ اور اتنا کہہ کر وہ خود بھی رونے لگی۔

"لیکن آخر کیوں ـــــ جب میں شادی کر رہا ہوں تو تم کو ـــ تم کو ـــــ"

اس نے بات کاٹ کر کہا ـــ "غنی تم مجھ پر ترس کھا کر شادی کر رہے ہو نا ـــ جیسے

کسی بھکارن پر ترس کھا کر تم ایک روپے کی جگہ دس روپے دے ڈالتے ہو ـــــ مجھے یہ ترس نہیں چاہیئے ـــــ مجھے کسی شخص کی ترس خدائی نہیں چاہیئے اور پھر ـــــ "سنو غنی، احسان بھائی جان کو تم نہیں جانتے ـــــ اگر میں مان بھی جاؤں تو مجھے یقین ہے کہ میری اور اماں کی زندگی سدھر جائے گی لیکن وہ نہیں مانیں گے ـــــ غنی میں اچھی عورت نہیں ہوں۔"

"اتنا کہہ کر اس نے تقریباً سارا دوپٹہ منہ میں ٹھونس لیا اور زور زور سے رونے لگی

ـــــ "میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔"

میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے چہرے کو اپنی طرف موڑا تو آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ رہی تھیں۔

میں نے کہا ـــــ فوزیہ! تم دل کی بہت اچھی عورت ہو ـــــ تمہاری روح بہت اچھی ہے، اس لئے تم بری عورت نہیں بن سکیں ـــــ یہ تمہاری سچائی ـــــ یہ آنسو تمہاری بلندی اور عظمت ظاہر کر رہے ہیں۔ اب میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا فوزی ـــــ"

لیکن تمہاری محبت؟" وہ پھر بولی ـــــ "تم مجھ سے کبھی سچی محبت نہیں کر سکتے۔ تم مجھ پر ہمیشہ ترس کھاؤ گے اور کسی بھکارن کی طرح محبت کے چند فقرے سکوں کی طرح میری جھولی میں ڈال دو گے ـــــ اور بس ـــــ اور بس ـــــ اس سے زیادہ تم مجھے نہیں چاہو گے کبھی نہیں چاہو گے ـــــ میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں میں کسی مرد کی ـــــ اور مرد بھی وہ جو میرا شوہر ہو، ترس خدائی پر نہیں جی سکتی ـــــ مجھے مرد کی صحیح اور سچی محبت نہیں مل سکتی اور میں سچی اور بھرپور محبت کی بھوکی ہوں" ـــــ اتنا کہہ کر وہ دیر تک روتی رہی میں نے بھی تھک کر اسٹیئرنگ پر سر رکھ دیا۔ کچھ دیر گزر گئی۔ جب میں نے خیال کیا کہ اب شاید نرمی سے اسے سمجھایا جا سکے اور سر اٹھایا تو پہلو خالی تھا ـــــ دور پر دیکھا کہ وہ چلی جا رہی تھی پیدل ـــــ

تنہا ـــــ میں نے کھلا ہوا دروازہ بند کیا۔ گاڑی اسٹارٹ کی اس کے قریب پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک اور گاڑی جو وسیع اور خوبصورت اور قیمتی تھی وہیں پہ آکر ٹھہر گئی ـــ دروازے کھلے بیک وقت احسان اور اللہ والا گاڑی سے نکلے، احسان بولا:

"تم کہاں چلی گئی تھیں فوزی ـــ مسٹر اللہ والا تم کو کراچی لے جانا چاہتے ہیں ـــ وہاں سے ولایت لے جائیں گے ـــ"

فوزیہ مسکرائی اور ایک لمحے کو میری طرف دیکھا، لیکن آنکھیں جو آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں، چشمے کے سیاہ شیشوں میں چھپ چکی تھیں۔ احسان اور اللہ والا مجھے نظر انداز کر چکے تھے لیکن فوزیہ کے مخاطب ہونے سے وہ بھی مجبوراً مخاطب ہوئے۔

فوزیہ بولی ـــ "شکریہ، مسٹر غنی ـــ آپ دیکھتے ہیں کہ مسٹر اللہ والا نہ صرف مجھے لفٹ دے رہے ہیں بلکہ زمین سے آسمان تک پہنچائے دے رہے ہیں"

اس بات پر سب ہنسنے لگے، ہنسا میں بھی لیکن مجھے یاد نہیں کہ شکست خوردہ ہنسی میں میرا کیا عالم ہوا، فوزیہ ان کی گاڑی میں جا بیٹھی اور گاڑی دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ہو گئی۔

سڑک پہ اس گاڑی کی اڑائی ہوئی دھول ہی دھول تھی اور اس دھول میں میری گاڑی جوں کی طرح رینگ رہی تھی۔

ٹھکانہ کہیں نہیں

کراچی میں لڑکیوں کے ایک اسکول کی معلمہ کو بیساکھیوں کے سہارے چلتے ہوئے
دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔

اللہ اللہ طاہرہ باجی کے بھی کیا ٹھاٹ تھے۔ لکھنؤ میں دریائے موتی محل کے پل کے
اُس پار، سوا دو لاکھ کی کوٹھی میں رہتی تھیں۔ کیسا کیسا ولایتی فرنیچر ان کے ابو نے خریدا تھا کہ
بڑے بڑے رجواڑوں میں نایاب تھا۔ ڈرائینگ روم تھا کہ دیکھتے ہی رہیے ایسی ایسی نادر
اشیا سے مزین کہ انگریز افسران بھی رشک کرتے تھے، ایرانی قالین، یونانی مجسمے، فرانسیسی
پینٹنگز اور بیلجیم کے فانوس جھاڑ اور کنول تو اٹے پڑے تھے گھر میں۔ ریشم و کمخواب کے پردوں
سے ان کی امی نے کس کس طرح گھر کی تزئین و آرائش کی تھی۔ طاہرہ باجی کے ابو اور امی دونوں
ان پر جان چھڑکتے تھے۔ اکلوتی لڑکی اور اکیلی اولاد، ہر طرح کا لاڈ اور دلار ہوتا تھا۔ طاہرہ باجی
تھیں بھی پھول پان سی۔ چھریرے جسم اور اکہری ہڈی کی دبلی پتلی سی لڑکی مگر سرخ و سپید رنگت

تھی کہ میدہ اور شہاب، رخساروں کی سرخی تھی کہ انار کا سا چوچہا تا رنگ اور چہرے کی آب تاب تھی کہ گویا مہتابیاں چھوٹ رہی ہوں۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں ستواں ناک کشادہ پیشانی خمدار گردن، اور اس پر طرہ یہ کہ گھنے سیاہ اور لمبے بال جن میں بنگال کا جادو بسیرا لیتا تھا۔ مورنی کی سی چال اور کوئل کی سی آواز غرضکہ طاہرہ باجی کیا تھیں کہ جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی اردو غزل تھیں۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ غزل گو شاعروں نے طاہرہ باجی کو دیکھ کر غزل کے روایتی معشوق کا سراپا کھینچا ہے۔

طاہرہ باجی کے ابو تھے تو روایتی قسم کے جاگیردار اور جاگیر بھی انھیں وراثتاً ہی ملی تھی لیکن انگریزی تعلیم کی وجہ سے انگریزی معاشرت اور انگریزوں کی طرز بود و باش اختیار کر لی تھی۔ انگریز حکام کی آئے دن پارٹیاں ہوتیں، ایک سے ایک کھانے کھلائے جاتے اور عمدہ سے عمدہ ولایتی شرابیں پلائی جاتیں۔ مجال ہے کہ کوئی دیسی آدمی بغیر ڈنر جیکٹ کے ڈنر پر آجائے یا ر دہین ادب و آداب کا لحاظ بھول جائے۔ طاہرہ باجی کو ایسے نامعلوم کتنے قصے یاد تھے۔ جب فلاں انگریز کی دعوت میں فلاں فلاں ملازم سے صرف اتنی سی غلطی ہوگئی کہ وہ خانساماں یا خدمت گار کا صحیح لباس پہنے ہوئے نہ تھا یا اس نے کھانے کے کورس میں فلاں ڈش کی ترتیب بدل دی تھی اور اس جرم پر ابو نے اسے کھڑے نکال دیا تھا۔ طاہرہ باجی کے ابو کو کھانوں اور دعوتوں ہی کا نہیں لباس کا بھی شوق تھا۔ اچھے سے اچھا نفیس اور پاک پاکیزہ لباس پہنتے تھے۔ پک اینڈ پک کے جتنے مختلف شیڈز کے سوٹ ابو کی الماری میں تھے اتنے تو کسی وائسرائے کے پاس بھی نہ ہوں گے۔ ٹائیوں کی تو کوئی حد اور انتہا ہی نہ تھی اور اس طرح لباس کی تراش خراش میں بھی وہ ہمیشہ وقت کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ پیرس میں ہر موسم کے لباس کی تراش خراش کے نئے سے نئے نمونے رسائل میں دیکھ دیکھ کر بنواتے تھے اور اپنی

اس نفاست پسندی کی داد بھی وہ کچھ انگریز افسروں سے ہی پاتے تھے۔

طاہرہ باجی بچپنے ہی سے بلا کی ذہین اور طباع تھیں دیکھتے دیکھتے تو انھوں نے لی ریٹو کانونٹ کی جماعتیں عبور کر کے آئی ٹی کالج میں داخلہ لے لیا، گھر پر انگریز گورنس کی بدولت اور گھریلو ماحول کے طفیل میں ایسی فراٹے دار انگریزی بولتی تھیں کہ دوسروں کو ان کے انگریز نہ ہونے پر شبہ بھی نہ ہوتا کالج میں تو وہ چمکیں کہ شہر کے دانشور حلقوں میں دیکھتے دیکھتے ان کا چرچا ہونے لگا۔ ان کی تقریریں اُن کے مضامین اخباروں میں آنے لگے۔ زمانہ بھی کانگریس اور مسلم لیگ کی تحریکوں کا تھا۔ طاہرہ باجی نے تو محض شوقیہ آزادی کی تحریک میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ وہاں پانسہ ایسا پلٹا کہ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے سرکردہ رہنما ان کے خاندان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے لیکن یہاں بھی قسمت کا چکر ایسا ہوا کہ طاہرہ باجی تو جی جان سے مسلم لیگ کا کام کر رہی تھیں اور ان کے ابّو کو کانگریس والوں نے ایسا شیشے میں اتارا کہ باپ بیٹی میں اچھا خاصا اختلاف پیدا ہو گیا۔ طاہرہ باجی کو شکایت تھی تو بس اتنی کہ ابّو سوچے سمجھے بغیر کانگریس میں شریک ہو رہے ہیں جبکہ انھیں نہ مسلم لیگ کی آئیڈیالوجی کا پتہ ہے اور نہ کانگریس سے دلچسپی ہے محض حصول اقتدار کی غرض سے وہ کانگریس کے اسیر ہو رہے ہیں۔ طاہرہ باجی تو اپنی بے تکلف سہیلیوں میں یہ بھید بھی کھول دیتی تھیں کہ "ارے ابّو تو بھولے بھالے آدمی ہیں۔ موتی لال نہرو سے پرانا یارانہ تھا جواہر لال کو بیٹا جواہر لال کہتے ہیں بس جواہر لال نے کوئی پٹی پڑھا دی ہے اور وہ کانگریس میں شامل ہو گئے ہیں۔ قائدِ اعظم یا لیاقت علی خاں میں سے کوئی اگر پہلے ان سے مل لیتا تو وہ بھلے چنگے مسلم لیگی ہوتے"۔ اور یہ بھی حقیقت کہ اس کے ابّو میں سیاسی بصیرت قطعاً نہ تھی محض تفریح طبع کے لئے وہ اس میں حصہ لے رہے تھے۔ جب مرشد آباد سے ان کا بھتیجا

علی سفیان آیا اور طاہرہ باجی اس کے ہمراہ بیچ بیچ مسلم لیگ کا کام کرنے کے لئے بنگال روانہ ہونے لگے تو انھیں پہلی بار احساس ہوا کہ سیاست محض کھیل نہیں جان جوکھوں کا کام ہے جو ایثار و قربانی بھی طلب کرتا ہے۔

طاہرہ باجی نے بنگالہ میں کام شروع کرنے کے لئے کلکتہ کو مستقر بنایا لیکن ڈھاکہ چٹاگانگ سے لے کر آسام تک اُن کی تحریک کا کام پھیلا ہوا تھا۔ بنگالہ میں وقتاً فوقتاً مختلف تحریکیں اٹھیں اور دبیں یا یوں کہیئے کہ بحر بنگال کی طرح سارے بنگلے میں تحریکوں کی طغیانیاں اٹھتی ہی رہتی ہیں لیکن مسلم لیگ نے تو اس انداز سے کام شروع کیا کہ پھر پاکستان بنا کر ہی دم لیا۔ طاہرہ باجی اور علی سفیان نے شب و روز کام کر کے شیر بنگال اور خواجہ ناظم الدین جیسے بزرگوں سے داد و تحسین حاصل کی اور بالآخر انہیں بزرگوں کی دعاؤں کے سائے میں بنگالہ ہی کو اپنا وطن بھی بنایا شادی بھی کر لی اور وہیں علی سفیان نے چھوٹا موٹا کاروبار بھی شروع کر دیا۔

مرشد آباد میں علی سفیان کی جائداد غیر منقولہ بے حد و بے حساب تھی اور اسی طرح لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں ایک بڑی جاگیر کی طاہرہ باجی بھی مالک تھیں لیکن دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اس کی پرواتک نہ تھی۔ شروع شروع میں تو طاہرہ باجی نے بانسوں اور چٹائی کے بنے ہوئے مکانوں میں گزر بسر کی پھر کہیں دو چار سال کے بعد چھوٹا سا ل پختہ مکان کرائے پر میسر آیا لیکن دونوں کو خوشی تھی تو اس بات کی کہ اس سرزمین سے انگریز کو نکال کر مسلمانوں کے لئے پاکستان حاصل کر لیا گیا ہے اور مسلمانوں کو ہندوؤں کی انتہا پسند متعصبانہ اور مجنونانہ مذہبی احیائی ذہنیت سے چھٹکارہ مل گیا ہے جس کا اظہار اجتماعی طور پر انگریزوں کی سرپرستی میں انھوں نے ہزار بار کیا اور اسے ایک خطرناک تحریک کی شکل میں برصغیر میں قائم کر لیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ برصغیر میں اسلام کی نشاۃ الثانیہ کا دور اس طرح شروع کیا جا سکتا ہے اور جھونپڑیوں میں رہ کر

اس لحاظ سے کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ مسلمانوں کے لئے ایک مضبوط قلعہ (پاکستان) معرض وجود میں آچکا ہے۔ لہذا مرشد آباد اور لکھنؤ میں چھوڑی ہوئی جائدادیں محض گردِ منزل ہیں منزل نہیں، منزل تو پاکستان ہے۔

خون کے رشتے بھی عجیب ہوتے ہیں، پھر یہ کہ تھیں بھی طاہرہ باجی اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد، اس طویل مفارقت میں دونوں کا بُرا حال ہوا باپ نے حوصلہ ہار دیا، اور ایسا دل پر صدمہ ایا کہ چارپائی پر جا لگے۔ ظاہر ہے کہ کس بات کی گھر میں کمی تھی بھرا بھرتا تھا جلا جلتا تھا لیکن طاہرہ باجی کے بغیر گھر تھا کہ بھائیں بھائیں کرتا تھا، ماں باپ دیکھ دیکھ کر جسے جیتے تھے اور جس کی آواز سے چلوؤں خون بڑھتا تھا اور جس کی دیدار سے آنکھوں میں روشنی اور دل میں ٹھنڈک رہتی تھی وہ یوں بات کی بات میں چلی جائے یہ کچھ تھوڑی سی بات نہ تھی اس پر طرہ یہ ہوا کہ تحریک پاکستان کے سلسلے میں بنگالہ کئی کئی بار آگ اور خون کے دریا سے ہو کر گزرتا رہا اور رسل و رسائل کے بار بار منقطع ہو ہو جانے سے نحیف و نزار دلوں پر وہ وہ صدمے گزر گئے کہ کبھی خواب میں بھی جن کا تصور نہ بندھا ہوگا۔ غرضکہ علاج معالجہ سب بیکار ہونے لگا تو طبیبوں نے کہا کہ اگر خوش رہیں تو سب ٹھیک ہو سکتا ہے اور صدمہ دور ہو جائے تو صحت بحال ہو سکتی ہے۔ طاہرہ باجی کو اللہ رسول کے واسطے دے دے کر خطوط لکھے گئے لیکن انھیں دنوں طرفین کی آبادی کی منتقلی کا جو سلسلہ شروع ہوا تو طاہرہ باجی کو مہاجر کیمپوں میں لٹے پٹے زخمی اور بے حال مہاجروں کی خبر گیری کے کام میں لگنا پڑا، اور ماں باپ مطلقاً فراموش ہو گئے۔ فراموش تو کیا ہوتے۔ طاہرہ باجی پر وہ غضب کی خود فراموشی طاری ہوئی کہ سوائے کیمپوں کے مہاجروں کی خدمت گزاری کے اور کچھ انھیں یاد نہ رہا۔ اور جب اس کام سے فرصت ملی اور ارادہ کیا کہ ابو کو دیکھ آئیں تو یہ سنا ونی پہنچی کہ ابو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ امی کو دیکھا تو ہڈیوں کی مالا بن کر

رہ گئیں تھیں اور ڈھنڈھار سی کوٹھی میں تن تنہا ڈونڈیاتی پھرتی تھیں۔ ابو کی آوازیں کانوں میں گونجتی تھیں اور ہر لمحہ یہی احساس ہوتا کہ اب اس دروازے کا پردہ اٹھے گا اور مسکراتے ہوئے ابو داخل ہوں گے" ارے میری طرو بیٹی ــــ آگئی"، لیکن یہ سب واہمے تھے ابو تو تال کٹورے کے قبرستان میں منوں مٹی تلے سو رہے تھے اور اوپر سنگ مرمر کی لوحِ مزار ان کے جاگیردار ہونے کا اعلان کر رہی تھی اور قریب ہی میدانی لیمپ سنگ مزار کے سرہانے ایک ستون میں نصب تھا، دن بھر ہاروں اور پھولوں کی خوشبوؤں سے مزار مہکتا تھا اور رات بھر میدانی لیمپ سے ابو کی قبر پر روشنی کی بارانی رہتی تھی۔ آس پاس بہت سی کچی کچی قبروں میں ہزارہا افراد ابدی نیند سو رہے تھے لیکن جو طنطنہ ابو کی قبر پر پہرہ دے رہا تھا وہ دوسری قبروں پر کہاں؟ دوسری قبریں تو بیچ مٹی کے ڈھیر تھیں اور بس۔ گویا ابو یہاں بھی ڈھائی لاکھ کی کوٹھی کا ساٹھاٹ قائم کئے ہوئے تھے۔ طاہرہ باجی کو یوں لگا جیسے زیرِ زمین بھی ایک ایسا ہی نظام قائم ہے جو زمین کے اوپر اہلِ زمین نے قائم کر رکھا ہے وہی امارت و غربت وہاں بھی موجود ہے گویا گویا ابو مرنے کے بعد بھی حکومت کر رہے ہیں۔

طاہرہ باجی کی امی نے جب دیکھا کہ وہ کسی طرح بھی روکے سے نہیں رکتیں اور ہر قیمت پر پاکستان واپس جانا چاہتی ہیں تو کچھ دوسرے ہتھکنڈے اختیار کئے چند ایسے بزرگوں سے اپیلیں کرائیں جو ابو کے پرانے دوست تھے ان میں چند باثر رؤسائے شہر بھی تھے اور کانگریس کے عہدیدار اور حکومت کے بالواسطہ اور بلاواسطہ مربی اور محسن بھی چند ہند عہدیدار جو طاہرہ باجی کے سر پہ ہاتھ پھیر کر آبدیدہ ہو ہو کر ابو کی یاد دلانے لگے کہ اگر بیٹی تم یہاں آجاؤ اور یہیں رہو تو ہم سب ٹھیک کرا دیں گے، تمہارے ابو نے کانگریس کے لئے بہت کام کیا ہے اس کے عوض تم کو حکومت سے بڑی مراعات مل جائیں گی۔ اگر سیاست میں حصہ لو گی تو وزارت

تک دلوادیں گے ورنہ سفارت تو کہیں گئی ہی نہیں پھر یہ کہ اس وقت کے ایک بڑے حاکم نے کہ وزارت عظمیٰ ان کے پاس تھی اپنے دیرینہ خاندانی روابط کے حوالہ سے طاہرہ باجی کو سمجھایا بجھایا کہ دو قومی نظریہ کچھ زیادہ دیرپا ثابت ہونے والی چیز نہیں ہے۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم عارضی ثابت ہوگی کیونکہ جغرافیائی لحاظ سے دونوں خطوں کا مفاد ایک دوسرے سے وابستہ ہے معیشت بنیادی شے ہے زبان اور ثقافت سے قومیت کا تعین ہوتا ہے مذہب سے نہیں جذبات کی رَو میں بہنا اور ہے اور حقائق سے جب بھی رجوع کیا جاتا ہے تو عقل غالب آجاتی ہے لہٰذا اس وقتی ابال اور ہیجان پر نہ جاؤ۔ پانی کے بلبلے کی طرح یہ سارا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ طاہرہ باجی غصہ میں لال بھبھوکا ہوگئیں اور ایسی کھری کھری سنائی کہ سب انھیں دیکھتے رہ گئے۔ یہ دیکھ کر ان لوگوں نے امی سے کہا کہ طاہرہ پر تو بھوت سوار ہے یہ صرف پاکستان ہی میں رہ کر اتر سکتا ہے اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ جب وہاں اس کے ہم وطن اسے غدار کہیں گے زبان اور ثقافت کے نام پر قتل و غارت کا بازار گرم ہوگا اس وقت اسے معلوم ہوگا کہ اصل قومیت کا نعرہ مذہب میں ہے کہ مٹی میں، دیکھتے ہیں کہ کب تک اسے اس مٹی کی یاد نہیں ستاتی جو اس کی ماں ہے۔

غرضکہ طاہرہ باجی لاکھوں کی جائیداد پر لات مار کر نکلیں اور مشرقی پاکستان واپس جا کر چٹاگانگ میں آباد ہوگئیں، علی سفیان نے کاروبار سنبھال لیا اور مقامی انجمنوں کو مسلم لیگ کے خطوط پر استوار کرنے کی تحریک شروع کی۔ طاہرہ باجی کو ہر چند کہ امور خانہ داری بھی انجام دینا پڑتے دونوں بچے بھی اسکول جانے لگے تھے ان کا دھیان رکھنا پڑتا لیکن پھر بھی وہ بقدر مقدور ان ان تحریکوں کے لئے جوش و خروش سے کام کرتی پھرتی تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد ہی لسانی تحریکیں شروع ہوگئیں لیکن جلد ہی بنگلہ اور اُردو کو قومی زبانوں کی حیثیت دیدی گئی تو طاہرہ باجی

اور علی سفیان نے بڑے چاؤ سے بنگلہ ادب پڑھنا شروع کر دیا۔ انھوں نے اُردو بنگلہ کو قریب لانے کے لئے طرح طرح کی کوششیں کیں لیکن ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ اس سعی میں وہ اپنا بہت کچھ کھو رہے ہیں اور پا کچھ نہیں رہے ہیں۔ اُن کے اہل وطن ان سے اجنبیت اور مغائرت محسوس کرتے ہیں اگرچہ وہ زبان کا پل بنا کر ان کے دلوں ہی میں کیوں نہ اتر جائیں پھر بھی نگاہیں صاف صاف صاف کہہ دیتی ہیں کہ تم پسندیدہ نہیں بلکہ ناپسندیدہ ہو۔

طاہرہ باجی نے اکثر علی سفیان کو بتایا بھی کہ ہمارے ہم وطن ہم کو ایسی چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے کبھی احیائی ذہنیت رکھنے والا خونخوار ہندو ہم کو دیکھتا تھا۔ گیا ہم کو نظریں یہ باور نہیں کراتیں ہیں کہ ہم ان سے اور یہ ہم سے نہیں ہیں کیا سچ مچ قومیت کے تصور کے سلسلے میں ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی ہے لیکن علی سفیان ہمیشہ یہی کہہ کر ٹال جاتے کہ صدیوں غلام رہنے کے سبب ہمارے ملک کے پس ماندہ طبقات میں شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں انھیں یہ خیال ہوتا ہے کہ پہلے انگریز استحصال کر رہا تھا اور اب ان سے نسبتاً خوش حال طبقہ ان کا استحصال کرے گا۔ جب اقتصادی حالات ملک کے سنور جائیں گے اور آسودگی ہو جائے گی تو یہ طرزِ فکر بدل جائے گی۔ اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہونا مناسب نہیں۔ طاہرہ باجی بھی سوچتیں ممکن ہے یہ واہمے ہوں ممکن ہے علی سفیان کا تجزیہ صحیح ہو۔ ممکن ہے یہ وقتی ہی بات ہو۔ بہرحال طاہرہ باجی نے سوچا کہ پاکستان کے قیام کے بعد بھی تحریکِ پاکستان کا کام جاری رہنا چاہیئے۔ اس اثنا میں قائدِ اعظم اور قائدِ ملت کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد مختلف النوع قیادتیں سامنے آتی رہیں لیکن کسی ایک بازو کا کیا ذکر پورے پاکستان کو مشرقی پاکستان ہی کی قیادت نے سنبھالا اور مختلف النوع قیادتوں کو ابھرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ بہرحال اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک سازشوں کا بازار ضرور گرم رہا، چھوٹے موٹے اختلافات بھی ہوتے رہے

حکومتیں بھی بدلتی رہیں آمریت اور جمہوریت میں رسا کشی بھی ہوتی رہی اور تحریک پاکستان کو تمام قیادتوں نے اس طرح فراموش کر دیا جس طرح کوئی باغبان پودا لگا کر اسے پانی سے محروم کر دیتا ہے اور غیر ضروری باتوں میں الجھ کر یہ بھول جاتا ہے کہ اگر اس پودے کو پانی نہ ملے تو جڑیں خشک ہو جائیں گی۔ طاہرہ باجی کا ماتھا تو جب ہی ٹھنکا تھا جب اپنے بچوں کے نصاب تعلیم میں پاکستان کی روح کے منافی نصاب دیکھنے میں آیا۔ اردو کی مخالفت میں منظم تحریکیں شروع کی گئیں۔ بھلا بنگلہ اور اردو کی کیا لڑائی تھی۔ دونوں قومی زبانیں تھیں۔ بنگلہ کو اس کا حق مل چکا تھا تو اب اردو مردہ باد سے بنگلہ کیسے زندہ باد بن سکتی تھی، بہر حال یہ تمام سازشیں جو مخالف سمتوں سے اٹھ رہی تھیں۔ ایک تند و تیز طوفان کا روپ دھار رہی تھیں۔ دونوں میاں بیوی ان خطرات کی بو پا چکے تھے لیکن کہتے تو کس سے کہتے اور سنتا تو کون سنتا۔ نہ فضل حق نہ خواجہ ناظم الدین نہ سہروردی کوئی باقی نہ تھا۔ جو قیادتیں ابھر رہی تھیں وہ سر بسر جذباتی تھیں اور مٹی کا بیٹا یعنی سن آف دی سوائل کے نعروں پر ان کی قیادت کی دوکان چمک رہی تھی۔

علی سفیان اور طاہرہ باجی دونوں کے دونوں پہلے تو ذرا ڈرے، کیونکہ جس سرزمین پر انسان کے قدم نہ جمنے دیئے جائیں وہ تو ایک ایسے درخت کی مانند ہوتا ہے جس کی جڑیں ہی نہ ہوں ان کی جڑیں تو اسلام کے قومی فلسفہ میں تھیں اور قومیت کے جس تصور کے ساتھ انھوں نے یہاں قدم جمائے تھے وہ زمین اور آسمان ہی باقی نہ رہے تھے لیکن پھر ہمت مردانہ سے انھوں نے کام لیا اور سوچا کہ کوئی کچھ کرے یا نہ کرے ان بدلے ہوئے حالات میں ہم پھر تحریک پاکستان کے لئے کام کریں گے اور انھیں آسمان زمین کو پھر بدلیں گے۔ اردو میں نہ سہی بنگلہ میں سہی کام ہوگا جس سے ملک بھی باقی رہے

قوم بھی رہے اور قومیت کا نظریہ بھی استوار رہے۔ لہٰذا دونوں نے چند سمجھ دار مقامی لوگوں کو ملا کر ایک پارٹی تشکیل دی اور بہت بڑے پیمانے پر کام شروع کیا لیکن عجب معاملہ ہوا کہ پارٹی کے خفیہ اجلاس اور خفیہ مذاکرات تک کا علم مخالف گروہ کے لوگوں کو ہو جاتا اور ہر ہر سطح پر ایسی مزاحمت کی جاتی کہ برطانوی سامراج نے بھی نہ کی تھی۔ ظاہر ہے کہ گھر کے بھیدی لنکا ڈھاتے تھے گویا کچھ تو کھلم کھلا اور برملا دو قومی نظریہ کا مذاق اڑانے لگے اور کچھ بظاہر منافقانہ طور پر دو قومی نظریہ کی حمایت کرتے تھے لیکن دراصل وہ بھی اسی گروہ کے ہمراہ تھے۔

ایک رات شب کے اندھیرے میں زور زور سے گھر کی کال بل چیخی چنگھاڑی کہ علی سفیان گاؤن پہن کر تیزی سے خواب گاہ سے نکلے مگر طاہرہ باجی بھی ساتھ ساتھ پہنچیں۔ برآمدہ میں دیکھا چند مسکین قسم کے مقامی ہم وطن موجود تھے حسب معمول علی سفیان دروازہ کھولنے لگے تو طاہرہ باجی نے انھیں روکا کیونکہ اس بائیس تئیس سال میں ایسے ہزارہا واقعات قتل کے ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ علی سفیان نہتے بھی تھے جھپٹ کر طاہرہ باجی پستول لے آئیں اور علی سفیان کی جیب میں ڈال دیا اور دروازہ خود بڑھ کر کھولا اور اس قدر رات گئے ان کے آنے کا سبب بھی خود ہی دریافت کیا تو ان میں سے ایک نے کہا۔

"جناب یہاں لوگوں کے قتل کے منصوبے بن رہے ہیں ہم آپ کو خبردار کرنے آئے ہیں کیونکہ آپ نے فلاں فلاں پرچم کو اپنے مکان اور دفتر پر نہیں لہرایا ہے۔ بہتر ہے اسی رات آپ یہاں سے نکل جائیں۔"

طاہرہ باجی سہم گئیں ان کی زندگی میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا کہ انھیں کے ہم وطن ان کی جانوں کے درپے تھے اور ان کا قصور سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ وہ بنگلہ کے باہر پیدا ہوئے تھے۔ ان کی مادری زبان بنگلہ نہ تھی، انھوں نے تحریک پاکستان کے لئے تن من دھن سے

کام کیا تھا ۔ آدھا بنگلہ یہ بات جانتا تھا لیکن آج وہ تمام جاننے اور ماننے والے بدل چکے تھے ان کی نگاہیں بدل چکی تھیں۔ ان کے دل بدل چکے تھے، وہ زمین و آسمان بدل چکے تھے جنہیں اپنے خون دل سے انھوں نے بنایا تھا۔ وہ زمین پاؤں تلے سے کھسک رہی تھی اور وہ آسمان جو ان پر سایہ فگن تھا۔ اب خون آشام بادلوں سے ڈھکتا جارہا تھا۔ وہ لوگ چلے گئے تو دونوں میاں بیوی گہری فکر میں ڈوب گئے۔ انھوں نے سوچنا شروع کیا کہ کیا ہماری ساری قوم ایک مرتبہ پھر تاریخ کے ایک اہم موڑ پر آکھڑی ہوئی ہے۔ کیا پھر ایک بار اس برصغیر کی تاریخ میں کوئی اہم تبدیلی کی جائے گی۔ علی سفیان نے پستول نکال کر میز پر اچھال دیا اور اسی لمحے طاہرہ باجی سے بولے "یہ پستول بیکار ہے۔"

"کیوں؟" طاہرہ باجی نے پوچھ لیا۔

"میں نے آج تک کوئی اسلحہ نہیں خریدا۔۔۔ یہ تو بچوں کا کھلونا ہے ۔۔۔ ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ یہ وطن ہمارا ہے اسے ہم نے بنایا ہے یہاں سب اپنے ہی بھائی بند بستے ہیں اپنوں میں اسلحہ کی کیا ضرورت، یہ تو محض درندوں کو ڈرانے کے لئے رکھا تھا۔"

طاہرہ باجی کو ابھی تک اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کے ہم وطن ان کی جان کے لاگو ہو رہے ہیں۔ پھر بھی انھوں نے فون اٹھایا۔ علی سفیان نے پوچھا! بھی کہ کسے فون کر رہی ہو لیکن جواب دیئے بغیر نمبر ڈائل کرکے جب طاہرہ باجی نے مشرقی پاکستان کے اس وقت کے سب سے بڑے قائد اور اس تحریک کے رہنما کے بارے میں پوچھا تو جواب ملا کہ وہ اس وقت موجود نہیں ہیں۔ طاہرہ باجی نے چند دوسرے سرکردہ رہنماؤں سے مدد مانگنے کی غرض سے فون کیے لیکن ہر صدا صدا بصحرا، ہر ایک نے معذرت کی یا بہانے کیے۔ طاہرہ باجی نڈھال ہو کر علی سفیان کے برابر ہی صوفے پر گر پڑیں۔ علی سفیان طنزیہ ہنسی ہنس کر بولے ۔

"تو یہ ہے ہمارا وطن پاکستان"۔
لیکن میں نہیں مان سکتی۔
علی سفیان نے کہا۔
"مجھے ان لوگوں کے خلوص پر بھروسہ ہے جو ابھی ابھی ہمیں خبردار کر گئے ہیں"۔
"لیکن یہ بھی سازش ہو سکتی ہے" طاہرہ باجی نے کہا۔
خیر آگے کے لئے سوچو" علی سفیان نے کہا۔
آگے ــــ آگے کیا کوئی اور حد باقی ہے۔ یہی تو ہماری سرحد ہے اس سرحد کے بعد غیر ملکوں کی سرزمینیں واقع ہیں"۔
"تم ٹھیک کہتی ہو ــــ مگر مغربی پاکستان"۔
"علی سفیان" طاہرہ باجی نے کہا "اگر مشرقی پاکستان میں پاکستان نہیں ہے تو پھر مغربی میں کہاں ہوگا۔ اگر مشرقی پاکستان میں بنگلہ دیش موجود ہے تو پھر مغربی پاکستان میں سندھ، پنجاب سرحد اور بلوچستان واقع ہیں، پاکستان کہاں ہے، یہاں نہیں ہے تو وہاں بھی نہیں ہے اور اور اگر کہیں نہیں ہے تو ہم کون ہیں کیا ہیں اور یہاں کیوں آئے ہیں ــــ ہمارے آباء اجداد بھی کسی سرزمین پہ آٹھ نو سو سال رہ چکے ہیں، ہم نے اپنی زبان، اپنی ثقافت اور اپنی سرزمین کی قربانی پاکستان کے لئے دی یا بنگلہ دیش، پنجاب دیش، سندھ دیش، بلوچی دیش، اور پٹھان دیش کے لئے دی تھی ــــ یہ، یہ سب کیا ہے علی سفیان ہم نے کسی تحریک میں کام کیا تھا، اپنا لہو دیا تھا، اپنا تن من دھن لگایا تھا آخر کس لئے؟"
علی سفیان نے کہا۔ "اب تاریخ کی رو بہت آگے بڑھ چکی ہے ــــ ہم اس کو لوٹا نہیں سکتے طاہرہ: ہمیں اپنے بچاؤ کے لئے جلد ہی کچھ فیصلہ کرنا پڑے گا ورنہ ان کے فیصلے سے سمجھوتہ کرنا

پڑے گا۔ اور وہ اپنا فیصلہ سنا چکے ہیں۔"

طاہرہ باجی کی زندگی میں اس سے زیادہ فیصلہ کن لمحہ کبھی نہیں آیا تھا لیکن انھوں نے بڑے سے بڑے صبر آزما حالات میں بھی حوصلہ نہ ہارا آج نہ معلوم کیوں ان کو ڈر لگ رہا تھا۔ ایک طرف اپنی اور خاندان کی جان کا معاملہ تھا اور دوسری طرف وطن ـــــ اور وطن کا جہاز طغیانی میں ہچکولے کھا رہا تھا کوئی اسے سنبھالنے والا نہ تھا۔

طاہرہ باجی علی سفیان کو کشمکش میں چھوڑ کر اپنی خواب گاہ میں آگئیں لیکن لیٹنے کے بجائے ٹہلنا شروع کر دیا پھر معاً اپنی بچی کے کمرے میں جھانکا۔ سولہ سترہ سالہ لڑکی غافل سو رہی تھی لڑکے کے کمرے میں دیکھا تو بیس سالہ نوجوان کس مزے کی نیند سو رہا تھا۔ طاہرہ باجی نے سوچا وہ ایک عورت ہی نہیں ماں بھی ہیں اور نسرین اور عرفان کے لئے انھیں کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا پڑے گا وہ پھر علی سفیان کے کمرے میں آگئیں لیکن دروازہ کھلا ہوا تھا اور علی سفیان موجود نہیں تھے۔ ادھر ادھر دیکھا۔ ابھی صورت حال پر غور کر رہی تھیں کہ گیراج سے گاڑی نکالنے کی آواز آئی اور نیچے پہریدار سے علی سفیان نے کہا۔

"دیکھو میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں گھر کی اچھی طرح حفاظت کرنا، میں ایک گھنٹے میں آجاؤں گا۔" طاہرہ باجی سمجھ گئیں کہ علی سفیان جب کوئی فیصلہ کرلیں تو وہ اٹل ہوتا ہے وہ ضرور کسی اہم مشن پر روانہ ہوئے ہوں گے۔ علی سفیان کے بغیر یہ گھر ـــ تنہا اور اکیلا گھر ـــ آج تک طاہرہ باجی کو کبھی ڈر نہیں لگا تھا لیکن آج اس وقت تو اپنے سائے سے بھی ڈر لگ رہا تھا۔

اسی طرح صبح ہوگئی لیکن علی سفیان نہیں لوٹے۔ البتہ ٹیلی فون پر کسی نے یہ اطلاع دی کہ انھیں نامعلوم افراد نے شہید کر دیا ہے۔ لاش لائی گئی، تجہیز وتکفین ہوئی لیکن طاہرہ باجی

کی آنکھ سے ایک بھی آنسو نہ ٹپکا۔ چند روز اسی طرح گزرے کہ کہیں آگ لگی، کہیں قتل و غارت کا بازار گرم ہوا، کہیں گولیاں چلیں، مکانات زندہ مکینوں سمیت جلا ڈالے گئے لیکن طاہرہ باجی ذرا نہ پسیجیں۔ کتنا کتنا لوگوں نے سمجھایا کہ اب تم کچھ عرصہ کے لئے مغربی پاکستان چلی جاؤ لیکن وہ سنی اَن سنی کر جاتیں بالآخر وہ ہو کر رہا جو ہونا تھا یعنی رات گئے کسی نے آکر اطلاع دی کہ مکان پر حملہ ہونے والا ہے چند دوست نما دشمن ظاہر ہوئے اور تینوں کو زبردستی اپنے گھر پناہ کے بہانے لے گئے وہیں سے طاہرہ باجی نے دیکھا کہ اُن کے مکان پر پاکستان کی مخالف پارٹی کا جھنڈا لہرا رہا ہے یہ دیکھ کر تو ان پر جیسے ہسٹریائی دورہ سا پڑ گیا ”نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا“ وہ چیختی چلاتی نکل کھڑی ہوئیں اور ان کے پیچھے ان کے دونوں بچے بھی دوڑے تاکہ انھیں روک سکیں۔ لیکن وہ تو دیکھتے دیکھتے بجلی کی طرح سڑک پار کر کے پھرتی سے مکان میں داخل ہو کر زینہ چڑھ کر چھت پر پہنچ گئیں اور مخالف پارٹی کا جھنڈا نوچ کر جوتیوں سے روند ڈالا۔ عرفان گو کہ وہاں پہنچ گیا اور ماں کو دونوں بازوؤں میں لے کر نیچے آنا ہی چاہتا تھا کہ معاً دو گولیاں چلیں علی عرفان ماں کو بازوؤں میں لئے ہوئے زینے کے اوپر سے لڑھکتا ہوا نیچے آرہا۔ پھر تو بلوۂ عام ہو گیا ”خوب زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے لگے اور نامعلوم کیا ہوا جب طاہرہ باجی کو ہوش آیا تو وہ ملٹری کیمپ کے ہسپتال میں تھیں۔ علی عرفان اللہ کو پیارا ہو چکا تھا نسرین لاپتہ تھی اور خود طاہرہ باجی ایک پاؤں سے محروم تھیں۔

میں نے طاہرہ باجی کو کراچی کے زنانے اسکول میں بیساکھیوں کے سہارے چلتے ہوئے دیکھا تو ٹھٹھک گیا۔

”آپ، آپ طاہرہ باجی، یہاں“۔۔۔؟

انھوں نے عینک کے شیشے صاف کئے اور خوب اچھی طرح غور سے مجھے دیکھ کر کہا۔

"ہاں یہ میں ہوں بھیا۔"

میں اس سے زیادہ طاہرہ باجی سے اور کیا سنتا میں نے سر جھکا لیا، پھر خود گردن اٹھائی تو دیکھا طاہرہ باجی کے چہرے پر سے ایک چوتھائی صدی کی رَہ گزر چکی تھی لیکن یوں لگتا تھا کہ صدیاں گذر گئیں، قرن کے قرن گذر گئے۔ مجھے معلوم نہیں میں نے طاہرہ باجی سے کیا کہا کیا سنا — کچھ روز کے بعد ان کے پتہ پر انھیں ڈھونڈتا ہوا پہنچا ایک ٹوٹے پھوٹے کوارٹر میں ایک چارپائی پڑی تھی۔ طاہرہ باجی نے مجھے بڑے پیار سے اسی پر بٹھایا اور حال احوال پوچھنا شروع کیا۔ جب میں نے اپنی ساری کتھا سنانے کے بعد ان سے درخواست کی آپ میرے ہمراہ چل کر میرے ساتھ غریب خانے پر رہیں تو طاہرہ باجی صاف ٹال گئیں اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے پھر یہی کہا۔ طاہرہ باجی چپ ہو گئیں لیکن کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر بعد دوسرا موضوع چھیڑ دیا میں نے اس موضوع کو نمٹانے کے بعد پھر یہی عرضداشت دُہرائی تو بولیں۔

"دُلّن میاں، کیا کوئی ایسا ٹھکانہ واقعی ہے جہاں مجھے حقیقی مسکن مل سکتا ہے؟"

اس بات کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ کافی دیر بھی ہو گئی تھی لہٰذا میں خاموشی سے اٹھا، جانا چاہتا تھا کہ پھر بولیں:۔

"بھیا، بُرا نہ ماننا، میرا ٹھکانہ کہیں نہ کہیں تو نکل ہی آئے گا، بتاؤ کہ یہاں کہیں اس مہاجر کا بھی کوئی ٹھکانہ ہے جسے پاکستان کہتے ہیں؟"

ظاہر ہے طاہرہ باجی کا یہ سوال مجھ سے نہیں تھا، پھر بھلا کس سے تھا؟ یہ بھی سوچنا اب میرا کام نہیں ہے۔ میں واپس ہو رہا تھا تو قریب ہی کہیں مجلس امام حسینؑ برپا تھی، ذاکر امام مظلوم کے مصائب بیان کر رکھا تھا "آپ کا ششماہا بچہ پیاس سے جاں بلب تھا، فوج اشقیا

سے مخاطب ہو کر آپؑ نے فرمایا کہ اے فوجِ یزید اگر تیرے خیال میں، میں بچے کے بہانے خود پانی طلب کر رہا ہوں تو لو اسے جلتی ہوئی ریتی پر لٹائے دیتا ہوں تم میں جو کوئی صاحب اولاد ہو اسے آ کر پانی پلا دے ــــ وہاں تہلکہ مچ گیا لوگ رونے لگے۔ ظالموں میں مظلومیت پر ترس کھانے والے بھی تھے۔ پسرِ سعد بولا، او حرملہ ادھر آ، کلامِ حسینؑ کو قطع کر دے، تیر سہ شعبہ اور چھ ماہ کا بچہ، ہاتھوں پر منقلب ہو گیا، بازوئے امام زخمی ہوا۔ آپؑ نے فوراً تیر کھینچا حلق علی اصغر سے لہو جاری ہوا، چلّو میں لے کر زمین پر پھینکنا چاہا تو زمین نے صدا دی حضرت اگر یہ لہو مجھ پر گرا تو حشر تک ایک دانہ نہ اُگے گا، آسمان کی طرف اچھالنا چاہا وہاں سے آواز آئی کہ قیامت تک بارش نہ ہوگی، اب کیا تھا، آپ نے فوراً وہ خون ریش مبارک پر ملتے ہوئے فرمایا۔

انکار آسماں کو ہے راضی زمیں نہیں
اصغر تمہارے خوں کا ٹھکانہ کہیں نہیں

اور میں گردن جھکا کر اسی طرح گزرتا چلا جا رہا تھا، دل میں یہ کہتا ہوا کہ سچ ہے، ٹھکانہ کہیں نہیں!

سمور دار کوٹ

ہوا بھی یہی کہ اڈے پر اب جو رکشے آنا شروع ہوئے جس ڈرائیور کو دیکھو وہی بھڑکیلے
اور چمکدار اصلی اون کے سوئٹر جھاڑے اونچی بنا اکڑا ہوا اپنی نشست پر جما ہوا ہے،
ہر رکشے والا ایک سے ایک اچھا سوئٹر اور ایک سے ایک بڑھیا گرم پتلون کسے جیبوں میں ہاتھ
ٹھونس کر رکشے کی سیٹ سے اٹھ کر یوں سڑک پر اینڈتا ہوا چلتا ہے جیسے کوئی مغل شہزادہ
شالامار میں گلگشت کے لئے نکلا ہو ـــــ بھئی حد ہو گئی۔ اب تو بے حیائی کی، کہ اچھی بھلی
اونچے اونچے گھرانوں کی بیگمات اور بہو بیٹیاں، بڑے ٹھسے سے اپنی لمبی لمبی کاروں سے
اتریں اور سیدھی ـــــ دو روپے، چار روپے سوئٹروں پر ٹڈی کی طرح ٹوٹتیں ـــــ اسے یاد آیا
کہ آج دوپہر جب رکشا روک کر دو چار نوالے زہر مار کرنے کو وہ اپنے گھر گیا، تو گھر کی بھنگن کیا
بڑھیا سوئٹر پہنے ہوئے جھاڑو دے رہی تھی کہ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اور اس کی بیوی نے کتنی
بے بسی سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا گویا ننگا ہوں میں کہہ رہی ہو کہ دیکھو تو تم رکشا

ڈرائیور سے تو یہ بھنگن ہی بھلی کہ جسم کو گرم رکھنے کے لئے اصلی اون تو رکھتی ہے۔ لیکن اس نے گویا ہر بات کو نظر انداز کر دیا تو بیوی خود ہی منھ پھوڑ کر بولی

رشیداں (بھنگن کی طرف اشارہ کر کے) ساڑھے تین روپے میں کیسا بڑھیا سوئٹر لائی ہے ــــ سنا ہے شہر میں جگہ جگہ سوئٹر بک رہے ہیں، روپے دو روپے سے لے کر دس بارہ روپے تک ــــ" لیکن رفیق پر اس اطلاع کا جب کوئی اثر نہ ہوا تو بیوی نے دوسرا حربہ اختیار کیا۔

"جاڑے کی ٹھنڈی ہوا میں اگر خدانخواستہ بیمار پڑ گئے تو کیا ہوگا، اپنے ہی لئے ایک اچھا سا سوئٹر خرید لو۔"

تو رفیق نے یوں محسوس کیا کہ اس کی بیوی اس سے یہ کہہ رہی ہے کہ مجھے یہ سوئٹر بہت پسند ہے ان کے نرم نرم اون میں سے کیسی پیاری پیاری گرم محبت چھنتی ہے ــــ ہائے مجھے اس کے رنگ تو کھائے جا رہے ہیں۔ رفیقے کچھ نہیں تو مجھے آدھے درجن سوئٹر لا دے تو میں تیری چھمک چھلو بن کر ساری بستی کو دکھاتی پھروں گی کہ دیکھ لو کیا چاہنے والا ملا ہے مجھے میرا خصم ــــ"

اس نے نہایت اطمینان سے پانی پیا، آستین سے منہ پونچھا، جیب سے کے ٹو کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگائی اور دھیر سے کہا۔

"میں نہیں لاؤں گا یہ سوئٹر ــــ" اسی وقت رشیداں بھنگن گرم سوئٹر میں چمکتی ہوئی گزری اور باہر نکل گئی۔ بیوی کی نگاہیں پھیلیں، سکڑیں اور پھر ویران ہو گئیں، سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے اور ایک ہاتھ سے بیوی کے دوپٹے کے آنچل کو مسلتے ہوئے اس نے کہا:

"پوچھ کیوں نہیں لاؤں گا ــ؟" لیکن مکھاں نے کچھ نہیں پوچھا، اس کی بڑی بڑی

آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح ویرانی تھی، اداسی تھی جیسے نگاہیں چپکے ہی چپکے کہہ رہی ہوں مجھے کیا پڑی ہے کچھ پوچھنے کی ــــ پر یہ ضرور ہے کہ تو میری تمام حسرتوں کا جنازہ نکال دے گا رفیقے ــــ تو بڑا ظالم ہے۔ لیکن خود ہی بولا۔

"یہ بکھاں یہ جو سوئٹر ہیں نا، یہ انگریزوں اور ان کی میموں کے پہنے ہوئے ہیں، پتہ نہیں کہ مُردوں کے ہیں کہ مریضوں کے، ارے بھئی یہ تو وہ جلا ڈالتے تھے تھے، جب انھیں پتہ چلا کہ جلانے سے تو کہیں اچھا ہے کہ کسی کو دیدیں تو انھوں نے یہاں پٹک دئے اب تو ہی بتا کیسے لا دوں یہ سوئٹر تیرے لئے میں۔"

رفیق نے ایک اور کش کھینچا اور بولا:

خدا کی قسم تو تو گھر پر رہتی ہے، شہر میں جانے کیا ہوا ہے کہ جسے دیکھو یہی سوئٹر پہنے گھوم رہا ہے۔ بڑے بڑے سوٹ بوٹ والے بابو لوگ خرید خرید کر پہن رہے ہیں۔ ابھی پرسوں دو دوست میرے رکشے میں بیٹھ گئے، ایک نے دوسرے کا سوئٹر دیکھ کر کہا۔ "بڑا بڑھیا ہے ــــ دوسرے نے جھٹ کہا کہ ہاں میرے انکل نے ولایت سے بھیجا ہے اور یہ تمہارا سوئٹر؟"

تو اس نے کہا "یہ بھی تمہارے انکل نے مجھے بھیجا ہے۔" اور پھر دونوں قہقہے لگا کر ہنسنے لگے اور جانتی ہے بکھاں میرا دل کونسا گانا گا رہا تھا اس وخت (وقت) ــــ "میرا جوتا ہے جاپانی۔ یہ پتلون انگلستانی سر پہ لال ٹوپی روسی پھر بھی دل ہے پاکستانی" رکشا اسٹارٹ کر کے اب جو وہ چلنے لگا تو اس نے چلتے چلتے دیکھ لیا کہ اس کے پڑوس میں رہنے والا اسکول ماسٹر ایک بھاری بقچی سائیکل پر لادے ہوئے چلا آرہا ہے اس نے یقین کر لیا کہ اس میں یہی ولایتی گرم کپڑے بندھے ہیں۔ چاچا فقیرے کس شان سے جاڑے میں ردی کی نئی صدری پہن کر

ٹانگہ بانکتا تھا۔ اب جو فیقرے پر اس کی نظر پڑی تو وہاں صدری کے بجائے ولائتی سوئٹر اور شلوار کی جگہ گرم پتلون، رکشا فیقرے کے ٹانگے کے پاس ذرا دھیما کر کے رفیق مسکراتے ہوئے بولا :

"چاچا اب کوئی بڑھیا سا انگریزی نام بھی رکھ لے اور چاچی کو سایہ پہنا کر چرچ لے جایا کر خدا کی قسم تو تو بالکل فرنگی بن گیا ۔"

اور پھر ایک دم رکشے کی رفتار تیز کر دی اور دور جا کر مڑ کر دیکھا تو سپید داڑھی میں فیقرے مسکرا رہا تھا۔ اور اب جب سے وہ اڈے پر آ کر کھڑا ہوا تھا جس رکشے والے کو دیکھو ولایتی سوئٹر اور ولایتی کپڑے جھاڑے ہوئے ٹھاٹ سے رکشے پر بیٹھا تھا۔ سواریوں کا ناتا بندھا ہوا تھا کئی بار اسے بھی قریب قریب کی سواریاں ملیں اور وہ انھیں ان کی منزلِ مقصود پر چھوڑ چھوڑ آیا اور پھر اتفاق سے اسی مال کے اڈے پر پہنچ پہنچ گیا ۔۔۔ کچھ تو سرِ شام ہی سے سردی بڑھ جاتی تھی، ایک چھینٹا جو پانی کا پڑ گیا تو بس کچھ نہ پوچھو سردی اور بھی چمک گئی۔ کچھ من چلے رکشے والوں نے اڈے پہ لکڑیاں جلا دیں اور تاپنے لگے۔ رفیق بھی سمیاتا ہوا آگ کے پاس پہنچا تو ستار بولا۔

"رفیقے تیرا تو جواب نہیں ہے۔ ارے باؤلے مر جائے گا سردی میں، کیوں ضد کر رہا ہے کھ مکھواہ (خواہ مخواہ) کی ۔۔۔ دیکھ لے تیرے سارے سنگی ساتھی پہنے ہیں یہ گرما گرم ترتراتا ہوا ولایتی مال کہ نہیں۔"

دوسرے نے کہا :

اور جو تو یہ کہتا ہے کہ مُردوں کا مال ہے تو یہ غلط ہے، یہ پرانا مال ہے جسے وہاں کوئی نہیں پوچھتا ہے، پرانا ہو جاتا ہے تو وہ یہاں آ جاتا ہے

تیسرے نے قدرے فحش انداز میں کہا :

"میری جان اگر ولایتی عورتوں نے اسے پہنا ہے تو ان کا پسینہ بھی تو ولایتی سینٹ ہے ـــــ یہاں سے بابو لوگ ولایت جاکر تو ایسے مال کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔

رفیق نے قمیص اٹھا کر دکھائی کہ وہ بنیان پر ایک پرانے دیسی اون کا سوئٹر پہنے ہے تو تمام رکشے والے ہنسنے لگے۔ اسی وقت اسے سواریاں مل گئیں۔ عجیب اتفاق ہے گلبرگ جاتے ہوئے ایک سواری نے دوسری سے کہا۔

"کاروبار کیسا چل رہا ہے؟"

دوسری نے جواب دیا "یہ جو بازار میں ولایتی مال آگیا ہے اس نے تو بیڑا غرق کر دیا۔ دیسی اون تو اب کوئی پوچھتا ہی نہیں، رہا ولایتی سو سستے ولایتی سوئٹروں کے سامنے کون اسے پوچھے گا۔"

سواریاں اتار کر جب وہ اڈے پر آ رہا تھا تو اس نے سوچا کہ سستا مال دوسرے ملک سے منگا کر اپنے ملک کے کاروبار پر برا اثر پڑتا ہے ـــــ پر ـــــ پر ہمارے ملک کے کاروباری لوگ منہ مانگے دام لے کر اور اپنے ہی دیس کی بنی ہوئی معمولی چیز کو مہنگا کر کے جو بیچتے ہیں تو کیا ولایتی سستا مال منگا کر بیچنے سے ان کے جرم کی انھیں سزا نہیں ملتی؟ اور کیا یہ سزا انھیں ملنا نہیں چاہیے؟ ـــــ ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ دوسری سواریوں نے اسے کرشن نگر چلنے کے لئے کہا۔ اپنی باتوں کے سوچنے میں وہ کچھ ایسا مگن تھا کہ ان کی کھسر پھسر پر اس نے مطلق دھیان نہیں دیا۔ سواریاں اتر گئیں اور کرشن نگر سے سکریٹریٹ تک وہ پہنچا ہوگا کہ ایک خاتون نے رکشا روک کر گڑھی شاہو کی طرف اسے ہانک دیا۔ راستے میں ایک جگہ دکان پر ٹھہر کر ایک موٹے تازے جھگڑالو شوہر کو ساتھ لیا اور منزل مقصود پر روانہ ہو گئی تو پشتو میں دونوں کی لڑائی اس کی سمجھ میں نہ آسکی۔ البتہ سوئٹر کے نام پر وہ ضرور چونک جاتا

تھا۔ اس سواری سے نجات پاکر وہ سیدھا گھر پہنچنا چاہتا تھا پہلا شو ختم ہونے والا تھا لیکن
ایک سواری اسے لنڈا بازار لے گئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے گرم کپڑوں، گرم سوئیٹروں
پتلونوں، اوورکوٹوں، کوٹوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیا۔ سمور دار کوٹوں پر تو نگاہ نہیں
ٹھہرتی تھی، چکنے اور لمبے روئیں اور قیمت ارزاں ــــــ وہ تو سواری کے ساتھ یونہی
وقت گزاری کے لئے دکان کے اندر چلا گیا تھا کہ دکاندار نے اس کے سامنے بھی کپڑوں
کا ڈھیر لگا دیا۔ جانے کیوں بلقیس کا سڈول جسم بار بار اس کے دماغ میں دھم سے پھاند پڑتا
اور وہ ہر لباس کو تصور ہی تصور میں اس پر زیب پاتا، سجاتا بناتا اور ہر ہر زاویے سے تصور
ہی تصور میں دیکھتا ــــــ ایک سمور دار کوٹ پر تو سچ مچ اس کا دل مچل گیا لیکن نہ جانے
کیوں ایک دم وہ جھجک کر کپڑوں سے پرے ہٹ گیا جیسے وہ کپڑے نہ ہوں، سانپ، بچھو
ہوں۔ جو سواری اس کے ہمراہ آئی تھی وہ ایک خوبصورت عورت تھی، پڑھی لکھی اور
تربیت یافتہ۔ رفیق کو اس طرح اچانک کپڑوں کے ڈھیر سے اٹھتے ہوئے دیکھ کر وہ پوچھ بیٹھی۔

"کیا بات؟ پسند نہیں آیا؟"

لیکن رفیق چپ چاپ ہو رہا، دوکاندار بلا کا آدمی تھا تاڑ گیا بولا: "یہاں تو بڑے بڑے
گھروں کے لوگ آکر مال لے جاتے ہیں۔"

عورت نے کہا:

"یہ تو ہر ملک میں فروخت ہوتا ہے۔ ہر ملک کی سرکار غریبوں کے لئے سستا
اور اچھا مال خریدتی ہے۔ اس میں کیا حرج ہے۔ جب ہم نیا مال مہنگے داموں نہیں خرید سکتے
تو زندہ رہنے کے لئے تن ڈھانکنا ہی پڑے گا۔"

دکاندار نے کہا:

"یہ تو ہم خرید کر بیچتے ہیں خیر — مگر وہ گندم جو ہمارے ہیٹ ہیں خیرات کی جاتی ہے —؟"

عورت نے کہا: "مگر ہم تو اسے بھی خریدتے ہیں۔"

رفیق نے جوش میں آکر کہا:

"کیا خیرات کا گندم ہماری سرکار خریدتی ہے — جو امداد کے طور پر ملتا ہے — وہ — وہ کیا ہے؟"

اور پھر خود بخود بارہ روپے میں سموردار کوٹ خرید کر سواری کو منزل مقصود پر پٹک کر رفیق تیزی سے گھر کی طرف بھاگا۔

گھر پہنچا تو بکھاں خوشی خوشی ہنڈیا چولہا کرکے دروازے پر کھڑی رفیق کی راہ تک رہی تھی۔ جاتے ہی رفیق نے کاغذ کا بنڈل بکھاں کی گود میں ڈالا اور اسے گود میں اٹھا کر چھوٹے سے میلے کچیلے آئینے کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا، بنڈل کھول کر کوٹ نکال کر اسے پہنا دیا اور محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ کر بولا

"اب کیسی لگ رہی ہے میری بکھاں رانی۔"

چاچا فقیرے کھنکھارتا ہوا اسی وقت گھر میں داخل ہوا اور روئی کی دو صدریاں پلنگ پر رکھتے ہوئے بولا۔

"بکھاں بیٹی روئی کا بھاؤ تو بہت تیز ہے، ایک ایک سیر روئی بھروا دی ہے میں نے — پر دیکھنا کیسے مزے سے کٹے گا جاڑا، تیری چاچی کی نگاہ کمزور ہو گئی ہے نہیں تو میں بھی صدری سلواتا۔"

فقیرے نے اپنی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ سفید سمور دار کوٹ میں ملبوس بکھاں جب

اس کی طرف مڑی تو ایک دم بوکھلا گیا، دھوکا کھا گیا، سمجھا کسی انگریزن کو سامنے لا کھڑا کر دیا ہو۔ پر جب اٹھلاتی ہوئی چال اور مسکراتے ہوئے چہرے پر شرم کے آثار جھلکے تو سفید داڑھی میں چاچا فیقرے مسکرایا۔ رفیق کو دیکھ کر بولا:

"کہو بھتیجے اب کسے چرخ پیچ رہے ہو ـــ اگر تم نے یہی کاروبار شروع کر دیا تو میاں تمہیں یہاں کوئی مسلمان نہیں ملے گا ـــ" رفیق نے جھینپ کر سدریاں اٹھالیں، صدری کی جھینٹ اٹھا کر بولا:

"بکھاں کس بھاؤ خریدی یہ دیسی جھلینٹ؟"

اور بکھاں سموردار ولایتی کوٹ میں ملبوس جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے بڑے ٹھسے سے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ رفیق کو یوں لگا جیسے اس نے بارہ روپے میں ولایتی گڑیا خریدلی ہے جس کی آنکھوں میں جوانی کا غرور اور چہرے پر مسرت و شادمانی کا نشہ دمک رہا ہے۔ اس نے دھیرے سے لب وا کیے اور قدرے حقارت آمیز لہجے میں کہا:

"چودہ آنے گز ـــ!"

آخری مورچہ

عطا محمد کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ چار سال کی عمر میں اس کے ماں باپ اللہ کو پیارے ہو گئے اور اُسے علاقے کے زمیندار پیر ثمر شاہ کے رحم و کرم پر ان کی حویلی پہنچا دیا گیا۔ پیر ثمر شاہ کو پہلی بار عطا محمد نے حویلی کے باہر احاطے میں کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے چاروں طرف کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، جن پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ پیر صاحب بڑے تن و توش کے آدمی تھے، لیکن ان کی مونچھیں سب سے زیادہ بارعب تھیں۔ بڑی بڑی سرخ غلّہ سی آنکھیں بھی چہرے پر نہایت درجہ خوفناک معلوم ہوتی تھیں۔ ان کی پگڑی طرہ سمیت سامنے میز پر دھری تھی اور حقہ کے کش کھینچ رہے تھے۔ ان کا ملازم جو ابھی عطا محمد کو لے کر یہاں پہنچا تھا، جھکا اور پیر صاحب کے پاؤں چوم کر بولا "شاہ جی تسی آپ ویکھ لو منڈا و ڈا سونڑاں اے۔" شاہ جی نے اسے سر سے پاؤں تک گھور کر کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور زوردار ہنکارا بھر کر حقہ پینے لگے۔ عطا محمد کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی رگوں میں دوڑتا ہوا

خون منجمد ہو رہا ہے جیسے قصائی بکری کو چھری کے نیچے لٹا کر بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر چھری چلا دیتا ہے۔ کچھ یہی مفہوم شاہ جی کی نگاہوں سے آشکار ہو رہا تھا۔ انھوں نے نظروں ہی نظروں میں پٹواری سے کچھ کہا۔ بوڑھا پٹواری جو ذرا فاصلہ پر کھڑا ہوا تھا اور کاغذات اس کے ہاتھوں میں کانپ رہے تھے۔ شاہ جی کے ادب کی وجہ سے کرسی پر بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ بولا "اراضی زمین نہری، پختہ پانچ مربعہ دین محمد ولد فقیر محمد ساکنہ......"

شاہ جی بولے "بس بس" اور عطا محمد کو قریب بلا کر اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر بولے "کی ناں ہے تیرا کاکا"

اور عطا محمد نے بہت کوشش کر کے زور لگا کر بولنے کی سعی کی لیکن یوں لگا جیسے زبان پر تالا پڑ گیا ہے، جو شخص اسے ساتھ لے کر یہاں آیا تھا قدرے فہمائشی انداز میں ڈانٹ کر بولا "دس کاکا، شاہ جی تاں تیرے پیو دے متر نیں"

شاہ جی نے مصنوعی رقت نمازی کرتے ہوئے کہا "متر نہیں کاکا، تیرا پیو تاں ساڈا بھرا سی" اور سب کی طرف داد خواہ ہو کر شاہ جی نے ایک بار پھر عطا محمد کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا "دس ناں کاکا کی ناں اے تیرا"

اس بار عطا محمد نے بہت زور لگایا تو زبان کا ٹانکا ٹوٹا۔ بھرائی ہوئی آواز میں اس نے کہا "عطا محمد" لیکن اس کے ساتھ ہی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بھی جاری ہو گیا۔

بوڑھے پٹواری نے چشمہ درست کرتے ہوئے کاغذات پر نگاہ دوڑائی اور اثبات میں سر ہلا کر کہا "عطا محمد ولد دین محمد ولد فقیر محمد ساکنہ......"

شاہ جی نے ہاتھ کے اشارے سے پٹواری کو خاموش رہنے کو کہا اور کسی ملازم کو حکم دیا "کاکے نوں حویلی وچ پہنچا دے"

کوئی شخص اسے حویلی کے دروازے تک چھوڑ آیا۔ عطا محمد ڈرتا ہوا سہمتا ہوا حویلی میں داخل ہوا۔ یہاں ایک سے ایک اللہ کی مخلوق پڑی ہوئی ہے۔ کنیزوں اور غلاموں کی فوج ظفر موج کے جھرمٹ میں شاہ جی کی بیگمات، بہنیں، بیٹیاں موجود تھیں لیکن ہر ایک چہرے میں اسے ایک انجانے خوف کا عکس نظر آیا اور بہت جلد اس پر یہ بات کھل گئی کہ شاہ جی کی شخصیت کا اصل روپ حویلی کے اندر کھلتا ہے، جہاں نوکر چاکر، گھر والے، بیوی بچے سب کے سب ایک ہی ڈنڈے سے ہانکے جاتے ہیں۔ شاہ جی حویلی میں داخل ہوتے ہیں تو لگتا ہے کہ معصوم مویشیوں کے ریوڑ میں شیر گھس آیا ہے۔ ہر چہرے میں اسی سہم اور اسی خوف کی پرچھائیاں موجود تھیں۔ ہر دل میں اسی ڈر کی دھڑکن سمائی ہوئی تھی۔

عطا محمد نے چار سال کی عمر سے لے کر اٹھارہ سال تک کی عمر اسی خوفناک ماحول میں گزاری، صبح چار بجے سے لے کر رات کے گیارہ بارہ بجے تک وہ کام میں خچر کی طرح جتا رہتا اور کولھو کے بیل کی طرح گھومتا رہتا۔ تھک کر چور چور ہو جاتا تو گر کر سو جاتا۔ سال میں ایک آدھ بار عید بقر عید پر اسے نئے کپڑوں کا جوڑا مل جاتا تو مل جاتا ورنہ پھٹے پرانے میلے کچیلے بدبودار کپڑوں میں اس کی شخصیت ایسی مسخ ہو کر رہ گئی تھی کہ اسے اپنی کھال اور چکٹ کپڑوں میں ذرا بھی امتیاز نہ ہوتا۔ رات دن ہر طرف سے "عطا محمد، عطا محمد" کی صدائیں بلند رہتیں۔ کبھی باہر کے کاموں میں دوڑایا جاتا، کبھی گھوڑوں کے اصطبل میں لگایا جاتا۔ کبھی بھینسوں کے گوبر سے سابقہ پڑتا۔ شاہ جی کی گاڑیوں کی صفائی میں پٹرول اور گریس کی کالک سے رشتہ قائم ہوتا۔ کبھی گھر کا خانساماں باورچی خانے میں اپنے چھوٹے موٹے کاموں میں اسے لگائے رکھتا، کبھی شاہ جی کے ہاتھ جیسے جسم کو دبانا پڑتا۔ غرض ایسی جان کھپائی کے بعد دو وقت روکھی سوکھی روٹی جڑتی تھی۔ کبھی پیاز سے روٹی کھالی، کبھی مولی سے

کبھی دال یا چٹنی سے۔ یوں گھر میں کیا نہیں پکتا تھا۔ ایک سے ایک نعمتیں پکتی تھیں۔ مرغیاں بٹیریں، تیتر، مرغابیاں آئے دن پکائی جاتی تھیں۔ پلاؤ، بریانی، قورمے بنتے تھے لیکن یہ سب چیزیں شاہ جی کے لئے خاص الخاص جیسے آسمان سے اترتی تھیں کوئی دوسرا انھیں چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر کسی کا سایہ بھی پڑ جائے تو غضب ہو جاتا سارا گھر سر پر اٹھا لیتے تھے شاہ جی وہ خود کو اللہ اور نبی کے بعد سب سے زیادہ مقدس سمجھتے تھے۔ بڑے بڑے لوگ ان کے پاؤں چھوتے تھے انھیں پیر کہتے تھے اور شاہ جی کو جیتے جی کسی درگاہ یا آستانہ کی طرح مقدس سمجھ کر سجدے کرتے تھے۔ اتنے بڑے آدمی کے لئے اتنے لوگ ہر وقت جان کھپاتے اور تن من وارتے تھے، پھر بھی شاہ جی کسی سے خوش ہو کر بات نہ کرتے۔ ہنس کر بولنے کا وہ واحد لمحہ جو پہلے پہل اسے شاہ جی سے ملا تھا اسے پھر میسر نہ آیا۔ ہمیشہ خشمگیں نگاہوں سے اسے شاہ جی دیکھتے، ڈانٹ کر حکم دیتے، صلواتیں سناتے اور مرضی کے خلاف ذرا کوئی کام ہو جائے تو لاتوں اور گھونسوں سے اس کی خاطر کرتے اور جب درد سے بلبلا کر وہ روتا تو رونے بھی نہ دیتے کہ آواز بلند ہوگی تو بدنامی ہوگی۔

اللہ جوائی جس کی گدرائی ہوئی سانولی سلونی جوانی پر ہر لحظہ شاہ کی نگاہ رہتی تھی اور جسے بار بار باہر کی بیٹھک میں طلب کیا جاتا تھا۔ رات گئے تک جس سے کمر کولھے شاہ جی دبواتے تھے۔ ایک روز اسے اکیلا برتن مانجھتے ہوئے دیکھ کر چپکے سے بولی "تو تو نرا بیوقوف ہے" اس نے پوچھا کہ اس نے کیا بیوقوفی کی تو وہ بولی "ارے تو یہاں سے بھاگ کیوں نہیں جاتا؟ ساری زندگی اسی جگہ گزار دے گا۔ جوان سے بوڑھا ہو جائے گا اور پھر مر کر چلا جائے گا"

واقعی اس نے اس پہلو پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا شاید کیا بھی ہوگا تو ڈر گیا ہوگا کہ شاہ جی کے لمبے لمبے ہاتھ تو ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ گاؤں گاؤں، بستی بستی اُن کے آدمی موجود ہیں۔

اگر پکڑ کر پھر یہیں لے آئے تو کیا ہوگا۔ پھر پولیس بھی تو شاہ جی کے اشاروں پہ چلتی تھی مجال ہے کہ شاہ جی کو ناراض کر کے کوئی پولیس والا خوش رہ سکے۔

کچھ دنوں کے بعد اللہ جوائی نے موقع دیکھ کر پھر اس کی ہمت بندھائی۔ اس بار اس نے کہا "جب تو اس حویلی کو قید خانہ سمجھتی ہے تو خود کیوں نہیں نکل جاتی؟"

اللہ جوائی اس سوال کے جواب میں رو دی اور آنسو پونچھ کر بولی "میں کہاں جاؤں، میرا تو ساری دنیا میں کوئی نہیں ہے اور یہ دنیا بھیڑیوں کی دنیا ہے۔ یہاں اندر یا باہر ہر جگہ بھوکے بھیڑیوں کا راج ہے۔ بہت سے بھیڑیوں سے اپنے جسم کو بچوانے سے اچھا ہے کہ کسی ایک کے حوالہ کر دو۔"

عطا محمد نے اس مرتبہ ہمت کی کہ وہ نکل بھاگے گا۔ اللہ جوائی نے اسے بھاگنے کی ترکیب بھی بتا دی اور رات ہی رات اُسے نکال دیا۔

عطا محمد کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ دل دھڑک رہا تھا اور اس قدر زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ یوں لگتا تھا کہ اچھل کر حلق کے راستے باہر نکل جائے گا۔ مارے ڈر کے بار بار لوٹ جانے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اللہ جوائی نے جو راستہ اسے دکھایا تھا وہی آزادی کا راستہ تھا۔ نئی زندگی کے خیال ہی سے اس کے اندر نئے نئے خیالات جاگ رہے تھے اور وہ بار بار یہ بھی سوچ رہا تھا کہ جائے تو کہاں جائے، کہاں رہے کیا کرے، کیسے روٹی ملے گی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ وہ بھی ٹھاٹ باٹ سے رہے گا۔ شاہ جی کی طرح مزے سے حکومت کرے گا مگر پھر وہی سوال کہ کہاں کرے گا کیسے کرے گا۔

اسی اُدھیڑ بُن میں وہ چلا جا رہا تھا کہ عین باغ کے دروازے پر کچھ آہٹ ہوئی لیکن

وہ روش میں دبک رہا۔ دو مسافر اس کے قریب سے گزر گئے مزے سے باتیں کرتے ہوئے کسی فلم کا ذکر کرتے ہوئے، لیکن اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ کتے بھونکنے لگے۔ عطامحمد انجانے خوف سے اُٹھ کر بے تحاشا بھاگنے لگا۔ کتے اس کے پیچھے بھاگنے لگے۔ وہ ٹھوکر لگنے سے گر پڑا۔ کتوں نے اسے آلیا۔ پولیس کے سپاہیوں نے اسے دبوچ لیا۔ اور صبح صبح شاہ جی کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ شاہ جی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ چمڑے کے تازیانے سے اس بُری طرح اُسے مارا کہ جگہ جگہ سے اس کی کھال پھٹ گئی خون بہنے لگا، پیٹھ کا گوشت اُدھڑ گیا۔ وہ بالکل ادھ موا ہو گیا۔ بہت رویا پیٹا، چیخا چلایا لیکن کوئی اس کی مدد کو نہ آیا۔ بالآخر اس نے محسوس کیا کہ مار کھانے سے پہلے کا عطامحمد جس قدر بزدل اور کمزور تھا، اس مار کے بعد اسی قدر شیر دل اور قوی ترین چکا ہے۔ اب شاہ جی کے خلاف اس کے روئیں روئیں سے نفرت ابلنے لگی ہے اور اب دکھوں کو جھیلنے کا حوصلہ بھی بڑھ گیا ہے چنانچہ اس نے اپنے طور طریقے ہی بدل لئے۔ شاہ جی کے حصے کی عمدہ سے عمدہ نعمتیں وہ بلا تکلف اڑا دیتا اور خوب خوب شکم سیر ہو کر کھاتا پیتا اور اینڈتا پھرتا۔ بہت سے بہت مار پڑتی تو سہہ لیتا اور پھر اُسے بھلا بھی دیتا جیسے کپڑے پر گرد پڑ جائے اور اسے جھاڑ دیا جائے۔ پھر وہی ڈھٹائی اختیار کر لیتا اب وہ شاہ جی سے بھی اکڑ کر بولتا۔ کڑک کر جواب دیتا۔ لوگ حیران رہ جاتے کہ عطامحمد کیوں اپنی موت سے کھیل رہا ہے لیکن اس پر مطلقاً اثر نہ ہوتا۔ دودھ دہی، گھی مکھن جو چاہتا، جس قدر چاہتا کھاتا پیتا، ڈنڑ بیٹھک لگا کر مزے سے نہا دھو کر سو جاتا۔ اس کی ان بیباکانہ حرکتوں اور اتنے بڑے انقلاب کو دیکھ کر اللہ جوائی بھی اس سے ڈرنے لگی تھی۔ ایک روز بولی "تجھے کیا ہو گیا ہے عطامحمد؟" ــــ لیکن اس کا جواب دینے کے بجائے عطامحمد مسکرا دیا، اس کی ٹھوڑی اٹھا کر بولا "شادی کرے گی مجھ سے؟" ــــ اللہ جوائی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"وہ تو میں کروں گی، پر تو کیوں موت سے کھیل رہا ہے تجھے پتہ نہیں پیر تمر شاہ کیسا ظالم آدمی ہے تجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

اس دوران کوئی ملازم آنکلا اسے دیکھ کر اللہ جوائی بھاگنے لگی تو عطا محمد نے اسے پکڑ کر روک لیا اور ملازم کے سامنے ہی اس سے بولا "دیکھ میں تیرے شاہ جی سے نہیں ڈرتا۔ بس آج سے تو اس کے پاس نہیں جائے گی، نہیں تو تیری اور تیرے شاہ جی کی خیر نہیں۔" اتنا کہہ کر عطا محمد تو ایک طرف چل دیا لیکن پورے گھر میں کھلبلی سی مچ گئی۔ سب ڈر گئے کہ اب پتہ نہیں کیا ہوگا۔ بڑی بیگم کو اطلاع ملی، اُنھوں نے دونوں کو طلب کیا اور عطا محمد سے کہا "تو اگر اللہ جوائی کو لے کر جانا چاہتا ہے نکل جا۔ آج شاہ جی گھر میں نہیں رہیں گے۔"

عطا محمد نے اکڑ کر کہا "بیگم صاحب میں چھپ کر نہیں جاؤں گا۔ اب تو میں ڈنکے کی چوٹ پر جاؤں گا، للکار کر جاؤں گا، اور شاہ جی سے مقابلہ کر کے جاؤں گا۔"

عطا محمد کے تیور دیکھ کر بیگم بھی ڈر گئیں۔ اللہ جوائی بھی جس نے اسے آزادی کے خواب دکھلائے تھے کانپ اٹھی لیکن عزم کے نشے نے اسے نیم دیوانہ سا کر دیا تھا۔ صاف صاف نظر آتا تھا کہ وہ کوئی بہانہ تلاش کر رہا ہے کہ موقع ملے اور شاہ جی سے مقابلہ ہو شاہ جی سے اس نے ایک خاموش لڑائی شروع کر رکھی تھی۔ اگر وہ اسے گھور کر ایک بار دیکھتے تو وہ مسلسل گھور گھور کر انھیں اُس وقت تک دیکھتا رہتا جب تک اُن کی نگاہیں جھک نہ جاتیں۔ نوکر چاکر ابھی تک تو صرف شاہ جی سے ڈرتے تھے اب وہ عطا محمد کے طور تیور سے بھی لرزتے رہتے تھے اور اس کے منتظر تھے کہ کسی نہ کسی وقت کوئی زبردست ٹکر ہوگی اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ عطا محمد کی ساری اکڑ فوں رفو چکر ہو جائے گی اور اس کی جگہ اس کی لاش تڑپتی ہوئی ملے گی۔

ایک روز شاہ جی حسب دستور باہر احاطے میں محفل لگائے بیٹھے تھے اور چہک رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے کہ عطا محمد شاہ جی کا بہترین ریشمی لاچہ، ریشمی کرتا اور کھسا جوتا پہن کر بہت قیمتی پگڑی باندھے ہوئے ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے ہاتھ میں اللہ جوائی کا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر آیا اور گرج کر بولا" اوے پیرا، میں اپنی زمیناں تے جاریاں ہاں۔ اللہ جوائی نوں اپنی ووہٹی بناواں گا، ہشیار ہو جا، اسی شیراں دے پتر آں، چور نہیں آں، ڈنکے کی چوٹ نال جارہے آں"۔ یہ کہہ کر نہایت اطمینان سے عطا محمد اصطبل میں آیا، ایک عمدہ ساجاندار گھوڑا نکالا اور اللہ جوائی کو اس پر آگے بٹھایا، خود پیچھے بیٹھ کر مسکراتا ہوا شاہ جی کے سامنے سے گزر گیا۔ شاہ جی کو جیسے سانپ سونگھ گیا، تمام حاضرین مبہوت رہ گئے۔ شاہ جی کو اس کے گزرنے کے بہت بعد میں احساس ہوا کہ آج عطا محمد ان کے اور ان کے خاندان کا صدیوں کا بنایا ہوا وقار چٹکی بجاتے میں خاک میں ملا گیا اور وہ کچھ نہ کر سکے۔ دو چار ملازمین نے تبصرہ کرنے کے لئے زبان کھولنا چاہی لیکن شاہ جی دردِ سر کا بہانہ کر کے اُٹھ گئے۔

کچھ عرصہ کے بعد سننے میں آیا کہ عطا محمد نے اپنی زمین پر قبضہ لے لیا ہے۔ اللہ جوائی سے شادی کر لی ہے اور نہایت درجہ اطمینان و سکون سے رہتا ہے۔ البتہ اپنے مکان کے سامنے ایک ٹیلے پر بندوق لئے ٹہلتا رہتا ہے۔ ایک بار پڑوس کے گاؤں میں مویشیوں کا میلہ لگا۔ پیر ثمر شاہ کے مویشی اس میلے میں ضرور بھیجے جاتے تھے اور انھیں وہاں انعام واکرام بھی ملتا تھا میلہ ختم ہوا اور مویشی واپس جارہے تھے کہ اچانک ایک طرف سے گھوڑا دوڑاتا ہوا کوئی شخص نمودار ہوا۔ دو چار ہوائی فائر ہوئے اور پیر ثمر شاہ کی سب سے عمدہ اور سب سے جاندار اور قیمتی بیلوں کی جوڑی پر گھوڑے سوار نے ہاتھ ڈال دیا، چہرے سے کپڑا ہٹا کر عطا محمد نے خود کو ظاہر کر دیا اور ثمر شاہ کے ملازمین سے بولا" اپنے پیر ہوراں نوں دس دینا ایہہ ساڈا حق اے"۔ اور

بیلوں کی جوڑی لے کر یہ جا وہ جا۔

عطا محمد کا، پیر ثمر شاہ کو یہ دوسرا چیلنج تھا۔ اور معاملہ زمیندار کی عزت کا تھا لہذا پیر ثمر شاہ نے مشورہ کیا کہ کیا کارروائی کی جائے۔ ڈاکہ ڈالنے کے الزام میں مقدمہ دائر کرنے کو کہا۔ لیکن پیر جی نے اس رائے کو پسند نہ کیا کیونکہ یہ تو صاف نامردی ہے کہ اُن کے پالے میں آکر کوئی انھیں کو مار جائے لہذا طے یہ ہوا کہ انھیں سکوں میں جواب دیا جائے جن کا وہ مستحق ہے۔

چنانچہ ایک رات آٹھ دس مضبوط آدمیوں کی ہمراہی میں شاہ جی خود عطا محمد کی زمین پر پہنچ گئے۔ چاروں طرف سے اس کے مکان کو گھیر لیا۔ دو آدمیوں کو دیوار پھاند کر دروازہ کھلوایا اور اندر پہنچ کر عطا محمد کو چارپائی سے باندھ دیا اور پیر جی نے اسے مکّوں گھونسوں طمانچوں سے مار مار کر لہولہان کر دیا۔ اللہ جوائی، روتی پیٹتی چیختی چلاتی رہی، گالیاں کوسنے دیتی رہی لیکن کر کچھ نہ سکی۔ جاتے وقت پیر جی بیل گھوڑا بندوق سب کچھ لے گئے۔ عطا محمد کی فصلوں کو آگ لگا دی۔ اس کے ٹیوب ویل کو توڑ پھوڑ دیا۔ غرضکہ اس کارروائی کے دوران گاؤں میں جاگ ہو گئی تو سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ گاؤں والوں نے جب عطا محمد کی یہ بپتا دیکھی تو پیر جی کو ہزاروں صلواتیں سنائیں۔ صلواتیں سنانے میں اکثر وہ لوگ بھی شامل تھے جو پیر جی کے پاؤں چومتے تھے۔ عطا محمد کو ان لوگوں کے طرزِ عمل پر حیرت نہیں تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پیر ثمر شاہ کے پانوں چومنے کا عمل وہ کبھی بھی خوشی یا عقیدت سے نہیں کرتے تھے۔ یہ بھی محض بیچارگی تھی۔

عطا محمد تو جب تک اچھا ہوتا، ہوتا اس کے گاؤں والوں نے اسے تمام سہولتیں پہنچائیں۔ فصلوں کا نقصان خود پورا کیا۔ اپنے مویشی دے کر نئی فصل اگانے میں مدد دی اور جب فصل سے نفع ہوا تو عطا محمد نے ایک بندوق اور ایک گھوڑا خرید لیا۔ گاؤں والوں نے اس کی ہمت

بندھائی، دس بارہ نوجوان ہمہ وقت سینے پر ہاتھ مار مار کر اور خم ٹھونک ٹھونک کر عطا محمد سے کہتے کہ چاچا جب تک تم بدلہ نہیں لے لیتے ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ طے یہ پایا کہ اس مرتبہ جب پڑوس کے گانوں کا میلہ لگے گا اور پیر ثمر شاہ کے مویشی واپس جا رہے ہوں گے تو ایک بھی مویشی واپس نہیں جا سکے گا سب روک لئے جائیں گے۔ میلہ لگا۔ مویشی بھی آئے لیکن اتفاق دیکھیے کہ جنگ چھڑ گئی اور میلہ ختم کر دیا گیا۔ اس کے باوجود گانوں کے جیالوں نے طے کیا کہ مویشی جانے نہیں پائیں گے۔ سب کے سب گھات میں بیٹھ گئے۔ اندھیری رات میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔ دشمن کے جہاز پر جہاز آتے۔ آس پاس کے گانوں اور شہروں پر اندھا دھند بمباری کرتے جا رہے تھے۔ عطا محمد کو گھات میں بیٹھے بیٹھے رات بیتتی جا رہی تھی پر نہ تو کوئی مویشی آیا نہ پیر جی کا کوئی آدمی دکھائی دیا۔ خطرے کا سائرن بھی دیر سے بجا ہوا تھا۔ خطرے کے دور ہونے کا سائرن نہیں ہو رہا تھا۔

معاً ایک سایہ عطا محمد کو نظر آیا۔ یہ کسی مسافر کا سایہ تھا جو پناہ لینا چاہتا تھا۔ کئی بار جہاز نیچی نیچی پروازیں کرتے ہوئے گزر چکے تھے۔ کسی بھی لمحے بمباری ہو سکتی تھی۔ عطا محمد اپنی اپنی جان کی پروا کئے بغیر اٹھا اور اسی سائے کی طرف لپکا۔ اُسے پکڑ کر خندق کی طرف لے چلا اسی وقت چیختے چنگھاڑتے دو جہاز سروں پر سے گزر گئے۔ بہت سے شعلے لپکے عطا محمد نے اجنبی سائے کو تیزی سے خندق میں دھکیل دیا اور خود بھی اسی پر کود گیا۔ دونوں دبکے پڑے رہے خطرہ ٹلنے کا سائرن نہ ہوا۔ صبح ہو گئی۔ سورج کی پہلی کرن جب مورچے میں داخل ہوئی تو دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں عطا محمد اور ثمر شاہ تھے۔ ثمر شاہ یوں ڈرا ہوا اور سہما ہوا پڑا تھا۔ جیسے شیر کے سامنے بھیڑ لیکن عطا محمد نے بڑی خندہ پیشانی سے کہا "شاہ جی چپکے سے نکل جاؤ۔ تم کچھ سہی، میرے ہم وطن تو ہو۔

تمہاری گھات میں گانوں کے سارے گبھرو بیٹھے ہوئے ہیں اگر کسی نے دیکھ لیا تو تکہ بوٹی کر لیں گے۔"

ثمر شادے جیسے اسپرنگ لگ گئے۔ خندق سے نکلا اور آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تب عطا محمد کو ایک دم ہنسی چھوٹ گئی۔ اس کی آواز سن کر جب سارے گبھرو خندقوں سے نکل آئے اور ہنسنے کی وجہ پوچھی تو وہ بولا "چوہا ـــــ چوہا نکل بھاگا۔"

"چوہا!" ـــــ لوگوں نے دُہرایا۔

ایک بولا۔ ہاں ہاں دشمن کے جہاز پر ہمارا جہاز بلی کی طرح جھپٹا تھا اور دشمن کا جہاز چوہے کی طرح بھاگ گیا۔"

سب نے زوردار قہقہہ لگایا۔ عطا محمد نے تائید میں گردن ہلائی اور بندوق کندھے پر دھرے ہوئے گھر پہنچ گیا جہاں اس کی بیوی کی گود میں بچہ قلقاریاں مار رہا تھا۔

شگافِ در

یہ دریچہ میرے مختصر سے کمرے میں بنا ہوا ہے اور کمرہ جو مکان کی سب سے بلند منزل پر واقع ہے اس وسیع و عریض کائنات میں ایک نقطۂ موہوم سے زیادہ وقیع نہیں پھر بھی میں نے اس دریچے سے کائنات کا بارہا نظارہ کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ دریچے سے تا حدِ نگاہ کچے پکے مکانات، گھنے درخت، سڑکیں، گلیاں نظر آتے ہیں آسمان کا لاجوردی رنگ سوادِ افق میں کہیں گم ہوتا ہوا نظر آتا ہے اور اس احاطۂ نگاہ پر میری کائنات ختم ہو جاتی ہے۔ میں آپ سے کیا چھپاؤں میں نے اکثر دوربین لگا کر اس حدِ نگاہ کو وسعت بھی بخشی ہے لیکن سوائے اس کے کہ افق کا سواد قدرے پھیل کر دور جا پڑا ہے۔ کائنات میں اور کوئی قابلِ لحاظ اضافہ نہیں ہو سکا۔ صبح کا سورج بھی اسی دریچے سے اپنی کرنیں پھیلاتا ہے رات کی چاندنی بھی اپنی مرمریں انگلیوں سے مجھے گدگدانے کے لئے اسی دریچے سے داخل ہوتی ہے۔ سیاہ رات میں ستارے بھی جگنوؤں کی طرح جھلملاتے ہیں تو اسی دریچے سے

ظلمتِ شب کا آنچل پھیل کر سایہ فگن ہو جاتا ہے۔

دن کی روشنی میں آسمان پر میں نے بہت کچھ دیکھا ہے اور اسی دریچے سے دیکھا ہے، اڑتے ہوئے پرندے کٹی ہوئی پتنگیں، اڑتے ہوئے پرچم، امڈے ہوئے بادل چمکتی ہوئی بجلیاں، قلابازیاں کھاتے ہوئے کبوتر، بارش کے بعد نیلگوں آسمان پر قوس قزح کے بکھرے ہوئے رنگ، پڑوس کے مکانوں کے جھروکوں سے نظر آنے والے رنگین آنچل، سرخ عارض سیاہ زلفیں حتیٰ کہ ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کا غروب آفتاب، ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا نیا سورج، ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی خون آشام صبح ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح امید، ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شعلہ بار سہ پہر، ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کی لرزہ براندام صبح —— سب کچھ اسی دریچے سے نظر آتے رہے ہیں۔ جنگ کے مہیب اور ہولناک گڑگڑاتے ہوئے سیاہ جہاز بھی اسی دریچے سے نظر آئے ہیں۔ گولیوں توپوں اور بموں کے نیلے پیلے اور سرخ شعلے بھی یہیں سے دیکھے گئے ہیں گرتے ہوئے مکانات اڑتے ہوئے پتھر چھتیں انسانی اعضاء، خاک و خون کی چادریں سب یہاں سے بخوبی نظر آتے رہے ہیں۔ اسی دریچے سے لاہور کا قدیم تاریخی قلعہ بھی نظر آتا ہے۔ بادشاہی مسجد کے مینار بھی اور انگشت شہادت کی طرح آسمان کی وسعتوں سے ہمکلام یادگار پاکستان کا مینار بھی لیکن وہ نظارہ جو میں کرنا چاہتا ہوں، وہ منظر جو میری آنکھیں دیکھنے کی منتظر ہیں ابھی تک نظر نہیں آیا ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ مجھے اس حجرے میں قید کر دیا گیا ہے اور سوائے اس شگافِ در کے اس دنیا کے تمام دروازے مجھ پر بند ہو گئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے میں نے صرف لاہور ہی نہیں، برصغیر کے بڑے بڑے شہر چھوٹے موٹے گاؤں، ننھی منی بستیاں دیکھی ہیں میں نے مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے ملکوں کی بھی سیر کی ہے، یورپ امریکہ اور افریقہ کے ممالک کی سیاحت بھی کر چکا ہوں، گویا گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے، اقوام عالم کے جمگھٹوں میں سانس لی ہے۔ تہذیب تمدن

کے مرقع میری نگاہ میں ہیں. تاریخ کے نشیب و فراز کے اوراق میں نے بھی اُلٹے ہیں ۔ میں ایک عاقل و بالغ، وسیع النظر، سیر چشم اور خواندہ شہری ہوں جو دنیا کی ہر لحظہ دھڑکتی ہوئی نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے لیکن جس طرح ہر پرکار کے دائرے بناتے وقت پرکار اپنے مرکزی نقطہ پر قائم رہتا ہے ۔ یہ دریچہ میرے وجود کے لئے اسی نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے میں پھر عرض کروں گا کہ کہیں آپ مجھے کنوئیں کا مینڈک نہ سمجھ لیں کہ جسے آسمان جتنا نظر آتا ہے اتنا ہی سمجھتا ہے ۔ میں نے آسمان کی بیکراں وسعتوں کا اندازہ لگایا ہے ۔ پرکار کے دوسرے سرے کی طرح جو گردش کرتا ہوا دائروں پر محیط ہو جاتا ہے لیکن اپنے نقطہ سے رشتہ نہیں توڑتا، میرا یہ دریچہ کائنات میں یہی مرکزی نقطہ ہے ۔

یہ جو میں نے آپ سے اقرار کیا کہ اس دریچے سے دوربین لگا کر بھی میں نے نظارے کئے ہیں تو غلط نہیں ہے لیکن بات یہ ہے کہ یہاں سے دو تین مکانات چھوڑ کر ایک وسیع و عریض بلند و بالا بلڈنگ واقع ہے جہاں مہ رخوں اور رنازنینوں کے جھمگھٹے ہوتے رہے ہیں رنگین آنچل سرسراتے رہے ہیں، سیم تنوں، لیلیٰ جمالوں کے اکھاڑے جمتے رہے ہیں۔ ان سب کی مفصل خبریں اسی دریچہ سے دوربین کے ذریعہ موصول ہوتی ہیں لیکن کبھی یہ خیال نہیں ہوا کہ زیادہ طاقتور شیشوں کی دوربین سے زیادہ دور تک کے نظارے کئے جائیں ۔

میں ہمیشہ سے تنہا ہوں اس کمرے میں، ـــــ لیکن کبھی کبھار بعض احباب بھی یہاں آتے رہے ہیں لیکن جو بھی ایک بار زحمت اُٹھا کر یہاں پہنچا ہے دوبارہ آنے کی ہمت نہ کر سکا البتہ چند دوست بڑے مستقل مزاج ہیں ۔ وہ میری خاطر ایورسٹ کی اس مہم کو بار بار سر کرتے ہیں لیکن ذرا بھی اُف نہیں کرتے ۔ ان میں سے بعض میرے تیمار دار، ہمراز، دمساز، ہمدم اور ہم سفر بھی رہے ہیں کچھ میرے ہم مشرب، ہم مذاق اور ہم خیال بھی رہے ہیں۔ چند ایسے بھی ہیں جنھوں نے

مشترکہ طور پر ایک آدھ معاشقہ بھی چلایا ہے اور مجھے واقعی اس بات کی فکر دامن گیر رہی ہے۔ کہ اس دریچے کی افادیت میں اسی وقت اضافہ ہو سکتا ہے جب کہ ایک طاقتور دوربین یہاں نصب کر دی جائے۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے منصوبہ کے لئے زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلتا دوربین کے لئے زر نقد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ہم میں سے کسی کی جیب میں نہیں ہوتا چنانچہ رقم کے متبادل حل کے لئے مختلف تجاویز زیر غور آتی رہیں لیکن سودمند کوئی ثابت نہ ہوئی۔

آپ نے یقیناً ستاروں اور سیاروں کا مطالعہ کرنے والوں کے پاس اعلیٰ درجہ کی طاقتور دوربین دیکھی ہو گی جن کی مدد سے ایک آن واحد میں زمین و زماں کا فاصلہ طے کر کے نگاہیں نہ صرف یہ کہ ستاروں اور سیاروں کے جمال کو دیکھ سکتی ہیں بلکہ سیاروں کی گردش بھی ملاحظہ کر سکتی ہیں۔ افسوس کہ میں نے ایسی دوربینوں کی صرف تصویریں دیکھی ہیں۔ میرے پاس تو نہایت معمولی بنیا کلر ہے جسے میں تکلفاً دوربین کہہ رہا ہوں۔ اس کا رینج جیسا میں نے پہلے عرض کیا کچھ زیادہ نہیں ہے۔ صرف سامنے والی بلڈنگ کے جھروکوں سے نظر آنے والے مختلف رنگ ہیں۔

رنگ تو خزاں اور بہار دونوں کے زمین اور آسمان پر نظر آتے ہیں، جاڑے کی یخ بستہ کہر آلود صبحیں سرمئی دھند میں لپٹی ہوئی سانولی سلونی شامیں، بسنت رت کی زعفرانی دھوپ پیلے پیلے سرسوں کے کھیت زرد زرد پھولوں کی بہار برسات کی اڑتی گرجتی کالی کالی گھٹائیں ڈونگرے۔ برساتے ہوئے بادل، بارش سے دھوبا ہوا کھلا کھلا نیلگوں آسمان اور تاحد نگاہ چھائی ہوئی ہریالی کی آسمان پر پڑتی ہوئی چھوٹ، یہ سب رنگ یہاں سے نظر آتے ہیں لیکن میں آپ سے اقرار کر چکا ہوں کہ ان رنگوں کو دیکھنے کے لئے دوربین کا استعمال نہیں ہوتا، یہ تو وہ رنگ ہیں کہ اندھوں سے بھی تقاضا کرتے ہیں کہ ہمیں دیکھو

اوران رنگوں کو بغیر کسی دوربین کے دیکھا جا سکتا ہے۔ دوربین سے سامنے والی بلڈنگ کے پس دیوار رنگین اور متحرک سائے دیکھ دیکھ کر جی سیر نہیں ہوتا، ذوق تجسّس اور بڑھتا ہے کہ انھیں اور قریب سے دیکھا جائے۔ میرے تمام راز داں احباب میرے اس بے ضرر سے مشغلے میں اکثر شریک ہوتے رہے ہیں لیکن میری چوری پکڑی ہے تو گگو نے۔

گگو سے آپ واقف نہیں ہیں یہ ایک ننھی منی پیاری سی بچی ہے پڑوس میں رہتی ہے اس کی ماں کسی انڈسٹریل ہوم میں ملازم ہے۔ باپ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ زندہ ہے کہ مرگیا۔ اس کا باپ بنگال میں پیدا ہوا علی گڑھ میں تعلیم پائی، بہار میں شادی کی ڈھاکہ میں ملازمت کرتا تھا کہ الیکشن کے ہنگاموں میں یکایک حالات ایسے دگرگوں ہوئے اور سیاست کے آسمان پر ایسا رنگ نظر آیا کہ بیچارے کو بیوی اور بچی کی جان کی حفاظت کے خیال سے لاہور آنا پڑا اور میرے پڑوس میں ایک مختصر سے فلیٹ میں اقامت پذیر ہوا اس وقت یہ بچی تین چار سال کی ہوگی، سانولی سلونی بھولی بھالی پھول سی بچی کو باپ گود میں لئے میرے دروازے پر کھڑا تھا۔ میں نے کہا "آیئے تشریف لایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"۔ آنے والا دبلا پتلا منحنی سا جوان آدمی تھا۔ سانولی رنگت تیکھے خدوخال علی گڑھ پائیجامہ شیروانی اور منہ میں پان کی گلوری دبی ہوئی۔ اس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "بھائی میرا نام مطیع الرحمٰن ہے اصلاً بنگالی ہوں لیکن شادی بہار میں کی، تعلیم علی گڑھ سے حاصل کی، حالات خراب دیکھ کر صفیہ اور گگو کو یہاں لے آیا ہوں۔ نوکری پر گذارہ ہے۔ مجھے واپس جانا ہے، یہاں صفیہ اور گگو کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے اللہ کی حفاظت میں دونوں کو چھوڑ کر جا رہا ہوں، آپ سے گزارش ہے کہ پاس پڑوس کا خیال رکھئے گا"۔ میں نے بچی کو گود میں لے کر پیار کیا مطیع الرحمٰن سے خوب مزے مزے کی باتیں

کیں اور اس غریب اللہ یار کی ہر طرح دلجوئی کی۔ بیچارہ نہایت سراسیمگی کے عالم میں اپنے کنبہ کو لایا تھا۔ اس لئے مجھے سچ مچ بڑا ترس آیا۔ وہ دن اور آج کا دن ہے کہ گگو سے میری دوستی ہے میں اس کے ناز اور نخرے بھی اُٹھاتا ہوں اس کی شرارتوں سے خوش ہوتا ہوں۔ اسے سیر سپاٹے کراتا ہوں اور حتی الامکان اس کے لئے کھلونے اور مٹھائیاں وغیرہ بھی لالا کر دیتا رہتا ہوں۔ ایک روز میں اسی دریچے میں کھڑا دوربین سے سامنے والی بلڈنگ کے جھروکوں کے اُس پار قوس قزح کے بکھرے ہوئے رنگ دیکھ رہا تھا کہ گگو آ گئی۔

"آپ کیا دیکھ رہے ہیں انکل، لائیے مجھے بھی دکھائیے"۔

"میں ــــ میں۔۔۔۔" میں گھبرایا۔ بوکھلایا "کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں"۔

لیکن قبل اس کے کہ میں کوئی معقول بہانہ کروں، گگو بینا کلر جھپٹ کر آنکھوں سے لگا کر بلڈنگ کی طرف دیکھنے لگی۔ "کچھ بھی نہیں ــــ بس دیوار ہے، میں امی سے کہوں گی پتہ نہیں انکل دوربین لگا کر دیوار کو کیوں دیکھتے رہتے ہیں"۔ بینا کلر مجھے لوٹا کر گگو جا رہی تھی کہ مجھے ڈر لگا کہ کہیں سچ مچ یہ آفت کی پرکالہ صفیہ بھابھی سے جا کر میری شکایت جڑ ہی نہ دے اور میں بلا وجہ ایک اخلاق باختہ آدمی ٹھہرایا جاؤں۔ اللہ اللہ آدمی کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ڈرتا ہے اور معاشرہ میں کس قدر بگلا بھگت بن کر رہتا ہے۔ کیسی چھوٹی چھوٹی چوریاں کرتا ہے اور کیسے عمدہ عمدہ شرافت کے لبادے اوڑھتا ہے۔ میں نے جھپٹ کر گگو کو پکڑ لیا اور بینا کلر اُس کی آنکھوں پہ چڑھا کر دوسرے رُخ پر اُسے دکھاتے ہوئے کہا "گگو ــــ وہ دیکھو، دور پرے آسمان میں کیا نظر آتا ہے"۔

"کیا نظر آتا ہے؟" گگو بولی "بس یادگار پاکستان کا مینار نظر آتا ہے"۔

میں بولا "نہیں اس کے پیچھے دیکھو"۔

"اس کے پیچھے" وہ بولی ایک کٹی ہوئی پتنگ ہے انکل، بس، ہائے کتنی پیاری پتنگ ہے"
بنیا کلر میز پر رکھتے ہوئے گگو بولی "انکل پتنگیں کیوں کاٹی جاتی ہیں اور پھر انہیں اتنے ڈھیر سے لوگ کیوں لوٹنے کے لئے دوڑتے ہیں"

اس بات کا میں کیا جواب دیتا کیونکہ عالمی سیاست کے آسمان پر جانے کتنے ملکوں کی پتنگیں کاٹی جاتی ہیں اور کتنی پتنگیں ایسی بھی اڑتی ہیں کہ ان کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہے ٹمکیاں کوئی اور دیتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ یادگار پاکستان کے مینار کے پیچھے ایک کٹی ہوئی پتنگ فضا میں یوں ڈھکتی چلی جا رہی تھی جیسے کوئی رمتا جوگی، بے یار و مددگار تار تار زخموں سے چور، سپاہی، اور شاید پتنگ لوٹنے والے لڑکے اس انتظار میں ہوں گے کہ دیکھیں کب زمین پر گرتی ہے، اس کو کاٹنے والی پتنگ یوں تنی اور اکڑی ہوئی تھی کہ جیسے اس نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کی تیز دھار ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ گگو مجھ سے کوئی جواب نہ پاکر کرسی پر جا بیٹھی اور بڑے معصومانہ انداز میں بولی "انکل آپ کے پاس کوئی ایسی دوربین نہیں ہے جس سے ڈھاکہ نظر آ جائے؟"

"ڈھاکہ" میں گھبرا کر بولا "نہیں گگو ایسی دوربین نہیں بنتی"

"میں ڈیڈی کو دیکھنا چاہتی ہوں انکل سنا ہے ڈھاکہ پر بہت بمباری ہوئی ہے"

"گگو تمہارے ڈیڈی آ جائیں گے"

"امی کہتی ہیں کہ اب وہ کبھی نہیں آئیں گے وہ بنگالی ہیں، وہاں بنگلہ دیش بن گیا ہے"
میں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ پیار کیا اور کہا "گگو وہ ضرور آئیں گے، وہ بھی تم کو یاد کرتے ہیں"

"سچی، آپ کو پتہ ہے"

"ہاں ہاں مجھے پتہ ہے۔"

وہ بولی" میں آپ کو اپنی دوربین دکھاؤں۔ میں نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہے۔"

"ہاں ہاں ضرور" بچی دوڑ کر دوربین کے نام پر ردی کاغذ کو لپیٹ کر بنایا ہوا ایک لمبا کھوکھلا چونگا سا اٹھا لائی اور آنکھوں پر لگا کر بولی ___" دیکھیے اس میں کیا نظر آتا ہے۔"

میں نے آنکھوں پر چونگا لگایا تو قاف تا قاف آسمان صاف، وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بس بچے کا کھلونا جسے اس نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ میں اس معصوم بچی کی دل شکنی نہیں چاہتا تھا، اور کچھ کہنے نہ کہنے میں ابھی متامل تھا کہ وہ پر جوش لہجے میں بولی "ڈھاکہ نظر آتا ہے بینک میں ڈیڈی کام کرتے نظر آرہے ہیں، کالی شیروانی پہنے آنکھوں پر چشمہ لگائے ہوئے۔"

"ہاں ہاں، بھئی اور وہ پان بھی کھا رہے ہیں۔" میں نے بچی کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا، بچی مجھ سے لپٹ گئی اور بولی۔

"انکل آپ کتنے اچھے ہیں، امی کو تو اس میں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔"

میں بولا "تمہاری امی کی نظر ضرور کمزور ہے۔ تم یہ دوربین ہر ایک کو مت دکھایا کرو گگو، اس سے ہر ایک کو نظر نہیں آتا۔" اچھا انکل یہ میں آپ کے پاس چھوڑ دوں گی جب ڈیڈی کو دیکھنے کو جی چاہے گا، چپکے سے آکر دیکھ جایا کروں گی۔ ٹھیک ہے نا۔"

"بالکل ٹھیک" میں نے کاغذ کا وہ چونگا ایک طرف رکھ دیا۔ گگو کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی "انکل کیا ہم ڈھاکہ نہیں جا سکتے؟"

میں نے دلاسے کے طور پر کہا "کیوں نہیں جا سکتے؟"

گگو بولی" امی کہتی ہیں ہم بنگلہ نہیں بولتے، اس لئے ہم نہیں جا سکتے۔"

اس بدیہی حقیقت کا بھی میرے پاس کوئی جواب نہ تھا لیکن ایک دوسری حقیقت میرے

سامنے ضرور تھی کل کی طرح آج بھی سچ تھی۔ میں نے اسی کو استعمال کیا اور بولا "مگر تمہارے ڈیڈی تو یہاں آ سکتے ہیں۔"

بچی بولی "ہاں ڈیڈی آجائیں تو ٹھیک ہے۔"

میں نے اس موضوع کو بدلنے کے لئے بچی کو ٹافیاں دیں اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے رخصت کر دیا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ منظر جو میں اس دریچے سے دیکھنے کا برسوں سے منتظر تھا، آج دیکھ چکا ہوں، وہ دوربین ایجاد ہو چکی ہے جسے اس شگافِ در میں نصب کر کے ڈھاکہ دیکھا جا سکتا ہے۔ مطیع الرحمٰن کو بینک میں کام کرتے ہوئے پان چباتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر شخص اس دوربین سے نہیں دیکھ سکتا صرف گوگو جیسی معصوم بچیاں مطیع الرحمٰن جیسے باپوں کو دیکھ سکتی ہیں۔ مجھے بھی اس دوربین سے کچھ نظر نہیں آیا لیکن میں نے گوگو کی آنکھوں سے دیکھا ڈھاکہ دیکھا، مطیع الرحمٰن کو دیکھا —— اپنی دوربین سے مجھے محض یادگارِ پاکستان کے پیچھے کٹی ہوئی پتنگ نظر آ سکتی ہے۔ جسے لوٹنے کے لئے نہ جانے کتنے لٹیرے خونخوار بھیڑیوں کی طرح جھپٹ رہے ہیں۔

مالکن

اب قدسیہ بیگم کا سن پچاس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ یوں تو وہ کچھ ایسے ناز بھاؤ کی عورت نہ تھی لیکن بدن بھاری رنگت گندمی، تیکھے خدوخال اور چہرے سے تمکنت اور بردباری کے گہرے خطوط نمایاں تھے۔ تیرہ سال کے سن میں جب ان کی شادی نواب افتخار علی خاں سے ہوئی تھی تو اس نے بھی ایک اچھے گھر کے خواب دیکھے تھے، اس وقت اس کے دل میں یہ بات کھُب گئی تھی کہ وہ اس لمبی چوڑی محل سرا میں تمام لوگوں پر حکومت کرے گی اور شوہر تو اس کے چشم و ابرو کے اشارے پر ناچے گا۔ نوکر چاکر ہاتھ باندھے کھڑے رہیں گے اور ایسا سوچتے وقت اس کے ذہن میں ہمیشہ دادی اماں کی محل سرا کا تصور ہوتا جہاں دادی اماں تمام چھوٹے بڑوں پر حکمرانی کرتی تھیں اور ان کی مرضی کے بغیر گھر کا پتا بھی ملنے نہ پاتا تھا لیکن لمبی چوڑی محل سرا میں آکر اسے یہ احساس ہوا کہ اس کی ساس کی زندگی تک ایسا ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

شروع شروع میں شوہر اس کا کلمہ پڑھتا رہا لیکن دھیرے دھیرے وہ بھی اس سے الگ تھلگ سا ہو گیا۔ پھر بھی قدسیہ بیگم کو تسکین رہی کیونکہ اس کی ساس بوڑھی ہو گئی تھی اور کسی وقت بھی ٹل سکتی تھی۔ اس کے مرجانے کے بعد سارا ٹبر اس کے سر آ سکتا تھا۔ اتنی بڑی محل سرا کے نوکر چاکر اور عملہ اس کی سرکردگی میں کام کر سکتا تھا، آمدنی کی کنجی بھی اس کے ہاتھ لگ سکتی تھی اور اس کا شوہر جوئے کی بدعادت چھوڑ کر اس کے تلوے تک سہلا سکتا تھا۔ خواہ روپیہ حاصل کرنے کی خوشامد ہی میں کیوں نہ سہی ——!

لیکن یہ سب تو محض توقعات تھیں اور ان توقعات پر اس نے نہ معلوم کتنے سال گزار لئے۔ لیکن بڑھیا ساس کھسکی، نہ شوہر کے کروفر میں فرق آیا۔ اور نہ ہی شاخِ امید پر کوئی ثمر پھوٹا اور جب اس کے سر کے بال بھی سفید ہونے لگے تو وہ اولاد سے مایوس ہو ہی گئی لیکن بڑھیا ساس کی موت کا یقین روز بروز پختہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ بڑھیا ساس سوکھے پتے کی طرح ایک دن درخت سے نیچے آ رہی اور جب گھر کی بوڑھی ملازمہ نے کنجیوں کا گچھا اس کے حوالہ کیا تو قدسیہ بیگم کی خوشی کی انتہا نہ رہی اس نے گھر کا باقاعدہ جائزہ لے کر ہر ایک پر ذرا سختی سے نگرانی شروع کر دی یہاں تک کہ شوہر پر بھی اپنی حکومت جتانا شروع کر دی لیکن اس کی توقع کے خلاف شوہر نے نہ کوئی اعتنا کی اور نہ کوئی توجہ بلکہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے اس نے تو ضروری اور غیر ضروری چیزیں بھی دھڑا دھڑ فروخت کرنا شروع کر دیں اور چونکہ اسے روکنے کا اسے کوئی شرعی یا قانونی حق حاصل نہیں تھا لہذا الٹے خواہ مخواہ خوشامد میں اسی کو لگنا پڑا لیکن توبہ کیجیئے شوہر میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور قدسیہ بیگم اس سے مایوس ہو کر اپنے مقدر کو روتی پیٹتی اپنے میکے چلی آئی، جہاں اس کی ماں کی حالت غیر تھی۔ بھائیوں میں غم و الم کی لہر سی دوڑی ہوئی تھی۔ ماں کا علاج ہو تو رہا تھا لیکن ضعیفی بجائے خود ایک مرض

ہے لہذا تا بکے ——— !آخر اس کی ماں بھی کھسکی اور بڑی بہن ہونے کے ناطے گھر داری کا سارا بوجھ اس نے خود ہی سنبھال لیا۔ اتنے بڑے گھر کی ذمے داری اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے واقعی بڑی طمانیت محسوس کی۔ اور ماں کا مرنا اسے رحمت معلوم ہوا۔ سسرال کی کوفت سے جان بچی، ملکیت کے احساس نے اس کی اچھی صحت کو اور بھی چمکا دیا، خوب رنگ و روپ نکل آیا اور گھر بھر میں اہیلی گہیلی گھومنے پھرنے لگی۔

اس نے بڑے دالان کے وسط میں ایک پلنگڑی پر بیٹھ کر چاروں طرف نظر رکھنا شروع کر دی۔ دن بھر ڈلی کترنا، پان بنانا اور محلے کی عورتوں سے باتیں کرنا، اس میں کتنی شان تمکنت تھی اللہ کے دیئے اس کے پانچ بھائی تھے۔ تین بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ وہ تینوں اپنی بیویوں کے ساتھ علیحدہ علیحدہ کمروں میں رہتے تھے۔ قدسیہ بیگم نے اپنی بھاوجوں کو قدرے پسند کیا لیکن دھیرے دھیرے ان سب میں مین میخ نکلنے لگی اور شکایات بڑھنے لگیں۔ بڑی بھاوج کو کھانا پکانے اور کھا لینے کے بعد نماز روزے سے فرصت ہی نہ ملتی۔ قدسیہ بیگم اس کی شکایت پڑوس کی عورتوں سے کرتی اور بتاتی کہ اس کی بڑی بھاوج کتنی پھوہڑ ہے۔ گھر کا ذرا بھی خیال نہیں کرتی۔ منجھلی بھاوج نے میاں کو اپنے بس میں کر لیا ہے۔ اور اگرچہ قدسیہ بیگم سے اس کا میل ملاپ اچھا تھا لیکن اس کی غیر موجودگی میں قدسیہ بیگم اس کی برائیاں محلے کی عورتوں سے کرتی رہتی۔ چھوٹی بھاوج تو ایک وقت بھی قدسیہ بیگم کے پاس نہ پھٹکتی ——— گو صرف بڑی بھاوج کے ایک لڑکا تھا جو دسویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ اور دوسرے دونوں بھائی لاولد تھے لیکن قدسیہ بیگم کو اس لڑکے کے لچھن بھی پسند نہ تھے۔ وہ چوبیس گھنٹے اس پر کڑی نظر رکھنے کے حق میں تھیں قدسیہ بیگم کو بڑے بھائی سے یہ شکایت تھی کہ شادی کیا ہوئی کہ بس بیوی میں الجھ کر رہ گئے۔ ساری آمدنی بیوی بچے پر صرف کر دیتے ہیں منجھلا بھائی ایک اسکول میں ہیڈ کلرک تھا۔ سوا سو روپیہ پاتا تھا لیکن جو کچھ

ملتا سب بیوی بچوں پہ چھپا کے خرچ کرتی۔ یہی چھوٹی بھاوج کا حال تھا۔ باقی دو بھائیوں کو آوارگی
سے فرصت نہیں تھی۔ بقول قدسیہ سارا وثیقہ یا تو جوئے کی نذر کر دیتے یا چوک کے بالا خانوں پر اڑا دیتے۔

قدسیہ بیگم بس نام کی مالک تھیں لیکن حقیقت میں سب بھائی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی
مسجد الگ کھڑی کیے ہوئے تھے چنانچہ اس نے کبھی کبھی یہ محسوس کیا تھا کہ یہاں آ کر اس نے
غلطی کی ہے۔ سسرال چلا جانا چاہیے لیکن شوہر سے وہ اتنی دل برداشتہ تھی کہ وہاں جانا
پسند نہیں کرتی تھی۔ آنے کا پچھتاوا ضرور تھا تاہم سکون تھا کہ بھائی جھوٹ موٹ "بجو بجو" کہہ کر اس کا
لحاظ تو کرتے ہیں بھلے ہی وہ جھوٹا لحاظ ہو۔ سسرال واپس جانا اب حماقت بھی تھی۔ کیوں کہ ساری
زمین داری ہی ختم ہو گئی تھی اور شوہر کی اقتصادی حالت بھی دگرگوں تھی۔ اس پر طرہ یہ تھا کہ جوئے
سے ہاتھ نہیں اٹھتا تھا۔ قدسیہ بیگم کو معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کا شوہر بچی کھچی املاک
اونے پونے بیچ کر یہیں آ کر پڑ رہے گا اور اس کے رحم و کرم پر بقیہ زندگی گزار دے گا۔ اس خیال سے
اسے رنج بھی ہوتا تھا لیکن تسکین بھی ملتی تھی گو اس کے سب بھائی اپنے افعال کے مالک و مختار
تھے۔ سنتے اس کی ضرور تھے لیکن کرتے اپنے من ہی کی تھے اور وہ سب لوگوں میں ایک ایسے
بت کی مانند بن کر رہ گئی تھی، جس کا احترام تو خاطر خواہ ہوتا ہو لیکن حقیقت ہر ایک جانتا ہو کہ

پتھر میں جان کہاں؟

پھر بھی قدسیہ بیگم اپنی پلنگڑی پر بڑی شان و تمکنت سے بیٹھ کر اپنے خاندان کے واقعات
اور بڑائی کے قصے پڑوسنوں کو سنایا کرتی، اور اپنے بھائیوں کی چپکے چپکے برائیاں کیا کرتی۔ بڑی بھاوج
کو گھر کی عزت کا کچھ خیال نہیں ہے۔ میاں اور بیٹے کے آگے ان کو کوئی سبق بھی یاد نہیں۔ روزہ
اور نماز ہی بس سب کچھ رہ گیا ہے۔ دو گھڑی آ کر بیٹھنا چاہیے نا آخر...... منجھلی بھاوج بڑی
کائیاں ہے۔ منھ پر میٹھی میٹھی باتیں بگھاریں گی۔ پیٹھ پیچھے میاں سے برائیاں، بھائی بہنوں کو الگ

گردیا ہے غضب خدا کا خون سے خون جدا کیا جاتا ہے دیکھو تو اچھے میاں کتنا خیال رکھتا تھا میرا۔ میں ناہنجار ہ میں تھی تو دوسرے دن خط لکھتا شادی کیا ہوئی کہ بیوی نے جادو کردیا۔ جو کچھ کیا یا دھایا بیوی کے کلیجے میں جا اتارا۔

رہی چھوٹی بھاوج تو وہ جتنی زمین کے اوپر ہے اتنی ہی نیچے۔ پاس پھٹکنا کیسا، صاحب سلامت بھی ندارد، توبہ توبہ تھوہ.....

مگر قدسیہ بیگم کو بھاوجوں سے نہیں دراپردہ بھائیوں سے شکایت تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے یہاں آتے ہی اس کی ساری بھاوجیں اس کا احترام کرنے لگیں گی۔ اس کے اشاروں پر چلیں گی اور بھائی ہمہ وقت ہاتھ باندھے حکم کے منتظر رہیں گے بالکل اس طرح جیسے وہ اپنی ماں کا احترام وادب کرتے تھے۔ آخر بڑی بہن ماں کے برابر ہوتی ہے نا——

جب قدسیہ بیگم کو بالکل یقین آگیا کہ بھائی اس کی طرف زیادہ ملتفت نہیں ہوں گے تو اس نے اپنی میراث کا خیال رکھنا شروع کیا۔ گھر کے باہر ایک افتادہ اراضی تھی۔ اس پر سب بھائیوں کا حق تھا—— کچھ اس پر درخت بھی تھے۔ قدسیہ بیگم نے وہ تمام درخت ایک ٹھیکے دار کے ہاتھ بیچ کر روپیہ فراہم کیا اور کل جمع جو تھا اپنے پاس رکھا۔ بھائیوں پر اس کا ردعمل یہ ہوا کہ انھوں نے وہ رہا سہا احترام بھی کم کردیا اور اپنی اپنی بیویوں سے چپکے چپکے سرگوشیاں شروع کردیں۔ قدسیہ بیگم کو معلوم تھا کہ ہر ایک اپنی حق داری جتائے گا لیکن ایسا تو نہیں ہوا البتہ ہر ایک اپنے اپنے طور پر قدسیہ بیگم سے کھنچا کھنچا رہنے لگا۔

قدسیہ بیگم نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے تھوڑے بہت وثیقے میں ہی الگ چولہا جلے۔ اپنی ہنڈیا الگ پکے—— اور جب اس نے یہ بات بھائیوں کو بتائی تو ان میں سے کسی نے بھی اسے ایسا کرنے سے نہیں روکا—— قدسیہ بیگم کا خیال تھا کہ اس کے بھائی جھوٹ موٹ ایک ساتھ کھانے

کو کہیں گے، مگر ایسا نہ ہوا اور قدسیہ بیگم کو ایک دھچکا سا لگا۔

مکان سے ملحق ایک چھوٹا سا قطعہ زمین تھا۔ اس پر کچی چار دیواری اٹھا کر قدسیہ بیگم نے مختلف پھلوں کے درخت لگوا دیئے۔ دن کے ایک حصے میں وہ اپنے باغیچے میں پانی دیتی اس کی دیکھ بھال کرتی۔ شام اپنے ٹھکانے پر جا کر سو رہتی۔

ایک دن اس نے اچھے میاں کو اپنی بیوی سے کہتے سنا "اماں کیا مریں، بجو خود ہی اماں بن کر بیٹھ گئیں، سال دو سال چار سال، ارے بھئی انتہا ہوتی ہے، جانے کا نام ہی نہیں۔" قدسیہ بیگم نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر اسے بہت دکھ ہوا پھر بھی وہ اتنی بد دل نہیں تھی کہ بھاگ نکلتی۔ وہ جانتی کہ بھاوجوں کا جادو ایک نہ ایک دن کم ہو کر رہے گا اور اس کا حکم بھائیوں اور بھاوجوں پر چل کر رہے گا۔ اتفاق سے اس کی چھوٹی بھاوج بیمار پڑی اور مر گئی۔

چھوٹا بھائی ریلوے میں نوکر تھا۔ آمدنی معقول تھی۔ بیوی کے مرتے ہی قدرتی طور وہ بہن کے قریب آ گیا اور رہن سہن، کھانا پینا، سب بہن کے ساتھ ہو گیا۔

قدسیہ بیگم نے خیال کیا کہ یہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جب سب کڑیاں جڑ جائیں گی تو اسے گھر کی مالکہ مان لیا جائے گا۔

چھوٹا بھائی ساری تنخواہ لا کر اس کے ہاتھ میں دے دیتا اور وہ سیاہ و سفید کی مختار تھی۔ پڑوسنوں نے اس کے بھائی کی دوسری شادی کے لئے کئی اچھی لڑکیوں کی پیش کش کی جس کو وہ حیلے بہانوں سے ٹال ٹال گئی لیکن دھیرے دھیرے اس نے دیکھا کہ چھوٹا بھائی اکثر غائب رہنے لگا ہے، پوری تنخواہ بھی نہیں دیتا اور ایک دن جب وہ اپنی مرضی سے ایک عورت سے عقد کر کے اسے گھر لے آیا تو قدسیہ بیگم کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے لیکن ابھی مایوسی کی کیا ضرورت تھی دو بھائی جو کنوارے تھے اگرچہ وہ کماتے دھماتے نہیں تھے اور اپنا وثیقہ آوارگی

میں خرچ کر دیتے تھے، اور قدسیہ بیگم کو اپنی آمدنی سے اور اکثر اپنا پیٹ کاٹ کر انھیں کھلانا پڑتا تاہم وہ اس سے سرتابی تو نہیں کر سکتے تھے اور قدسیہ بیگم کے سو فیصد نہیں تو کم از کم چالیس فیصد احکام پر گردنیں جھکا دیتے تھے۔ قدسیہ بیگم کے باغیچے میں پیڑ بڑے لگنے لگے تھے پھول بھی کھلنے شروع ہو گئے تھے۔ قدسیہ بیگم کو خوشی تھی کہ اس کی محنت ٹھکانے لگی۔ اس سے بھی زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ اس باغ میں اس کی اجازت کے بغیر پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا تھا۔ دن بھر پلنگ پر پڑے پڑے وہ تمام بچوں کو پھل توڑنے سے روکتی رہتی، وہ اس باغیچہ کی مالکن ٹھہری نا.....!

اِدھر کئی سال سے اس نے غور کیا تھا کہ گھر کی مجالس کی وہ اگلی سی شان و شوکت نہیں رہی تبرک بھی وزنی تقسیم نہیں ہوتا تعزیہ بھی جس شان شوکت سے اٹھتا تھا اس میں بھی وہ بات نہ رہی۔ اس نے بھائیوں کو جمع کر کے ان سے یہ بات کہی تو وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر چپ ہو رہے اور ذرا بھی اس کی بات کی اعتنا نہ کی جیسے انھوں نے کہا ہو کہ وہ پاگل ہے اور صرف اپنا حکم چلانا جانتی ہے اور بس.....!

تھوڑے عرصے دونوں بھائی اس کے ساتھ کھانا کھاتے رہے بالآخر وہ بھی اس سے علیحدہ ہو گئے۔ دونوں نے اِدھر اُدھر کی عورتیں بٹھالیں اور گھر چھوڑ دیا اور اب تو قدسیہ بیگم تھی۔ اتنے بڑے ڈھنڈھارے گھر میں اور اتنے لوگوں کے درمیان بھی تنہا رہ گئی۔

لیکن قدسیہ بیگم ان لوگوں میں سے نہ تھی جو مایوس ہو کر ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس نے بھائیوں اور بھاوجوں سے ہو کر بھی اپنی ہار نہیں مانی اور بڑے چاؤ سے کچھ جانور پالے سفید سفید خرگوش، مرغیاں، چوزے، بطخیں اور ایک چھوٹے سے حوض میں کچھ مچھلیاں، ایک پنجرے میں لال اور چڑے کوے پالے۔ ادھر بہت دنوں سے جو بات قدسیہ بیگم کو رہ رہ کر پریشان کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ اب آخر بھائی تو بھائی اس کی کوئی بھاوج بھی اپنے کمرے سے باہر نکل کر گھڑی دو گھڑی

کو اس کے پاس نہیں پھٹکتی، کیا وہ اتنی ذلیل و خوار ہے کہ اس کے اپنے بھائی اسے منہ تک نہ لگنے دیں بھاوجیں آپس میں دنیا بھر کی باتیں کریں، اور اس کو اس طرح نظر انداز کر دیں کہ اس کا عدم و دجود سب برابر ہیں......!

تو یہ تو بے کیسی ہو کر رہ گئی تھی اس کی زندگی بھی.... ایسا سوچتے وقت قدسیہ بیگم کے ذہن میں اپنا ماضی آ جاتا جب یہی اس کے بھائی سر کے بل اس کی سسرال جاتے اور خوشامدیں کر کے اسے میکے لاتے، آخر روپیہ پیسہ تھا! اس کے پاس، روپے کا خیال آتے ہی قدسیہ بیگم نے یہ بات سوچی کہ اگر اس بار محرم کا سارا بار اپنے ذمے لے لیا جائے اور شاندار طریقے سے محرم کیا جائے تو بھائیوں پر ڈھاک الگ بیٹھ جائے گی اور پھر کوئی وجہ نہیں کہ یہی بھائی ایک بار پھر اس کی طرف نہ جھکیں۔

محرم میں روپیہ لگانے کا جہاں تک تعلق ہے دو روپے وثیقے کے بیچ کر چار سو اسی روپے مل جاتے ہیں، یہ سوچ کر قدسیہ بیگم نے ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ حاصل کر کے وثیقہ فروخت کرنے کی درخواست دے دی تمام بھائی اس کے وارث تھے مگر معلوم کیوں اس ناراضگی کے باوجود سب نے اجازت نامے پر دستخط کر دیئے اور وثیقہ فروخت ہو گیا۔ قدسیہ بیگم نے اعلان کر دیا کہ اب کی وہ محرم خود کرے گی۔ چنانچہ اس اعلان کے مطابق اس نے بڑی سج دھج سے امام باڑے میں تعزیہ داری کی مجلسیں کیں، سالانہ مجلس اور شب بیداری پر اس نے تین سو روپیہ صرف کیا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات یعنی محرم بھر مستورات میں یہی نام رہا کہ سب بھائیوں نے مل جل کر محرم کیا ہے لاکھ لاکھ فرداً فرداً قدسیہ بیگم نے ہر ایک خاتون سے اس امر کی تردید کی لیکن بات کچھ اس طرح اڑی کہ پھر نہ جمی اس پر طرہ یہ کہ سالانہ مجلس نامے میں اس کے نام کا کوئی حوالہ تک نہ تھا، پھر کیا تھا، محرم تمام ہونے پر قدسیہ بیگم بھاوجوں اور بھائیوں سے خوب خوب لڑی اور آخر میں فیصلہ یہ ہوا کہ اب وہ اپنے کمرے میں ایک جگہ علیحدہ رہے گی اور گھر کے کسی کام میں دخیل نہ ہو گی۔ اب گھر سے

ے دے کر دہی جانور اس کے مونس و غمخوار رہ گئے وہ دن بھر ان سے باتیں کرتی اور سننے والا یہ اندازہ نہ لگا تا کہ وہ کسی انسان سے گفتگو نہیں کر رہی ہے۔ گھر میں کوئی شخص بھی اس سے گفتگو نہیں کرتا تھا اس کو اپنا کھانا خود پکانا پڑتا ضرورت کی اشیا وہ محلے کے کسی لڑکے بالے سے اور گاہے گاہے کسی پڑوسن سے منگوا لیتی، اور پڑوسنوں سے رو رو کر گھر کے حالات بیان کیا کرتی۔ ایک مرتبہ اس نے سنا کہ گھر کے دالان کی چھت کی کڑی ٹوٹ گئی ہے اور اس دھنّی کو نکال کر دوسری کڑی ڈالی جائے گی اور دوسری دھنّی لگانے کے لئے چھت کو کھلوا جائے گا۔ قدسیہ بیگم کو یہ بات سخت ناپسند تھی لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ یہ بات کس سے کہتی اور وہ کہتی بھی تو کس طرح وہ تو گھر والوں کے لئے گونگی تھی۔ مگر بات اتنی ضروری تھی کہ اس سے ضبط نہ ہوسکا اور اس نے اپنے طوطے سے بآوازِ بلند مخاطب ہو کر کہا "دیکھو میاں مٹھو میں تم کو سمجھائے دیتی ہوں خوب کان کھول کر سن لو کہ اگر چھت کی دھنّی بدلی تو بہت سا روپیہ خرچ ہو جائے گا۔ ایک بلّی منگوا کر ٹوٹی ہوئی دھنّی کو مضبوطی سے پیڑے پر ٹکا کر اڑانا لگوا دو۔ بس کافی ہے" بات گھر والوں کو سنائی گئی تھی۔ مگر ازراہِ اخلاق مٹھو نے "نہیں" سے جواب دے دیا۔ قدسیہ بیگم دیر تک محظوظ ہوتی رہی۔ اس طرح اور کئی بار ایسا ہوا گھر والوں کو نہ سننا تھا اس کی ایک بات نہ سُنی اور اپنے ہی من کی کرتے رہے لیکن وہ برابر ان معصوم پرندوں کے ذریعے اپنے پیغامات نشر کرتی رہی۔

ایک روز اس نے سنا کہ گھر کی طلائی ضریح فروخت کرکے کوئی قرض ادا کیا جائے گا۔ اس نے اپنے تمام جانوروں سے اس بات کی شدید مخالفت کی لیکن جب اس کی نظروں کے سامنے ضریح فروخت ہونے کے لیے جانے لگی تو اس نے چیخ چیخ کر تمام جانوروں سے کہا۔ "میں ہزار بار کہہ چکی ہوں کہ ضریح ہرگز ہرگز نہ بیچو۔ تمہیں شرم نہیں آتی میاں مٹھو! اگر ضریح بک گئی

تو خاندان کی عزت بک جائے گی، کیا اب تم اتنے بے حیا ہو چکے ہو، تمہیں یہ بھی شرم نہیں کہ لوگ کہیں گے کہ فلاں گھر کی ضریح ہے، دیکھو میں کہے دیتی ہوں اگر ضریح بیچی گئی تو بہت برا ہوگا''

لیکن اس کی بات کو کوئی ذرا بھی خاطر میں نہ لایا اور ضریح فروخت ہونے کے لئے لے جائی جانے لگی۔ ضریح کے جاتے ہی قدسیہ بیگم نے طوطے کے پنجرے کو دور اچھال دیا، لالوں کے پنجرے کو ایک طرف پھینک دیا اور دوڑی ہوئی باغیچے میں آئی تمام پودوں کو روند کر رکھ دیا۔ پھولوں کو درختوں سے جھاڑ کر مسل دیا اور پھر ہانپتی کانپتی ہوئی پلنگ پر گر کر بے ہوش ہوئی۔

من ماں لاکھوں من جرے

سچی بات تو یہ ہے کہ بھوک کی شدت سے انسان جب تلملاتا ہے تو مردار بھی حلال ہو جاتا ہے لیکن وہ انسان جو کھانا تو پا جاتا ہو لیکن اس کا پیٹ نہ بھرتا ہو وہ کیا کرے گا؟ ظاہر ہے کہ حریص بن جائے گا اور پیٹ بھروں کو نگاہِ رشک سے دیکھے گا۔ زیادہ مہذب ہوا تو اس رشک کو کسی پر ظاہر نہیں کرے گا اور حصول رزق کی سعی میں سرگرداں رہے گا۔

پشپا بھوکی تو نہیں تھی لیکن اسے پیٹ بھرا بھی کون کہہ سکتا تھا جب کہ آس پاس اڑوس پڑوس کے پیٹ بھروں کو وہ رشک کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ یہ بھی عجیب سی ہے کہ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ بقول شخصے بھرا بھرتا اور جلا جلتا۔ لیکن پشپا اس آسودگی کے باوجود عجیب مخمصے میں تھی کہ دن کا چین اور رات کا آرام اس پر حرام تھا کہتے ہیں کہ بڑی بوڑھیں اسے دیکھ دیکھ کر جھولیاں پھیلا پھیلا کر دعائیں کرتیں کہ سہاگ ہو تو پشپا رانی کا سا اور نصیبہ ملے لڑکی کو تو پشپا کا جیسا اس کا شوہر تھا کہ بات بات پر صدقے قربان جاتا تھا۔ جدھر جدھر پشپا

جاتی اروَن کی نگاہ سائے کی طرح اس پر ٹکی رہتی۔ ایسی دلسا آمین ہوتی کہ ذرا چھینک بھی آئی تو ڈاکٹر موجود۔ شادی کے دوسرے سال پہلی لڑکی پیدا ہوئی اور تیسرے سال دوسری۔ دونوں کو جوڑیں بھی روں میں رکھ جانا اور لیشپا کو تو ایسا بنا دیا گیا کہ مانو اسے پھولوں میں تولا جاتا ہو۔

شادی کو دس سال بیت گئے لیکن مان گون اب تک ایسا ہو رہا تھا جیسے ابھی وہ کل ہی بیاہی ہو۔ آس پاس انجینیروں کے بنگلے ہی بنگلے تھے۔ سارے انجینیر اپنی اپنی بیویوں کو پیار کرتے تھے۔ پوری کالونی انہی انجینیروں کی تھی لیکن اروَن کا دیوانہ وار پیار تو کچھ ایسا تھا کہ ساری کالونی میں اس کا چرچا تھا اور ہر سہاگن لیشپا پر رشک کرتی تھی لیکن لیشپا تھی کہ کمھلایا ہوا پھول۔ نہ دن چین نہ رات۔ اکثر راتوں میں تو اس نے عجیب سی الجھن محسوس کی۔ راتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دیں پر من کی بات ہونٹوں پر نہ آنے دی کہتی تو کس سے کہتی اور اگر کسی سے کہتی بھی تو آخر کیا کہتی جب کہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کا کرب کیا ہے؛ بے چینی کیا ہے؛ درد کیا ہے؛ اور اس کا علاج کس کے پاس ہے ......؟؟"

مایا کی جگہ مایا موجود، شوہر تھا کہ دیوتا، بچیاں تھیں کہ نیک اور فرماں بردار، اسکول کے وقت اسکول، کھانے کے وقت کھانا، ناشتے کے وقت ناشتہ۔ کھیل کے وقت کھیل اور مزہ یہ کہ سارے کام کرنے کے لئے ملازموں کی فوج ظفر موج بھی گھر میں موجود کہ لیشپا کے پیٹ کا پانی نہ ہلتا۔ اروَن زیادہ تر باہر رہتا۔ آتا تو کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لاتا جسے لیشپا بے دلی سے قبول کرتی۔ جب تک وہ رہتا بقول شخصے لیشپا کے تلوے دھو دھو کر پیتا...... اس کے جاتے ہی لیشپا کو عجیب طرح کا سکون محسوس ہوتا۔ وہ مزے سے نہا دھو کر لان میں بال بکھرائے بیٹھ جاتی۔ اڑوس پڑوس کی کوئی عورت آجاتی تو کچھ بول لیتی ورنہ کوئی کتاب یا رسالہ لے کر اسے جو بیٹھتی تو رات ہو جاتی۔ بھلا کتاب اور رسالے میں وہ سکون کہاں جسے وہ تلاش کرتی تھی۔ پڑوسی عورتو(ں)

کی باتوں میں وہ طمانیت کہاں جیسے اس کا من چاہتا تھا۔ پاپی من کہاں چین لینے دیتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی پڑوسن اس کے من چاہے موضوع پر بات کرے اور سے کچھ اپنی بات سنائے۔ شاید اسی طرح کچھ اس کے دکھ کا علاج نکل آئے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا نہیں ہوا پھر بھلا وہ کیسے اس موضوع پر بات کرتی۔ ہائے رام وہ کیسے کرتی، لفظ ہی کہاں سے لاتی جن میں یہ بات ہو سکتی۔ نہیں نہیں یہ بات وہ کیسے کر سکتی ہے اور کس سے کر سکتی ہے۔ لوگ سنیں تو کیا کہیں گے کہ سہاگ کی جگہ سہاگ مایا کی جگہ مایا، اولاد کی جگہ اولاد سب کچھ موجود ہے۔ اس سے زیادہ اگر کچھ اور چاہیے تو عورت نہ ہوئی کلنکن ہوئی، طوائف ہوئی، فاحشہ ہوئی، چکلے کی بیٹھنے والی۔ توبہ توبہ وہ بھلا اتنی بڑی ذلت کیسے سہہ سکتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں وہ ایسی بے عزتی سے تو موت بہتر سمجھتی ہے۔

پڑوس میں ایک نیا انجینیر اپنی نو بیاہتا بیوی کو لایا۔ پشپا خود بخود اس کے قریب پہنچ گئی۔ لڑکی خوبصورت بھی تھی اور خوش مزاج بھی۔ پشپا جلد ہی اس سے بے تکلف ہو گئی۔ شادی کی خوشی سے اس کے انگ انگ میں نیا خون دوڑ رہا تھا اور رگ رگ سے خوشیاں ابلی پڑتی تھیں۔ ایسی بھرپور خوشی پر پشپا کو کیسے نہ رشک آتا لیکن پشپا نے لاجونتی کو ٹٹولا اور کریدا وہ شرما کر بھاگ جاتی اور پشپا کو اس کے مطلب کی بات ہاتھ نہ لگتی اس غوطہ خور کی طرح جو گہرے سمندر میں اتر جاتا ہے موتیوں کی تلاش میں اور کچھ بھی نہیں پاتا۔ چند خزف ریزے بھی ننھے نہ چڑھتے۔

اسی طرح گھر کے مالی کا بیاہ ہوا۔ دیہاتی آدمی تھا۔ پندرہ سولہ برس کی ایک مضبوط دیہاتن بیاہ لایا۔ دیکھتے دیکھتے چند سال میں بچوں کی ریل پیل ہو گئی۔ ایک گود میں تو دوسرا پیٹ میں تانتا بندھا رہا۔ لیکن وہ اللہ کی بندی نہ منہ سے بولتی تھی، نہ سر سے کھیلتی تھی۔ من ہی من میں مزے لیتی تھی۔ اس سے بھی پشپا کو کوئی بات نہ ملی۔

اروِن تھا کہ لاکھ اس کی افسردگی اور پژمردگی کو پوچھتا لیکن من کی بات ہونٹوں تک نہ آتی۔ پر نہ آتی۔ من کی من ہی میں رہ جاتی۔ وہ صرف مسکرا کر اتنا کہتی: "کچھ بھی تو نہیں ٹھیک ٹھاک ہوں۔" وہ جانتی تھی کہ یہ سچی بات نہیں ہے سراسر جھوٹ ہے لیکن یہ منافقت اسے کون سکھا رہا تھا یہ بھی اسے معلوم نہ تھا۔ اروِن بہت اداس ہوتا اور بے چین ہو کر کہتا "نہ جانے کیا روگ لگا لیا ہے تم نے، نہ ہنستی ہو نہ بولتی ہو۔ صحت تو اچھی ہے پر وہ بات نہیں جو ہونا چاہیئے۔"

من میں تو وہ بھی یہی کہتی کہ وہ بات نہیں جو ہونا چاہیئے پر زبان سے کہتی "روگ ووگ نہیں ہے کوئی..... بس آپ نہیں ہوتے تو من کو شانتی نہیں ملتی" اروِن کہتا "اور جب میں ہوں تو شانتی ملتی ہے من کو۔"

پشپا لگاوٹ سے مسکراتی لیکن منافقانہ انداز میں کہ اس کا من خود ہی اسی کو لعنت ملامت کرتا کہ تو جھوٹی ہے بالکل جھوٹی ہے تیرے من کو شانتی ملی ہی نہیں ہے آج تک۔ من کی بھوک، من کی پیاس من ہی من میں ہے کسی سے کہی نہیں جا سکتی۔ کسی کو کوئی خبر نہیں کسی کو کچھ پتہ نہیں..... نہ وہ سکون مایا میں ہے نہ خاوند کے پیار میں اور نہ آل اولاد میں۔ پتہ نہیں، وہ بے نام سی بے چینی ہے کیا بلا! اور آیا یہ کہ وہ سکون اسے نصیب بھی ہو گا کبھی کہ نہیں۔

ایک بار پشپا کی ماں اسے دیکھنے کے لئے بنارس سے لکھنؤ پہنچیں اسے خیال آیا کہ شاید ماں کو دیکھنے سے وہ طمانیت حاصل ہو جائے۔ پر چند ہی روز میں اس کی زندگی اسی معمول پر آ گئی حتیٰ کہ ماں نے بھی کہہ دیا "کیا ہو گیا ہے تجھے پشپا تو تو گھر میں ہر وقت ہنستی بولتی رہتی تھی۔ اچھلتی کودتی پھرتی تھی اب تو تجھے ہنستے دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔ کتنے دن ہو گئے میں دیکھ رہی ہوں، نہ پتہ پتی کا پیار ہے اور نہ ان کے واہیں ممتا کی لہریں جو اٹھتی ہیں دہ ہیں کہ عورت ایک ساگر کی مانند

مہان بن جاتی ہے وہ بات نہیں ہے۔ مایا تو ایسا درخت ہے کہ عورت اس سے بیل کی طرح لپٹ کر خوب پھلتی پھولتی ہے ..... تیرے اندر ایسی کوئی بات دکھائی نہیں دیتی ہائے رام کوئی روگ تو نہیں لگا لیا تو نے ......؟"

ماں سے بھی وہ جھوٹ بولی "نہیں ماں مجھے کوئی روگ نہیں اگر کوئی روگ ہے تو سکھ روگ ہے۔ ارون کے گھر مجھے سب کچھ ملا ہے سب کچھ ملا ..... مجھے کچھ نہیں چاہیئے" پر اس نے محسوس کیا کہ اس کے من کے اندر ایک دوسری پشپا جو چھپی بیٹھی ہے وہ قہقہے لگا رہی ہے خوب زوروں سے ہنس رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ "تو جھوٹی ہے بالکل جھوٹی ہے .... مجھے معلوم ہے کہ تجھے سکھ نہیں ہے تیرا من سکھ کی تلاش میں ہے۔ سکھ جو امرت ہے آب حیات ہے۔ اسے تیرا من چپکے ہی چپکے تلاش کر رہا ہے پر ملتا کہیں نہیں ہے۔ مل جائے تو ڈگڈگا کر تو پی جائے گی تو۔ بڑی حریص ہے حامع ہے مجھے پتہ ہے تو بہت چالاک ہے منافق ہے۔

ماں چلی گئی پشپا کو نہ تو اس کے آنے سے سکون ملا نہ جانے سے چند دن تک ذرا سی اداسی رہی پھر زندگی معمول پر آگئی اور وہی بے نام سی خلش شروع ہو گئی۔ ارون گھر میں نہ ہوتا تو اسے اس کے نہ ہونے سے جو تھوڑا سا سکون ملتا وہ احساس تنہائی سے غارت ہو جاتا اسے دکھ کا تازہ احساس اور بھی پریشان کر دیتا۔ ایک بار تو اس نے حد کر دی چپکے چپکے مالی کے کوارٹر کے پاس جا پہنچی۔ اندھیری رات تھی۔ کوارٹر میں روشنی ہو رہی تھی اس نے اندر جھانک کر دیکھا دونوں میاں بیوی ایک ہی بستر میں بے خبر سو رہے تھے۔ بچے الگ سو رہے تھے مگر سونے میں بھی دونوں کے چہروں پر خوشی اور اطمینان جھلک رہا تھا..... وہ واپس آگئی اور خود سے پوچھنے لگی۔ کیا یہ اطمینان مجھے حاصل ہے؟ اس کے اندر کی پشپا نے کہا "کہاں ہے یہ اطمینان بھلا تیرے مقدر میں کہاں یہ طمانیت یہ تو قسمت والیوں کو ملتی ہے۔"

یوں ہی منہ اٹھائے لاجونتی کے پاس ایک روز وہ جا پہنچی۔ دبے پاؤں اس کے کمرے میں جھانکا تو بہت سی تصویروں کے مطالعے میں غرق پایا۔ چپکے سے پیچھے جا کھڑی ہوئی تصویریں سب کی سب ولائتی عورتوں اور مردوں کی تھیں اور نہایت درجہ قابل اعتراض حالتوں میں اتاری گئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ یورپ کی وہ عورتیں تھیں جو جسم بیچتی ہیں اور تصویریں کھنچوا کر بکوا دیتی ہیں۔ لاجونتی کو جو آہٹ ملی تو جلدی سے اس نے تصویریں لحاف میں چھپا دیں۔

"ارے دیدی، کب آگئیں تم، مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا" لیکن اس کا چہرہ تھا کہ جوش اور مسرت سے تمتما رہا تھا جذبات تھے کہ ابلے پڑ رہے تھے اور آواز میں کپکپاہٹ تھی پشپا اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ لحاف میں ہاتھ ڈال کے تصویریں نکالیں اور بولی:

"لاجونتی رانی یہ کھیل تو تم کھیلتی ہی رہتی ہو من نہیں بھرتا تمہارا"۔ لاجونتی اور بھی سُرخ ہو گئی جھینپ کر بولی "کیلاش لائے تھے کہتے تھے اسے دیکھو عورت اور مرد دونوں کس قدر خوش ہیں مجھے ان کے سامنے دیکھتے لاج آتی ہے دیدی!"

"ہنھ" پشپا بولی اور خود نہایت انہماک سے وہ تصویریں دیکھنے لگی۔ ایک ایک تصویر کو خوب غور سے دیکھتی رہی، استری اور پرش دونوں کی مسرت کا اندازہ کرتی رہی اور جب اٹھ کر اپنے گھر آگئی تو اسے یوں لگا کہ اس کے اندر جوالا مکھی ابل رہا ہے جیسے ہزار ہا تنور اس کے اندر سلگ رہے ہیں۔ جاڑے کے باوجود بار بار اس کا حلق خشک ہوا جاتا ہے۔ دل ہے کہ کسی طرح قابو میں نہیں آتا۔ کمرہ بند کر کے اس نے ایک ایک لباس کا تار تار پھینکا۔ بند کمرے میں ٹہلتی رہی، جی چاہتا تھا کہ برف کی سلوں پر خوب لوٹنیاں لگائے۔ برف کے ساگر میں اتر جائے اور اپنے بدن کے جوالا مکھی کو برف میں اتار کر مزے سے سو جائے۔ اسی سمے یہ ہوا کہ خواب سے اس کی چھوٹی لڑکی بملا چونک پڑی اور رونے لگی۔ جلدی جلدی کپڑے پہن کر وہ کمرے میں پہنچی

بتی جلائی۔ بچی کو دیر تک تھپکیاں دیتی رہی۔ بچی جاگ اٹھی تھی بولی "ماں تمہیں تو خود بخار ہے۔ جاؤ
سو جاؤ۔ اب میں ٹھیک ہوں۔" پٹ پا اپنے کمرے میں تو آ گئی پر نیند نہ آئی۔ ساری رات ٹہل ٹہل کر
گذار دی اور سوچتی رہی کہ یہ بخار تو اسے کئی سال سے ہے اور پتہ نہیں کب تک رہے گا۔ ا
پتھر کے عجائب گھر میں پرانی مورتیوں کی نمائش دیکھنے گئی تو شیو اور پاربتی کے ہمیشی ارتباط
کے سینکڑوں بت اس نے دیکھ ڈالے پر نہ ارادت پیدا ہوئی دل میں نہ عقیدت۔ بس پاربتی
اسے اس لیے ایک مہان استری نظر آئیں کہ شیو نے ان کی تکمیل کر دی تھی اور ان کے چہرے
پر وہ تیج نظر آتا تھا جو بہت کم استریوں کو ملتا ہے اور جب ملتا ہے تو استری مہان بن جاتی
ہے دیوی بن جاتی ہے۔

اروِن ایک بار رات میں آیا۔ جیپ میں اس کے ساتھ شکاری لباس میں لمبا تڑنگا
خوبصورت سا اجنبی آدمی بھی تھا جس نے آتے ہی پٹ پا کو کچھ اس انداز سے دیکھا! وہ گھبرا گئی جیسے
مردوں کی سبھا میں کسی نے اس کو ننگا کر دیا ہو۔ اروِن بولا "خورشید یہ ہیں میری پتنی پٹ پا یہ ہے میرا
لنگوٹیا یار خورشید.... شکار کا بڑا شوقین ہے اودھ فارسٹ میں شکار کھیلے گا... میں اسے ساتھ
لے آیا ہوں" اس نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا لیکن یوں لگا جیسے وہ شیو کے سامنے کھڑی ہے اور
پاربتی بننا چاہتی ہے، ایک معمولی پجارن ہے جو اپنے من مندر میں اسی شیو کو کھوج رہی تھی۔ خورشید
نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور اسے یوں لگا جیسے خورشید نے اسے پا لیا ہو۔ اسے کچھ عجیب سا لگا وہ
جلدی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اروِن اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ دھیرے سے بولا "پٹ پا اسے
برابر کا کمرہ دے دو کچھ دن شکار وکار کر کے چلا جائے گا" مگر اسے تو جیسے سدھ ہی نہیں رہی تھی
وہ کہتی تو کیا کہتی.... چپ چاپ خورشید کے لیے بستر لگوا کر کمرے کا انتظام کر دیا۔ رات میں پٹ پا
سوئی تو حسب معمول اروِن کی باہوں میں لیکن ایسی مدہوش جیسے اروِن آج سچ مچ اس کے لیے

ایک بیش قیمت تحفہ لایا ہو۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو ارون دورے پر جا چکا تھا بچے اسکول جا چکے تھے خورشید کی موجودگی کا تصور کچھ ایسا اس کے انگ انگ میں سمایا کہ خورشید بنفس نفیس اس کی خوابگاہ میں آکر کھڑا ہوا لیکن اسے مطلقاً محسوس نہ ہوا وہ تو خود اپنے آپ میں کھوئی ہوئی تھی۔ خورشید ہنسا تو یوں لگا جیسے جھرنوں کا پانی اُبلا، پشپا چونکی، گاؤن سے خود کو اچھی طرح ڈھنکا اور مسکراتی، شرماتی لجاتی اُٹھ بیٹھی۔

"آپ"۔

"جناب"

وہ مسکرایا اور بڑی بیباکی سے پشپا کے قریب پہنچ کر بولا:

"اور یہاں کئی بار آپ کو سوتے ہوئے دیکھ گیا ہوں"۔

"اچھا" وہ گھبرا گئی ..... "مجھے جگایا کیوں نہیں؟"

"آیا تو جگانے ہی کے لئے تھا" وہ قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا "مگر کچھ سوچ کر رہ جاتا تھا" وہ غسل خانے کے دروازے پر کھڑے کھڑے انگڑائی لیتے ہوئے رک گئی کہ مبادا خورشید اس کے من کی بھاونا نہ پا جائے مسکرا کر بولی "کیا سوچ کر رہ جاتے تھے آپ؟"

"یہی" وہ پائپ سلگاتے ہوئے بولا "کہ فتنۂ خوابیدہ کا جگانا اچھا نہیں"۔

"چلیئے بھی" وہ غسل خانے کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔

"آپ ڈائننگ روم میں بیٹھیئے میں ابھی ناشتے پر ملوں گی"۔

"ایک شرط پر" خورشید کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ پشپا رک گئی بند دروازہ دوبارہ کھول کر بولی۔ "وہ کیا؟" خورشید دروازے میں آکر کھڑا ہو گیا اور اس سے اس قدر قریب کھڑا ہو گیا کہ پشپا کے ریشمی بال اس کی ٹھوڑی کو چھونے لگے۔

"ناشتے کے بعد میرے ساتھ شکار پر چلنا پڑے گا۔"

ایک بار پھر اس کی آنکھیں مندنے لگیں، اور وہ بڑی خود سپردگی کے انداز میں بولی "چلوں گی۔"

اور دروازہ بند کر لیا مگر دیر تک دروازے سے لگی دل کی دھڑکنیں سنتی رہی۔ خورشید کے بھاری بھاری قدموں کی آواز اس کے کانوں سے ٹکراتی ہوئی دور ہوتی چلی گئی۔ اسی سمے اس کے من میں بیٹھی ہوئی پشپا نے کہا "پشپا رانی..... غسل خانے کے دروازے تو تم نے بند کر لئے۔ ذرا دل کے کواڑ بھی تو دیکھو..... دل کے کواڑ تو چوپٹ کھلے ہوئے ہیں۔" اس نے ایک بار پھر غسل خانے کی کھڑکی کے پاس پنجوں کے بل کھڑے ہو کر صحن میں دیکھا تو طویل القامت خورشید بڑی شان بے نیازی سے کھڑا پائپ پی رہا تھا، گاؤن سے اس کے سینے کے سیاہ بال جھانک رہے تھے اور وہ ہر طرح ایک وجیہہ اور متین آدمی نظر آ رہا تھا جیسے ہر شے پر چھایا جا رہا ہے، ہر شے اس کی ذات میں گم ہوتی جا رہی ہے۔ اس نے لباس اتار کر شاور کھول دیا۔ اور ننھی ننھی بوندوں کو گرم گرم جسم میں جذب کرتے ہوئے بڑی لذت محسوس کی۔

جب ناشتے کی میز پر وہ خورشید کے روبرو بیٹھ کر ناشتہ کر رہی تھی کہ اسے یوں لگ رہا تھا کہ خورشید اس کا پتی ہے..... اس کا مجازی خدا ہے..... دیوتا ہے اور جیسے وہ کہیں چلا گیا تھا اب پھر واپس آ گیا ہے..... توبہ توبہ دل میں اس نے کئی بار کہا کہ یہ اسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ ارون کے ساتھ پلو سے پلو باندھ کر دہکتی آگ کے کتنے پھیرے ڈال کر اس نے وفادار رہنے کے عہد کئے تھے اور بھری سبھا میں ساتھ مرنے اور جینے کی قسمیں کھائی تھیں اب وہ بہک رہی تھی۔ خورشید کی پیشانی کتنی اونچی تھی، ناک کیسی ستواں تھی۔ آنکھیں زیادہ بڑی نہیں مگر ان میں جو چمک تھی وہ کیسی من موہنی تھی۔ دہانہ ذرا سا بڑا، ہونٹوں میں ذرا سا خم، ٹھوڑی کے انداز میں مردانہ وقار۔ چوڑے چکلے کندھے، فراخ سینہ، جس پر سیاہ بالوں کے چھتنار جنگل

سے پھیلے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے اور بھرے بھرے ہاتھ، سرخ رنگت جیسے انار، سر پر گھنے بال جو کنپٹیوں سے ایک آدھ جگہ پر سپید ہو چلے تھے۔ اروِن نے بتایا تھا اسے کہ خورشید کو نِسکار کا کچھ ایسا خبط تھا کہ بتیس تینتیس کا ہو رہا ہے لیکن شادی نہیں کی۔ کہتا ہے شادی کے بعد نِسکار کی آزادی ختم ہو جائے گی۔ پٹ پا نے ٹوسٹوں پر مکھن لگا کر، سٹر بیف کی ایک ہلکی سی پرت لگا کر سینڈوِچ بنا کر خورشید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''اروِن نے کہا ہے کہ آپ کی صحت کا خیال رکھوں..... لیجیے۔''

خورشید نے سینڈوچ منہ میں رکھتے ہوئے دوسرا سینڈوچ خود بنا کر پٹ پا کو دیتے ہوئے کہا۔

''شکریہ'' اور گاؤن سے جھانکتے ہوئے چاندی کی سی رنگت کے سینے پر نظریں گڑا کر بولا ''میں تمہیں بھابی نہیں کہوں گا۔''...... پٹ پا کو احساس ہو گیا تھا اس نے گریبان کو بھینچتے ہوئے کہا ''کیوں'' اور من ہی من میں کھل اٹھی کہ خورشید اس کو سمجھ گیا ہے، اس کو پا گیا ہے' اس کے من میں کتنی جلدی اتر کر من کی بات اڑا لایا ہے۔ ''کیا میں بھابی نہیں ہوں۔'' اس نے سینڈوچ منہ میں دباتے ہوئے نفی میں گردن ہلا دی اور اپنا ہاتھ اس کے منہ کے قریب لے گیا تاکہ وہ سینڈوچ اس کے ہاتھ سے کھا سکے۔ پٹ پا نے ہاتھ بڑھا کر سینڈوچ لینا چاہا تو خورشید نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ''یوں نہیں'' اور سامنے کرسی چھوڑ کر اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور اپنے ایک ہاتھ سے اسے گرفت میں لے کر دوسرے ہاتھ سے سینڈوچ اس کے ہونٹوں میں ہولے سے دبا دیا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور پٹ پا کی نگاہیں جھک گئیں۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اتنے زور زور سے اس وقت دھڑکا تھا جب حجلۂ عروسی میں پہلے پہل اروِن نے قدم رکھا تھا۔

ناشتے کے بعد خورشید برجیس پہن کر رائفل لٹکا کر پٹ پا کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ پہلے ہی

تیار تھی۔ خورشید بولا "پشپا تمہیں معلوم ہے میں کنوارا ہوں" وہ بولی "جی ہاں" اور خود ہی مسکرائی "مگر تمہارے اس بات کا کیا تعلق ہے۔" خورشید اسے لئے ہوئے باہر آیا اور جیپ کے پاس رک کر بولا "تعلق ہے" وہ آگے ہی اس کی سیٹ کے پاس چشمہ لگاتے ہوئے بولی۔

"وہ کیا؟"

اس نے اسٹیرنگ پر ہاتھ ٹکاتے ہوئے کہا "پشپا میں نے زندگی بھر صرف شکار ہی نہیں کھیلا ہے۔۔۔۔ اپنے جیون ساتھی کی بھی تلاش کرتا رہا ہوں۔"

اس نے شرارت سے کہا "چہ چہ چہ۔۔۔۔ مجھ سے کہا ہوتا اگر۔۔۔۔ میں آپ کو بڑی سندر سی جیون ساتھی تلاش کر دیتی۔"

خورشید نے کہا "مذاق نہیں پشپا، تمہیں رات پہلی بار دیکھ کر یوں لگا جیسے میں تمہی کو تلاش کر رہا تھا۔۔۔۔ اور آج میں نے تم کو پا لیا۔۔۔۔ مگر یہ کیا۔۔۔۔ تم ملیں بھی تو ایسے جیسے شجرِ ممنوعہ۔"

"شجرِ ممنوعہ" اس نے دہرایا "وہ کیا ہوتا ہے؟"

خورشید نے جیپ کی چابی گھماتے ہوئے اسے اسٹارٹ کیا "جنت میں وہ درخت جس کے قریب جانے سے آدم کو روکا گیا تھا۔"

اس نے کہا "مگر جانتی ہو آدم نے کیا کیا؟"

"کیا؟"

"آدم نے مگر گناہ کر کے چھوڑا۔"

پشپا سب کچھ سمجھتے ہوئے انجان بن رہی تھی۔ عورت محبت کے معاملے میں بڑی منافق واقع ہوئی ہے۔ محبت کے سوا وہ کچھ چاہتی بھی نہیں اور محبت کے بنا رہتی بھی نہیں اور محبت نہ مل سکے تو وہ کچھ کہتی بھی نہیں خواہ اس محبت کی تلاش میں ازل سے ابد تک بھی

سفر کرنا پڑے تو وہ کہے گی کچھ نہیں اور اگر کہیں ایک رتی بھی پا جائے تو مٹھی میں دبالے گا۔
چھپالے گی دامن میں حریص بچے کی طرح جھٹ سے سب کی نظریں بچا کر جیب میں رکھ لے گی
اس سیپی کی طرح جس میں آبِ نیساں کا ایک قطرہ پہنچتا ہے اور سیپی فوری منہ بند کر لیتی ہے۔
رحمِ مادر کی طرح جو جذبۂ تخلیق سے سرشار رہتا ہے اور ایک ادنیٰ سے جوہر کو پاتے ہی چھپا لیتا ہے
زمین کی طرح اس دھرتی کی طرح جو بیج کو اپنے سینے میں جگہ دیتی ہے نشو ونما کرتی ہے اور پال
پوس کر جوان کر دیتی ہے ...... دس سال تک خشک دھرتی کی طرح پٹ پا پڑی رہی ......
ارون کے گھر اسے سب کچھ ملا۔ وہ محبت نہیں ملی جس کی وہ بھوکی تھی۔ ارون نے اسے
پورے دس سال ایک دیوی کی طرح پوجا تھا مگر وہ دیوی نہیں تھی۔ اور نہ دیوی بن کر
خود کو پجوانا چاہتی تھی۔ وہ خود دیوتا کی تلاش میں رہی تھی تھی وہ تو ایک ادنیٰ سے ذرے
کی طرح دیوتا کی عظیم شخصیت میں گم ہو جانا چاہتی تھی۔ ارون خود ذرہ بن گیا تھا اور
اسے دیوی کی طرح مہان بنا کر بڑے اونچے استھان پر بٹھا دیا تھا اور دس سال تک
اس نے شب و روز اس کی پوجا کی تھی مگر اس پوجا سے اسے کیا ملا تھا۔ اس کی شخصیت
کی تکمیل کہاں ہوئی تھی ...... وہ بھی تو ایک دل رکھتی تھی۔ ایک ایسا دل جس میں پرستش
کرنے، پوجا کرنے اور خود کو کسی پر فدا کرنے کا جذبہ ہوتا ہے ...... آخر ارون کیوں نہ ایک
دیوتا بن سکا ...... جس کے حضور میں وہ خود کو ایک ادنیٰ پجارن کی طرح پیش کرتی اس
کے چرنوں میں خود کو ڈال دیتی اور پگھل کر فنا ہو جاتی ...... خورشید کی ذات میں یہ خوبی
تھی کہ وہ دیوتا کی طرح مہان رہتا تھا عظیم رہتا تھا۔ جھکتا نہیں تھا حسن کو خود حضور میں
جھکاتا تھا اور ایک ادنیٰ سے ذرے کی طرح خود میں جذب کر لیتا تھا ......
پشپا نے محسوس کیا کہ خورشید ٹھیک کہہ رہا ہے جیسے وہ ایک دوسرے کو جانتے

پہچانتے ہیں اور ایک دوسرے کے جنم جنم کے ساتھی ہیں لیکن اس نے جان بوجھ کر انجان بن جانے ہی میں بھلا سمجھا۔ اس کے کانوں میں خورشید کا فقرہ گونج رہا تھا.... "آدم نے مگر گناہ کر کے چھوڑا۔"

اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ خورشید میں خوف، ڈر، جھجک اور کسی قسم کے جذبے کو چھپانے والی بات نہیں تھی۔ جیپ پوری رفتار سے چل رہی تھی درختوں کے جھنڈوں میں سے پتلی سی سڑک پر جیپ بھاگتی چلی جا رہی تھی اور پشپا یوں محسوس کر رہی تھی جیسے بادلوں میں خورشید اسے اڑائے لئے جا رہا ہو...... بلند اور بلند، دور سے شیو مندر نظر آیا اس مندر کے بارے میں اس نے بہت کچھ سنا تھا بہت کچھ لیکن آج تک درشن نہیں کئے اور وں اسے لے ہی نہیں گیا۔ خورشید اسے یہ بات کہنے کا اسے حوصلہ نہیں ہو رہا تھا پر من ہی من میں وہ کہہ رہی تھی کاش خورشید اسے اس مندر میں لے جائے اور وہ سچ مچ اچھل پڑی جب خورشید نے اچانک کہا:

"اچھا پشپا تو تم مندر میں جانا چاہتی ہو..... ہیں نا۔"

وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولی کہیں وہ مافوق الفطرت آدمی نہ ہو" ارے آپ کو کیسے پتہ چلا!"

مندر کے پاس پیپل کا ایک پرانا درخت تھا اس کے سائے میں جیپ کھڑی کر کے وہ بولا "پشپا کوئی خاص بات نہیں۔ دل نے کہا کہ تمہارے دل میں ایسی بات آئی ہے۔"

پشپا جیپ سے اُترتے ہوئے بولی "سچ مچ میرے دل میں یہی بات تھی۔"

خورشید مسکرایا اور بولا "تم کتنی خوبصورت ہو پشپا۔"

اور وہ شرم کے سمندر میں ڈوب گئی جب خورشید نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے

قریب کر لیا اور اپنے سینے میں اسے بھینچ لیا پھر ہولے ہولے اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا "تم رات میں جتنی سندر تھیں صبح اس سے بھی زیادہ سندر لگ رہی تھیں۔ جوں جوں تم میرے قریب آ رہی ہو اور بھی حسین بنتی جا رہی ہو..... میں جھوٹ نہیں بولتا ہوں آج تک کسی عورت نے مجھ پر جادو نہیں کیا اور نہ میں دیوانہ ہوا کسی عورت کا..... مگر تم؟"

پشپا درخت کی ایک موٹی سی جٹا کے پاس کھڑی ہو گئی اور خورشید کے سراپا میں کھوتی چلی گئی جیسے ایک ایک بات امرت میں ڈوبی ہوئی ہو جیسے اس کی آواز خود پشپا کے من کی آواز ہو..... دونوں نے از خود پاؤں دھوئے اور از خود مندر میں چلے گئے۔ شیو اور پاربتی کی مورتیوں کے قریب قریب خود بخود دونوں کھڑے ہو گئے۔ پھر دونوں خود بخود ایک دوسرے کے قریب کھسکتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ مندر سنسان تھا۔ بیابان جنگل تھا۔ دور دور تک آدمی آدم زاد کا ذکر نہ تھا۔ درختوں پر کوئی پرندہ بھی پھڑپھڑاتا تھا تو دور تک آواز گونجتی تھی۔ پیپل کے درخت نے پورے مندر کو حصار میں لے لیا تھا اور جب کوئی فلک کا ستایا ہوا پرندہ درخت پر بیٹھ کر روتا تھا تو آسمان کا گنبد بڑا گونجتا تھا۔ اس وقت دور دور تک کوئی پرندہ تھا اور نہ پرندے کا پر۔ وہ کچھ اس طرح خورشید میں کھو کر رہ گئی جیسے پاربتی شیو میں کھوئی ہوئی تھی۔

خورشید کچھ دیر تو مندر میں رہا پھر وہ باہر آ گیا..... اور جیسے وہ بھی ڈوری میں بندھی ہوئی اس کے ہمراہ کھنچی ہوئی چلی آئی جیسے وہ مقناطیس تھا جس سے اس کا وجود چپکا ہوا تھا دونوں چپ چاپ جیپ میں آ بیٹھے اور قبل اس کے جیپ اسٹارٹ ہو، خورشید نے من موہنی مسکراہٹ سے پشپا کو دیکھا پشپا کھل گئی، اس کا سر خود بخود ڈھلک کر خورشید کے کندھے سے لگ گیا اور آنکھیں خود بخود محبت کے نشے سے بوجھل ہو گئیں۔ خورشید نے مسکرا کر اس کی بوجھل سانسوں کو خود میں جذب کر لیا اور جیپ بڑھا دی جیپ آہستہ آہستہ رینگنے لگی لیکن پشپا کو مطلقاً کچھ خبر نہ ہوئی۔ وہ بدستور خورشید کے

کندھے سے سر ٹکائے مدہوش پڑی رہی۔ ایک ہاتھ سے خورشید نے اس کے بالوں میں کنگھی سی شروع کر دی اور دوسرے ہاتھ سے اسٹیرنگ گھماتا رہا۔ پشپا نے خورشید کی قمیص کے بٹن کھول کر سینے پر اگے ہوئے گھنے اور چھتنار بالوں میں منہ رکھ دیا۔ معاً جیپ رک گئی۔ پشپا نے دیکھا کہ یہ ایک ہولناک جنگل تھا۔ جہاں دور دور تک جنگلی گھاس اور ڈھاک کے درختوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ پاؤں لٹکا کر خورشید نیچے اترا اور پشپا کو یوں گود میں اٹھا لیا جیسے وہ ایک پھول ہو جسے کسی نے اپنی مرضی سے اٹھا کر کوٹ کے کالر میں لگا لیا ہو، اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی، وہ اسے دور تک اسی طرح اٹھائے لئے چلا گیا جیسے شیر اپنے شکار کو دبوچ کر کچھار میں چلا جاتا ہے گھنے گھنے درختوں سے دھوپ تک مشکل چھن کر باہر آسکتی تھی۔ نہ کوئی جانور تھا نہ پرندہ، اگر وہ ادن کے ساتھ ایسے خوفناک جنگل میں آئی ہوتی تو مارے ڈر کے اس کا برا حال ہوتا لیکن خورشید کی ذات میں اسے تحفظ کا بھرپور احساس ہو رہا تھا۔ وہ اسے ایک بلند سی پہاڑی پر لایا جہاں ایک درخت کا تنا پڑا تھا دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی۔ درخت کا تنا ایک جگہ پر بہت سی شاخوں کی وجہ سے خوب چوڑی چکلی چارپائی بنا ہوا تھا۔ پشپا کو اس پر لٹا کر خود وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ بیٹھ پر پڑی سفری بوتل سے پانی انڈیل کر دو گھونٹ پیا ہوگا کہ پشپا بھی اس کے قریب ہی زمین پر آ بیٹھی اور اس نے جھپٹ کر خورشید کا جھوٹا پانی ڈگڈگا کر پی لیا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس دیے اور پھر اونچی گھاس پر لیٹ گئے۔ کچھ دیر تک دونوں قریب قریب پڑے رہے پھر اچانک پشپا اٹھی اور اس نے خورشید کی قمیص کے سارے بٹن کھول دیے اور اپنا منہ اس کے گھنے بالوں میں چھپا لیا اور جیسے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہی ہو……

دوسری صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو مسرت اور شادمانی کا نشہ اس کے انگ انگ سے ٹپک رہا تھا۔ خورشید جا چکا تھا جیسے ایک باد بہاری کا جھونکا آیا اور چلا گیا لیکن سوکھی ہوئی جڑوں کو شاداب کر گیا۔

موئے آتش دیدہ

لکھنؤ میں وہ میری آخری رات تھی۔

دوسرے ہی دن مجھے اس شہر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا تھا۔ عزیز رشتہ داروں دور دراز کے کنبے والوں، دوست، دشمن ہر ایک سے رخصت ہو کر اپنے آبائی مکان کی چھت کے نیچے جب آخری رات بسر کرنے کی نیت سے لیٹا تو زندگی کا دورِ گذشتہ نظروں میں گھومنے لگا اور جب کتابِ ماضی کا ایک ایک ورق تمام ہو گیا تو آبائی مکان کے در و دیوار زبانِ خاموشی میں مجھ سے ہمکلام ہو گئے۔

یہ ایک قدیم وضع کا خستہ اور کہنہ مکان تھا جسے دو قطعوں میں تقسیم کیا گیا ہو گا۔ زنانے مکان کا حصہ محلسرا کہلاتا تھا اور بیرونی قطعہ دیوان خانہ تھا۔ اب ان میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہا صرف محلسرا کے آثار باقی ہیں اور پائیں باغ کی جگہ پر قد آدم گھمو اور پتا در کے جنگلات کھڑے ہیں کہ سناٹے میں اگر زور سے ہوا بھی چلتی ہے اور ان میں سے گزرتی ہے تو ڈر محسوس ہوتا

ہے۔ دیوان خانے کے کھنڈر اندھیری راتوں میں خوفناک سیاہ دیو معلوم ہوتے ہیں۔ غرضکہ اس مکان میں معلوم کیونکر ایک شہ نشین باقی رہ گئی ہے جسے میرے دادا جان نے کسی نہ کسی طرح مرمت کرا کے اس قابل بنا لیا تھا کہ اس کی چھت کے نیچے سر چھپایا جا سکے اور آج اسی چھت کے نیچے یہ میری آخری رات تھی کل سے یہ مکان بھی اسی کھنڈر کا ایک حصہ بن جائے گا۔ مکان کے در و دیوار نے مجھ سے کہا "تو اب تم یہاں سے نکل جاؤ گے؟"

میں نے دل ہی دل میں جواب دیا "کیا کروں تم کو تو سب کچھ معلوم ہے۔"

مکان نے کہا "اچھا ــــ تمہاری مرضی لیکن آخری بار مجھے نگاہ بھر کر دیکھ تو لو۔"

میں نے کہا: تمہاری ایک ایک اینٹ سے مجھے والہانہ محبت ہے کیونکہ میرے پرکھوں کے پرکھوں نے تمہاری صحبت میں اپنی زندگی کے ماہ و سال گزارے ہیں۔ تمہاری پیشانی پر جو پتھر لگا ہوا ہے جس پر اس مکان کا قطعۂ تاریخ کندہ ہے اس پر میرے مورث اعلیٰ کا نام بھی درج ہے ــــ لیکن کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میرے جد اعلیٰ بھی اپنی پیاری سرزمین کو چھوڑ کر خاکِ وطن سے رشتہ توڑ کر یہاں آئے تھے اور تم کو آباد کیا تھا۔ وہ زمانہ اٹھارویں صدی کا آخر تھا اور اس بیسویں صدی کے نصف النہار پر، میں، کہ اس دودمان کا آخری چشم و چراغ ہوں، یہاں سے جا رہا ہوں اور یہ داستان اسی جگہ ختم ہو جانا چاہیئے کیونکہ اس رات کے باقی ماندہ لمحات بہت جلد ماضی کی داستان پارینہ بن جائیں گے۔"

مکان نے آہِ سرد کھینچی اور کہا: "یہ درست ہے کہ وقت کے پر لگے ہوئے ہیں۔ یہ چند لمحے بھی گزر گئے تو میرے پاس کچھ نہ رہے گا کیونکہ تم میری بہت بڑی دولت ہو۔ تم مجھ سے واقف ہو اور میں تم سے۔ میرے اور تمہارے درمیان کوئی فاصلہ نہیں مکان اور مکین کا۔ سچ پوچھو تو گہرا تعلق ہوتا ہے۔ میں تمہارا امین اور رازدار ہوں، تمہارے خاندان کے معائب و محاسن مجھ پر

مدفن ہیں اور میری تمام فضیلتیں بھی تم پر ہویدا ہیں۔ میری زندگی میں "آج" بہت وقیع ہے اور "کل" میری زندگی میں موت کا پیغام بن کر آئے گا کیونکہ تم مجھ میں سے نکل جاؤ گے جیسے جسد سے روح نکل جاتی ہے تو وہ شخص تودۂ خاک بن جاتا ہے۔ کل سے میرا شمار ان آثار قدیمہ میں ہونے لگے گا جو لاوارث ہیں جن کے باب میں اب کوئی کچھ نہیں جانتا۔ وہ زبانِ خاموشی میں اپنی داستان بیان بھی کریں تو کون سنتا ہے اس زبان کو کون سمجھتا ہے کل سے میری زبان کا سمجھنے والا کوئی نہ ہوگا۔"

میں نے کہا: "پیارے تمہاری یہ دلیل سو فیصد درست ہے۔"

وہ بولا: "پھر میری داستان سن لو۔ کہ اس کے بعد نہ کوئی اسے سنے گا اور نہ میں سنا سکوں گا۔"

میں اٹھ بیٹھا اور بولا "سناؤ سناؤ میری جان! میرے پرکھوں کی جان! میں گوشِ دل سے تمہاری داستان سنوں گا کیونکہ یہ بالواسطہ یا بلاواسطہ میری ہی داستان ہے میرے اجداد کی داستان ہے۔"

وہ بولا: "آج میری حالت زار کو دیکھ کر میری کہنگی اور خستگی کا مشاہدہ کر کے بھلا کس کو یقین آئے گا کبھی پورے محلے کی خوبصورتی کی میں ہی تو جان تھا۔ مجھے دور دور سے لوگ دیکھنے کے لئے آتے تھے تم نے کاش میرے اس جمال و جلال کا نظارہ کیا ہوتا جب تمہارے مورثِ اعلیٰ حیدر بیگ خاں نے مجھے بنوا کر تیار کیا تھا۔"

میں نے کہا: "پتھر پر جو قطعہ تاریخ کندہ ہے اس کی رو سے تو تم۔۔۔"

وہ خوشی سے تقریباً دیوانہ ہو گیا اور میری بات قطع کر کے بولا: "ہاں ہاں جب میری داغ بیل نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر نے اپنے دست مبارک سے رکھی تو حیدر بیگ خاں نے سونے کا ایک چبوترہ بنوا کر نواب سے اس میں ٹھوکر لگوائی تھی اور سارا سونا خیرات کر دیا تھا۔

کہنے کو یہ نواب کا تصدق تھا لیکن حقیقت پوچھو تو حیدر بیگ خاں نے میرا صدقہ دیا تھا۔

"اچھا" میں نے تعجب سے کہا "میں نے تو سنا ہے کہ حیدر بیگ خاں افغانستان کے قرب جوار کی کسی ریاست کے شہزادے اور ولیعہد تھے مسلسل تین راتوں تک حضرت علیؓ کو خواب میں دیکھتے رہے کہ مشرق کی طرف کوچ کی ہدایت دے رہے ہیں اور ریاست تج دینے کا حکم دے رہے ہیں پھر چوتھے روز حیدر بیگ خاں ریاست کو لات مار کر مشرق کی طرف مارا مار گھوڑا دوڑاتے ہوئے چل پڑے حتیٰ کہ لکھنؤ پہنچ گئے۔

وہ بولا "درست ہے، لکھنؤ کی سرزمین پر پہنچ کر حیدر بیگ خاں نے جہاں پہلا پڑاؤ ڈالا تھا وہ یہی تو خاک ہے جس میں آج تک کلیجے سے ور بوچے بیٹھا ہوں دوسرے روز سرِ شام یہاں سے نکل کر شہر کی سیر کے لئے وہ مشیّن نو جوان نکلا۔ اس وقت تمہارا مورث اعلیٰ اٹھائیس انتیس سال کا شاندار کڑیل جوان تھا جملہ علوم و فنون سے واقف و آگاہ اور حلم و بردباری اس کے چہرے مہرے بُشرے سے ہویدا تھی جلال و جمال کا وہ پیکر بنا ہوا گھوڑے پر سوار دریائے گومتی کے کنارے کنارے سیر کرتا جا رہا تھا کہ ناگاہ شور اٹھا کہ ہٹو بچو نواب وزیر الممالک کی سواری آتی ہے۔ ہائے وہ وقت بھلائے نہیں بھولتا اُس وقت کی داستان کو کتنی بار تمہارے بزرگوں نے ایک دوسرے کو سنایا ہے لیکن اس کی جاذبیت میں کوئی کمی نہیں آئی میرے لئے وہ شام آج بھی تازہ ہے اور ویسی ہی شاداب ہے جیسی کہ وہ اُس روز سچ مچ تھی۔ دور مغرب میں سورج ڈوبنے والا تھا۔ ہوا میں نرم نرم مہک اور رباس کی کیفیت تھی اور تمہارا مورث اعلیٰ اس اجنبی شہر میں اس فضا میں سانس لے رہا تھا نواب آصف الدولہ کی سواری بڑے جاہ و جلال، شوکت و شان اور خدم و حشم سے گزر رہی تھی۔ حیدر بیگ خاں ایک درخت کے نیچے گھوڑے پر سوار اس سواری کا نظارہ کرنے لگا۔ ہزارہا گھوڑے سوار فیل نشیں پالکیاں نالکیاں

نہیں ہوا دار پکھپال گزر گئے کہ نواب آصف الدولہ کی سواری کا سواری اس جلوس میں نظر آئی تمہارا مورثِ اعلیٰ گھوڑے سے اُتر کر آدابِ شاہی سے کورنش بجالایا۔ نواب موصوف نے سواری کا ہاتھی روک کر جب نیشاپوری فارسی لہجے میں اس نوجوان کی خیریت پوچھی تو حیدر بیگ نے ایجاز و اجمال کے ساتھ نہایت درجہ نستعلیق لہجے اور پُر وقار شاہی انداز میں کیفیت بیان کی۔ نواب آصف الدولہ جوہر شناس تھے ایک ہی نگاہ ڈالی تھی کہ پرکھ لیا اور مصاحبین و عمالِ حکومت کو اشارہ ہوا کہ اس نوجوان کو ساتھ لے لیا جائے۔ اس طرح تمہارا جدِ اعلیٰ دربارِ اودھ سے وابستہ ہو گیا۔"

میں نے کہا "کہا جاتا ہے کہ حیدر بیگ خاں دربارِ اودھ سے وابستہ نہیں ہونا چاہتے تھے۔"

وہ بولا "یہ درست ہے کہ جب چند روز نواب نے حیدر بیگ خاں کو اپنی مصاحبت میں رکھا اور دیار و امصار کی خوب سی حکایتیں سُن لیں تو حیدر بیگ خاں نے یہ خیال کیا کہ مہانداری ختم ہو تو اجازت لے کر آگے بڑھیں اور سفر جاری رکھیں تاکہ حضرت علیؑ کے حکم کی تعمیل ہو سکے ادھر نواب آصف الدولہ اور ان کے عمالِ حکومت تھے کہ روز بروز حیدر بیگ کے والہ و شیدا ہو رہے تھے۔ اُن کی قابلیت اور بصیرت افروز گفتگو کے گرویدہ بنتے جا رہے تھے۔ مزہ یہ ہے کہ حیدر بیگ نے اپنی تمام گفتگو میں اپنی اصل حیثیت یعنی شہزادگی کو ظاہر نہیں کیا تھا ایک عام مسافر اور سیاح کی حیثیت سے خود کو پیش کیا تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ مُشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید، شہزادگی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ آخر کار حیدر بیگ کو نواب نے مشیرِ اعلیٰ بنایا اور ان کی والدہ ماجدہ نے امورِ سلطنت اودھ کا وکیل بنایا۔

میں نے پھر کھُریدی لی "سنا جاتا ہے کہ حیدر بیگ نے آتے ہی کوئی زمین خریدی تھی اور اسی پر خیمہ زن ہوئے تھے۔"

وہ بیتاب ہو کر بولا "ارے وہ یہی تو سرزمین تھی جس پر میں سر چھپائے کھڑا اور کبھی سر اٹھائے کھڑا تھا!"

میں نے کہا "لیکن کیا بات ہے کہ حیدر بیگ خاں آصف الدولہ کے اصرار کے باوجود نہ کسی محل میں ٹھہرے اور نہ کوئی مکان بنایا۔"

اس نے کہا "حیدر کو انتظار تھا کہ حضرت علیؓ پھر کوئی بشارت دیں تو اس پر عملدرآمد کیا جائے ورنہ سفر جاری رکھا جائے اور آخر کار بشارت ہوئی کہ تم اسی جگہ ٹھہر جاؤ تم سے صوبہ اودھ کو تقویت پہنچے گی۔ نواب اور ان کی والدہ ماجدہ بہو بیگم صاحبہ کے بیحد اصرار پر اور بشارت کے بموجب حیدر بیگ خاں نے قیام کا ارادہ کر لیا اور یہاں اسی مقام پر جہاں تم لیٹے ہو خیمہ ڈال کر مکان کی بنیاد رکھوا دی"

میں نے کہا "اس طرح تم عالم وجود میں آئے۔"

وہ بولا "ہاں پہلے ایک وسیع قطع زمین پر محلسرا کی بنیاد پڑی پھر پائیں باغ بنا بعدہٗ دیوان خانہ تعمیر ہوا اور اس سے ملحق انگوری باغ کی بنا رکھی گئی۔"

میں نے کہا "یہ انگوری باغ وہی تو ہے جہاں پتھر کی دو خوبصورت قبریں بنی ہوئی ہیں۔"

اس نے آہ سرد کھینچ کر کہا "افسوس ایک قبر میں تو حیدر بیگ خاں خود آرام کر رہا ہے اور دوسری میں ——"

"دوسری میں کون ہے؟ ——" میں نے دریافت کیا۔

وہ بولا "دوسری میں کون ہے یہ میں ابھی نہیں بتاؤں گا ورنہ ساری داستان کا مزا کرکرا ہو جائے گا پہلے یہ سنو کہ جب میں ہر طرح سے بن بنا کر اور سج سجا کر تیار ہوا، محلسرا میں خوب اونچی کرسی قائم کر کے شہ نشین بنائی اس کے آگے بارہ دری وسیع ترین دالان بنائے گئے

اغل بغل عالی شان صحنچیاں بنائی گئیں۔ پھر شاگرد پیشے کے حجرے بنے غلام گردشیں وجود میں آئیں پائیں باغ میں سنگ مرمر کی خوبصورت سی نہر بنی باغ کو اونچے اونچے خوبصورت سڈول درختوں سے سجایا گیا۔ قرینے اور قطار سے سیب وبہی کے درخت لگائے گئے۔ مہندی کی روشیں قائم کی گئیں۔ جابجا سنگ مرمر کی چوکیاں بچھائی گئیں۔ شہ نشیں اور دالانوں پر طرح طرح کی رنگ آمیزی ہوئی، گلکاریاں ہوئیں، منبت کاری اور کاشی کاری کی گئی۔ جھاڑ کنول، مردنگیں، سہ شاخے پنج شاخے دیواروں میں لگائے گئے۔ پردے ڈالے گئے، ایرانی قالین بچھائے گئے اور حیدر بیگ خاں کی عزیز ترین بہن مہر افروز محلسرا میں آکر اتری تو مکان کو چار چاند لگ گئے مہر افروز خود بھی چمکتی ہوئی کرن تھی کہ اس کے حسن سے دیوار و در محلسرا کے منور و مستنیر ہوگئے اور اس کا حسن انتظام بھی خوب تھا، نوکروں چاکروں، کنیزوں اور پیش خدمتوں میں حفظ مراتب قائم کیا۔ خواجہ سراؤں کے ذریعے محلسرا اور دیوان خانے کے انتظام کو چمکا دیا۔ زنانی ڈیوڑھی پر محلدار مردانی ڈیوڑھی پر پہریدار اور چوبدار، نوبت خانہ میں ہر ہر پہر کی الگ الگ نوبت بجتی۔ توشہ خانے کا داروغہ الگ، آبدار خانہ کا نظم ونسق جدا، باورچی خانے کا انتظام کسی اور کے ہاتھ، باغ بغیچوں میں سینکڑوں مالی مالنیں اور باغبان ملازم، باہر رمنا بنا ہوا تھا کہ جہاں حیدر بیگ خاں کی سواری کے بہترین گھوڑے، سپید براق، سیاہ نام مشکی، سبزے، ابلقی تازی ولایتی ہر ہر قماش کے موجود رہتے۔ فیل خانے میں بیسیوں ہاتھی۔ گاڑی خانے میں ہر طرح کی گاڑیاں اور سواریاں، رتھیں شکرمیں، پالکیاں نالکیاں، ہوادار سکھپال موجود، دور سے کوئی دیکھتا تو سنہری روپہلی برجیوں اور مدوّر برجوں اور قبّوں کا دلکش اور جاذب نگاہ سلسلہ سا نظر آتا کہ نیلے نیلے آسمان کے نیچے ایک گلستان بکنار معشوق سا معلوم ہوتا۔ صدر دروازے پر ایسا پہرہ رہتا کہ اگر رستم سے چالیس روئیں تن بھی آجائیں تو خوف سے پتا پانی ہوجائے"

میں نے کہا "تم بہت جوش میں ہو۔ ویسے سچ پوچھو تو تمہاری آفرینش کا سارا نقشہ ذہن پر مرتسم ہو گیا، لیکن وہ انگوری باغ میں جو دوسری قبر......"

وہ بات کاٹ کر بولا "تمہیں داستان سننے کا ذرا بھی سلیقہ نہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ میں ابھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا لیکن تم ہو کہ اسی پر مصر ہو۔ خیر آگے سنو ایک روز کیا ہوا کہ حیدر بیگ آصف الدولہ کے دربار میں حاضر تھے اور کمپنی بہادر (ایسٹ انڈیا کمپنی) کا فرستادہ جو فردِ حساب لے کر اودھ پہنچا تھا اس کی رو سے تمام صوبہ اودھ کی آمدنی کا ساٹھ فیصد حصہ کمپنی بہادر کو مطلوب تھا اور بقیہ چالیس فیصد پر اودھ کا گزارا۔ دربار میں تہلکہ مچا ہوا تھا اور محلسرا میں قیامت برپا تھی کہ اب کیا ہوگا۔ یہاں جب ساٹھ فیصد میں گزارا نہیں ہوتا تھا اور چالیس فیصد کمپنی کو دیا جاتا تھا تو بھلا اس کے برعکس صورت میں تو قیامت کبریٰ کا سامنا تھا۔ حیدر بیگ خاں کو نواب بہو بیگم صاحبہ نے اندر محلسرا میں پس پردہ طلب کیا کل حالات سمجھے اور مناسب کارروائی عمل میں لانے کو کہا۔ حیدر بیگ خاں نے بعض اہم نکات پر خوب غور و خوض کرنے کے بعد بڑی خوش اسلوبی سے مقدمہ تیار کیا اور نواب آصف الدولہ سے بعض امور میں مشورہ طلب کیا تو اندازہ ہوا کہ نواب صاحب کو حسابات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے فضول خرچیاں جاری ہیں وزیر علی خاں کی شادی میں فضول خرچیوں کی انتہا ہو گئی۔ عمارتوں اور باغات کی تعمیر میں کروڑہا روپیہ صرف کر دیا گیا۔ اگرچہ شہر خوبصورت ہو گیا لیکن خزانہ پانی کی طرح بہہ گیا اور نواب کو کچھ پتہ نہ چلا۔ غرضکہ بہو بیگم صاحبہ سے مناسب مشورہ کرنے کے بعد حیدر بیگ مقدمہ کے تمام کاغذات لے کر کلکتہ پہنچے اور اس خوبی سے مقدمہ کمپنی بہادر کے ڈائرکٹروں کے سامنے پیش کیا اور ایسے مضبوط دلائل دیئے کہ اودھ کے لئے اسی فیصد اور کمپنی کے لئے آمدنی کا حصہ بیس فیصد قرار پایا۔ یہ اتنا بڑا کام تھا کہ اس زمانے میں اودھ کے کسی اور وکیل سے ممکن

نہ تھا اور نہ ایسا کارنامہ اب تک اودھ کی تاریخ میں کسی اور نے انجام دیا تھا۔ یہاں تو ایک سے ایک کورنمک اور دغاباز بھرے پڑے تھے جو اپنی جیبیں بھرتے تھے اور نواب کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے کھسوٹتے تھے۔ حیدر بیگ نے جب بہو بیگم صاحبہ کو آکر یہ خوش خبری سنائی تو پیش خدمتوں کو حکم ہوا کہ حجابات اٹھا دو، مرزا امانی (آصف الدولہ) میرا پوت ہے حیدر بیگ میرا کماؤ پوت ہے حیدر بیگ خاں اس اعزاز سے خوش ہوا تسلیم بجالایا۔ آصف الدولہ نے بڑھ کر گلے سے لگا یا بھائی بنایا امیرالدولہ امین الملک کا خطاب مرحمت فرمایا لیکن "

"کیا لیکن ــــ؟"

لیکن حیدر بیگ خاں کو ان باتوں سے کوئی حقیقی خوشی نہیں حاصل ہوئی اس کی روح میں ایک تڑپ تھی ایک خلش تھی۔ وہ تو جس مقصد کو سامنے رکھ کر اپنی سلطنت کو لات مار کر نکلا تھا وہ ابھی تک حاصل نہ ہوا تھا۔ اودھ پہنچ کر جب سے اقامت پر مجبور کیا گیا تو اس نے چند قیمتی جواہرات فروخت کرکے مجھے بنایا۔ اودھ کے خزانے سے جو کچھ ملتا وہ مدرسوں، خانقاہوں اور بیواؤں کی نذر ہو جاتا کیونکہ حیدر بیگ سیر چشم تھا اودھ کے دوسرے عمال کی طرح کنگال دو تھا۔ اس اثنا میں اس کے اہل و عیال بھی لکھنؤ پہنچ گئے اور کچھ دوسرے عزیز بھی، لیکن اس نے اودھ کے عمال کی حالت اور نواب کی غفلت دیکھ کر یہی مناسب سمجھا کہ بہو بیگم صاحبہ کے سامنے استعفیٰ پیش کر دیا جائے اور یہ کہا کہ "میں آپ کا پوت ہوں تنخواہ میرے اوپر حرام ہے رہا امور مملکت میں مشورہ اس کے لئے جس وقت بھی یاد فرمایا جائے گا میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

بہو بیگم صاحبہ ایک فہمیدہ خاتون تھیں سمجھ گئیں کہ مرزا امانی کی غفلتوں سے حیدر بیگ دل برداشتہ ہے لہذا موضع خوری کے نام سے سولہ ہزار روپیہ ماہوار کا وثیقہ نسلاً بعد نسلٍ اور بطناً بعد بطنٍ مقرر فرمایا حیدر بیگ نے نہ صرف گوشہ عافیت اختیار کیا بلکہ اپنے پیالے

بیٹے حسین علی خاں سے بطور وصیت یہ بھی کہہ دیا کہ خبردار اگر وزارت پیش کی جائے تو قبول نہ کرنا کہ یہ ایک عذاب ہے اور یہاں لوگ دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹ رہے ہیں اور اودھ کا خزانہ خالی کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا: "بھئی سچ پوچھو تو حیدر بیگ خاں کے بارے میں تم کچھ جذباتی ہو رہے ہو۔۔۔ سوال یہ ہے کہ جب حیدر بیگ خاں اپنی سلطنت کو لات مار کر نکلے تو اودھ میں معتکف ہو کر کیوں بیٹھ رہے ہے؟"

وہ بولا "میں سمجھتا تھا تم یہ سوال ضرور کرو گے ـــــ بات یہ ہے کہ انگوری باغ میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی کہ اس میں ایک سبز پوش شب و روز یادِ الٰہی میں مصروف رہتا تھا۔"

میں نے کہا: "تمہارا مطلب یہ ہے کہ وہ حیدر بیگ خاں تھے۔"

وہ بولا "جی جناب۔"

میں زور سے ہنسا اور بولا "جب مسجد ہی میں دن تیر کرتے تھے تو پھر اس خدم و حشم کی کی ضرورت۔ میرا مطلب یہ ہے کہ پھر تمہاری تعمیر کیوں عمل میں آئی؟"

اس نے کہا: "سلطنت اودھ سے وابستگی کے بعد حکومت اودھ نے بار بار حیدر بیگ کی توجہ اس طرف منعطف کرائی کہ اہلِ دربار اور اہالیِ اودھ خیمے میں رہنے والے ایک خانہ بدوش قسم کے وزیر کے بارے میں سوءِ ظن سے کام لیں گے جس سے حکومت کی اہانت ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "بھئی مجھے تو اب نیند آ رہی ہے اگر تم دوسری قبر والی داستان سنا دو تو خیر ورنہ بندہ سوتا ہے۔"

وہ ہنسا اور بولا "خیر یہ خونیں داستان سُنو گے تو آج کیا جب بھی اسے ذہن میں

دہراؤگے تو بیند اُڑ جایا کرے گی۔"

سنو اور گوش ہوش سے سنو کہ عمالِ حکومت اس درجہ طامع اور غفلت شعار تھے کہ نواب کو ہر وقت کارِ مملکت سے غافل رکھ کر اپنا اُلو سیدھا رکھنا چاہتے اور دونوں ہاتھوں سے بدستور خزانہ لوٹتے رہنا چاہتے تھے۔ حیدر بیگ خاں کی موجودگی میں یہ ممکن نہ تھا بظاہر حیدر بیگ ایسے کو رنگوں کی وجہ سے خانہ نشیں ہو رہے تھے۔ دربار میں آنا جانا موقوف تھا لیکن درباری جانتے تھے کہ نواب پر اور ان کی والدہ پر حیدر بیگ کا گہرا اثر ہے لہذا انہیں کسی طرح ایک دوسرے سے برگشتہ کرنا ضروری ہے اس مقصد کے لئے نواب آصف الدولہ کے ایک خواجہ سرا کو ان مصاحبین نے کسی طرح ملا لیا اور حیدر بیگ خان کی محلسرا میں بھیجنا شروع کیا۔ خواجہ سرا نے آصف الدولہ کے سامنے مہر آفروز کے حسن کے قصے بیان کرنے شروع کیے اور مصاحبین نے اس بات پر آمادہ کرنا شروع کیا کہ مہر آفروز کو نواب ملکہ بنا کر حرم میں داخل کر لیں۔ نواب آمادہ ہوگئے اور حیدر بیگ خاں کو طلب کیا۔ دربارِ خاص تھا تخلیہ کا حکم ہوا۔ تمام لوگ ہٹ گئے نواب نے کہا:

"حیدر بیگ! ہمارے اور تمہارے درمیان برادرانہ رشتہ موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس رشتہ کو اور بھی مستحکم بنا لیا جائے۔"

"جناب والا! رشتہ مستحکم ہے۔"

"بے شک لیکن میں چاہتا ہوں کہ مہر آفروز کو ملکہ بنا کر حرم میں داخل کر لوں"

اتنا سننا تھا کہ حیدر بیگ کا چہرہ سرخ ہوگیا، ہاتھ بیش قبض تک پہنچ گیا۔ مصاحبین تو صرف اتنا چاہتے تھے کہ مہر آفروز سے شادی ہو جائے گی جس سے بہر حال انکار ممکن نہیں تو حیدر بیگ کو ذلیل کرنے کا موقع ملے گا کہ بہن دے کر وزارت عظمیٰ حاصل کی کیونکہ سوائے

حیدر بیگ کے زیادہ تر عمال حکومت اور مصاحبین نے تقرب شاہی اسی طرح حاصل کیا تھا حیدر بیگ خاں کی رگوں میں بھی شاہی خون گردش کر رہا تھا تابِ ضبط نہ رہی لیکن بڑے تحمل سے بات برداشت کی۔ سر جھکائے واپس ہوئے اور محلسرا میں جانے کے بجائے دیوان خانے میں خلوت اختیار کی بہت دماغ سوزی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا، پریشانی کے عالم میں ٹہلنے لگے۔ کنیزوں نے پریشانی اور ٹہلنے کی حالت مہر آفروز سے عرض کی۔ بہن نے اطلاع بھیجی کہ حضوری کی پروانگی دی جائے، اجازت ہوئی۔ جان سے زیادہ عزیز بہن مہر آفروز سامنے آئی تسلیم بجالائی۔

"برادر جان! خدانخواستہ کیا تفکر ہے"۔

حیدر بیگ نے ٹالنا چاہا "کچھ نہیں مہر، امورِ سلطنت اکثر پیچیدہ ہوتے ہیں"۔

"لیکن برادر جان!" وہ بولی "جو تردد آج چہرے پر دیکھ رہی ہوں تمام عمر نہیں دیکھا تھا"۔

"یہ سچ ہے" حیدر بیگ نے کہا "مہر افروز —— آج تکدر دو چند ہے"۔

"خاصا بھی نوش نہیں فرمایا"۔

حیدر بیگ نے کہا "طبیعت پریشان ہو تو جی نہیں چاہتا، آج مجھے تنہا چھوڑ دو"۔

مہر نے تسلیم عرض کی اور پچھلے قدموں سے چلتی ہوئی حجرے سے باہر آگئی —— دیوان خانہ اور محلسرا کا فوری شمعوں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا اندر دسترخوان پر جملہ اقربا منتظر تھے، مہر آفروز نے دسترخوان پر آکر کہا "برادر جان کی طبیعت ناساز ہے اور میرے سر میں درد ہے آپ لوگ نوش فرمائیں"۔ اور خود دیوان خانے کے ایک گوشہ میں پس پردہ چھپ کر بیٹھ رہی کہ بھائی کی تکلیف کا سبب معلوم کرے۔ حیدر بیگ ٹہلتے جاتے اور کہتے جاتے۔

"افسوس افسوس"۔

"یہ میں کیسے گوارا کر سکتا ہوں"۔

بہن سے ضبط نہ ہوا تڑپ کر باہر آگئی تسلیم بجا لا کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

"کیا بات ہے مہر"؟ حیدر بیگ نے پوچھا

حضور کے مزاج کی ناسازی سے جی آپ سے آپ اُداس ہوا جاتا ہے چین نہیں آتا۔"

"سچ ہے، ہمشیر ماں جائی ہوتی ہے اور تم ــــ تم تو میری محبت کی خاطر کس قدر دشوار گزار سفر طے کر کے یہاں پہنچی ہو، مہر افروز، تم میری بہن ہی نہیں اولاد کی طرح عزیز ہو ــــ تم سچ مچ میرے گھر کی مہر ہو جس سے میرے تاریک کدے میں روشنی پھیل گئی ہے۔"

مہر افروز جھک کر تسلیم بجا لائی "کنیز کی عزت افزائی ہے ــ اگر اسی قدر مجھ پر التفات ہے تو کنیز کو محرم راز بنا کر سرفراز فرمایا جائے۔"

حیدر بیگ آگے بڑھے پیار سے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے "بہن کیا کوئی بھائی ایسا بھی ہے جو اپنی بہن کا سکھ نہ دیکھنا چاہتا ہو ــــ آصف الدولہ سے زیادہ اس مملکت اودھ میں اور کون بڑا رئیس ہوگا جس کی کوئی آرزو کرے ــ آج اس نے مجھ سے خود تمہاری خواستگاری کی ــــ" حیدر بیگ نے بات ادھوری چھوڑ دی اور چند لمحے خاموش رہے اور دریچہ کا پردہ ہٹا کر سیاہ آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو گھورا پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن یہ رشتہ ہماری مملکت میں آیا ہوتا تو ہمیں قبول تھا ــــ مہر افروز جھکی اور تسلیم بجا لا کر بولی۔

"برادر جان کا تردد بالکل درست ہے لیکن یہ معاملہ تو نہایت آسان ہے کنیز کے پاس اس کا نہایت آسان حل موجود ہے۔"

حیدر بیگ نے کہا "یعنی شادی کا اقرار؟" ــــ "نہیں برادر جان" مہر افروز بولی "شادی کے اقرار میں تو حیدر بیگ خاں کی پگڑی سیدھی نہیں رہ سکتی" ــــ اور انکار کی صورت میں۔" حیدر بیگ خاں نے عمداً جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہم سب کے جان و مال کو خطرہ ہے" مہر افروز نے کہا۔ حیدر بیگ نے جوش میں جواب دیا ــــ "لیکن مجھے جان و مال کی پروا نہیں۔"

"درست ہے عزت کے لئے جان و مال تو معمولی صدقہ ہے" ــــ "بیشک" ــــ کنیز کے پاس اس معاملے کا ایسا حل موجود ہے جس سے عزت بھی رہ جائے اور جان و مال کو خطرہ بھی نہ ہو" ــــ وہ کیا ہے ــــ وہ کیا ہو سکتا ہے؟"

"کنیز ایک شرط پر وہ حل پیش کر سکتی ہے" ــــ "مجھے وہ شرط منظور ہے" ــــ حیدر بیگ خاں نے بے قراری سے اقرار کیا۔

"حضور خاصا نوش فرمائیں اور علی الصبح کنیز کا تجویز کردہ حل ملاحظہ فرمائیں۔"

دونوں بہن بھائی ہنسی خوشی دسترخوان پر آبیٹھے کھانا کھایا اور شب باشی کے لئے اپنے اپنے حجروں میں پہنچ گئے۔ صبح ہوئی، حیدر بیگ خاں نے نماز و تلاوت کے بعد محلسرا کا رخ کیا تمام محلسرا کے حرم اور کنیزیں کورنش بجالانے کو حاضر ہوئیں لیکن مہر افروز کو نہ پاکر حیدر بیگ سیدھے اس کے حجرے میں گئے جو اندر سے بند تھا بار بار دستک دینے پر بھی جب کوئی جواب نہ ملا تو دروازہ توڑ دیا گیا اندر جو کچھ منظر نظر آیا وہ یہ تھا کہ مہر افروز کی لاش پڑی تھی، سرہانے لگن میں کلیجے کے کٹے ہوئے ٹکڑے پڑے تھے اور مہر افروز کی انگوٹھی کے کئی ہیرے غائب تھے۔"

"ہوں" ــ میں بولا "تو دوسری قبر مہر افروز کی ہے۔"

وہ بولا "ہاں حیدر بیگ خاں نے وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد پیاری بہن کے پہلو بہ پہلو دفن کیا جائے۔ آج انگوری باغ میں قد آدم گھمو اور پتا ور کھڑی ہوئی ہے اس کے بیچ میں دونوں کی قبریں ہیں اور ہوا جب سائیں سائیں کرتی ہوئی گزرتی ہے تو مجھے ایسے دلخراش نالے سنائی دیتے ہیں جیسے مہر افروز کی جوانی اس کے حسن کا ماتم کر رہی ہو۔"

میں نے کہا: "بے شک، یہ ایک المیہ ہے لیکن کیا تم نہیں دیکھتے کہ آصف الدولہ موجود نہیں ہیں۔ حیدر بیگ خاں بھی نہیں رہے اور مہر افروز بھی منوں مٹی کے بوجھ تلے دبی ہوئی پڑی ہے۔ پھر بھی اس بیسویں صدی میں، اس روشنی کے زمانے میں، جب کہ علم و آگہی کے چراغ روشن ہوتے جا رہے ہیں، کتنی افروزیں اور کتنی مہریں ایسی ہیں جن کے جسم کے لباس تار تار کر دیئے گئے ہیں۔ کتنے حیدر بیگ اس حقیقت کو جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہیں۔"

وہ بولا "میں ایک پرانا کھنڈر ہوں، میرے پاس صرف یہی ایک المیہ تھا جسے میں نے تمہیں دے دیا، جدید اور نئے نئے مکانوں اور فلک بوس عمارتوں کی تہوں میں کتنے زخم ہیں، یہ بیٹھ کر تم کریدو میرا کام ختم ہو گیا، میری داستان ختم ہو گئی، میں نے اپنا فرض پورا کر دیا، میری چھاتی پر جو بوجھ رکھا ہوا تھا وہ اتر گیا، میرا حال بہت جلد ماضی میں بدلا چاہتا ہے کیونکہ صبح قریب ہے اور تم صبح صبح یہاں سے نکل جاؤ گے مکان خالی ہو جائے گا مکین نکل جائے گا۔ جسد پڑا رہ جائے گا ——— میں ہنسا اور بولا "میاں ہم تو مسکرا مسکرا کر زخم کھانے کے عادی ہیں اور دل سے غم سہہ رہے ہیں۔"

پان

مشرقی پاکستان سے پانوں کی ترسیل کیا بند ہوئی کہ شیخ صاحب ماہی بے آب کی طرح کبھی اوپر کی منزل سے نیچے آتے اور کبھی صحن میں ٹہلتے۔ اخبار پڑھتے۔ دو چار صلواتیں اس نوکر کو سناتے دو چار اُس کو دو چار فہمائشیں پوتے پوتیوں کو، کچھ دشنام طرازی مصنوعی قلت ڈالنے والوں کو۔ غرض کسی پہلو قرار نہ آتا تو نکڑ کی دوکان پر جا کھڑے ہوتے۔ پنواڑی سے پوچھتے "ہمارے پہلوان سناؤ کیا خبر ہے؟" اور پنواڑی مزے سے کوکا کولا کی بوتل کھولتے ہوئے کہتا "میاں جی پان کا تو وہ توڑا پڑا ہے کہ بس نہ پوچھو، بازار جاؤ تو پان والے گنڈیریاں بیچ رہے ہیں — اپن بھی اب کوکا کولا بیچ رہے ہیں۔"

شیخ صاحب دونوں کولھوں پہ ہاتھ دھرے یہ مرثیہ سنتے رہتے پھر ایک لمبی سی لاحول پڑھتے ہوئے چائے خانے میں گھس جاتے۔ چائے پینا کس کمبخت کا مقصود ہوتا اور اگر پی بھی لیتے تو یک گونہ بے خودی کے لئے کہ پان کی یاد دل سے کچھ تو محو ہو جائے۔ آس پاس بیٹھے ہوئے

لوگوں سے کن سنیاں لیتے رہتے کہ شاید کوئی خبر مل جائے، شاید کوئی مژدہ جاں فزا سنا دے کہ پان آ گیا۔ لیکن شیخ صاحب کو تو اس نسل سے ہمیشہ سے شکایت تھی کہ اول تو پان کو منہ نہیں لگاتے اور اگر کوئی بھولے بسرے کھا بھی لے تو پان کا بیڑا سمجھ کر نہیں کھاتا حلوائی کی دوکان سے برفی کی ڈلی یا رس ملائی سمجھ کر کھاتا ہے۔ (یعنی میٹھا پان) بھلا میٹھا پان بھی کوئی پان ہوتا ہے۔ غرضکہ کسی کو پانوں کے نہ آنے سے کچھ فرق نہ پڑا، اس لئے کوئی اس موضوع پر بات بھی نہیں کرتا، عجب بد مذاقی ہے۔ شیخ صاحب چائے خانے سے اٹھتے تو سیدھے انارکلی کے اس نکڑ پر جا پہنچتے جہاں پان والوں کا اور خریداروں کا ہجوم لگا رہتا تھا اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور اب جو یہاں دیکھو تو ؎

اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

کے مصداق بازار سونا سونا، سوکھی لٹی ہوئی، پان والوں کی جگہ گنڈیری والے موجود، یا اللہ پانوں کے بغیر یہ شہر کیسی اُجاڑ نگری بنا ہوا ہے۔ شیخ صاحب بار بار سوچتے کہ کاش وہ شاعر ہوتے تو ایک شہر آشوب لکھتے، پان معشوق اور شیخ صاحب عاشق۔ محبوب کے فراق میں حزنیہ غزلیں لکھتے۔ شیخ صاحب کو اتنا دیکھ کر صبر نہ آیا کہ پان والے حقیقتاً گنڈیریاں بیچ رہے ہیں۔ وہ ایک گنڈیری والے کے پاس پرسش احوال کے لئے کھڑے ہوئے ہی تھے کہ اس نے ترازو اور باٹ اٹھا کر آواز لگائی "گلاب میں بسی ہیں قند کی ڈلی ہیں میاں جی کتنی تولوں؟"

شیخ صاحب قدرے گھبرائے ہکلا کر بولے "ارے میاں یعنی اب میں اس بڑھاپے میں گنڈیریاں چوسوں گا ——"

پاس ہی کھڑے ہوئے ایک دوسرے گنڈیری والے نے یہ سن کر زندہ دلی سے آواز لگائی "بوڑھا کھائے تو جوان ہو جائے، جوان کھائے تو نوجوان بن جائے ——

گلاب ہیں گنڈیریاں ـــــ، شیخ صاحب ایک لمبی سی لاحول پڑھ کر بولے" اجی کیا سوجھی ہے تمہیں کہ پان بیچتے بیچتے ایک دم گنڈیریاں بیچنے لگے لاحول ولا قوۃ ـــــ بھائی کچھ پانوں کی بھی خیر خبر ہے"

"پان" ایک گنڈیری والا یوں زور سے ہنسا گویا شیخ صاحب نے کسی انہونی اور ناممکن الوجود شے کا ذکر کیا ہو، دوسرا ان کے سامنے زوروں سے ہاتھ نچا کر بولا۔ میاں کیمرہ ہو تو پان کی تصویر اتار لو فریم کرا کے پاندان میں لگا لو، اب نہیں آنے کا ادھر پان ـــــ گنڈیریاں نہ بیچیں تو کیا کریں، بچوں کا پیٹ کیسے پالیں؟" شیخ صاحب نے تائید میں گردن ہلائی ایک لمبی سی گہری آہ بھری اور کہا" ٹھیک کہتے ہو بھائی، شریف آدمی تو ہاتھ پھیلا کر بھیک بھی نہیں مانگ سکتا"

یہاں سے جو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے چلے تو سیدھے بھاتی دروازے پہنچے اور اپنی بیوہ بھاوج کو یہ اہم ترین خبر سنائی کہ لو بی اب تو قیامت کے آثار ہیں کہ بھلا پان بھی کوئی نعمتِ عظمٰی ہے یا من وسلویٰ کہ اس کا انتظار یوں کیا جائے کہ آسمان سے اترے گا ارے تحفۂ درویش ہے، برگِ سبز ہے اور داتا کی نگری میں عنقا ہے اب قیامت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ پہلے ہی اس شہر میں پانوں کی کون سی ریل پیل تھی ایک اور آدھے آدھے پان کی گلوری کھاتے تھے۔ تلے اوپر چار چار چھ چھ پانوں کے بیڑے تو مدت سے نصیب نہ ہوئے تھے کہ لیجئے اب یہ نیرنگیٔ فلک سے عالمِ حیرت۔ گردشِ آسمانی نے یہ قحط سامانی پیدا کر دی کہ پان کی صورت دیکھنے کو ترس گئے۔ بیوہ بھاوج جس نے زندگی بھر مصیبتیں جھیل جھیل کر بچے پالے تھے۔ شوہر سے کسی شے کی کبھی فرمائش نہ کی تھی نہ اچھا کھانا نہ کپڑا لیکن پان اور پاندان سے ایسا لگاؤ تھا کہ بیوگی کا غم اسی سے غلط ہوتا تھا کبھی چھالیا رات رات بھر کتری جا رہی ہے گلوریوں پر گلوریاں ہیں کہ کھائی جا رہی ہیں، کبھی کتھے کے جمانے کا مشغلہ در پیش ہے

تو کبھی چونے کو چکنا رکھنے کے لئے دودھ اور دہی کا توڑ ڈالا جا رہا ہے کبھی زعفرانی قوام اور ورقی گولیاں ہیں کبھی لکھنؤ کا مشکی تمباکو غرضکہ مزے سے گزر رہی ہے یہ پانوں کا قحط اس کے لئے بھی سانحۂ عظیم تھا بولی:

"بھائی سنا ہے کراچی والے تو پالک کے پتے کھا رہے ہیں"

شیخ صاحب کی رگ ظرافت پھڑکی بولے — بی ہم بیل بکری تو نہیں کہ پالک چرنے لگیں ابھی تک پان اور سبزی میں تمیز کر سکتے ہیں البتہ ہے یہ بہیری وقت کہ پان سی شئے اور یوں عنقا ہو جائے۔ یاد ہے مہوبے کا پان، بنارسی پان دسہوری پان اور سندیلے کے پانوں کی ڈھولیاں آتی تھیں۔

"اے ہے اب وہ وخت (وقت) کاہے کو آئے گا — کیا کیا بہاریں تھیں پان کی بھی۔ بسنتی پان تو لوگ یہاں جانتے بھی نہیں۔ واہ کیا خستگی ہوتی تھی زعفرانی قوام اور ورقی گولیوں سے کھاؤ تو وہ لعاب بنتا تھا کہ کیا کہنا:"

"بھئی اب جی نہ جلاؤ بھابی یہ ذکر کر کر کے، لاؤ کچھ چھالیا ہی کھلاؤ۔"

خشک چھالیا تو منہ میں آبلے ڈال دیوے ہے بھیّا، میں نے تو کھوپرا اور سونف ڈال کر گوٹہ بنا لیا ہے۔"

گوٹے کا پھنکا مار کر شیخ صاحب بولے "تو بہار گوٹہ بھی خوب ہوتا تھا — لاؤ بھابی ذرا میرا بٹوہ تو بھر دو اللہ جنت نصیب کرے مرنے والی کو، آج زندہ ہوتی تو مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ شیخ صاحب اپنی مرحومہ زوجہ کو یاد کر کے دو چار صلواتیں بہوؤں کو سناتے ہوئے اب جو یہاں سے چلے تو سیدھے پنجاب پبلک لائبریری کے ریڈنگ روم میں دم لیا۔ خبریں تو آج کل بہت ہوتیں، بھانت بھانت کی ہوتیں اور گرما گرم رنگ رنگ کی ساری دنیا کی

خبریں لیکن جس خبر کو شیخ صاحب ہر اخبار کے ہر صفحہ کے ہر کالم میں تلاش کرتے وہ کہیں نہ ملتی جھنجلا کر گھر چلے آتے۔ کھانے سے فراغت ہوتی تو پھر پان کی یاد آجاتی غرضکہ کسی طرح غم غلط نہ ہوتا تو بڑی بہو کے کمرے میں جا نکلتے اور ریڈیو کی خبروں کے بارے میں استفسار ہوتا اور کبھی شام کو ٹیلی ویژن سے خبریں سنتے کہ یا الٰہی اب تو خبر آجائے پان کی، لیکن ایسی خبروں کو بھی ضد ہوتی ہے نہ آنا تھی نہ آئی اور شیخ صاحب بدستور پانوں کے فراق میں سرگرداں رہے بلکہ گرداں کبوتر بنے رہے۔ سارے شہر میں گھومتے لیکن پان کے نام پر پتی بھی میسر نہ آتی۔

ایک روز شیخ صاحب نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ کراچی میں ہزاروں روپیہ کا پان کسٹم والوں نے پکڑا اور اُسے روند روند کر پھینک دیا اور جلا دیا۔ ہائے ہائے ظالمو، کیا تم میں کوئی اہلِ دل اور اہلِ درد نہ تھا کہ اس ستم سے باز نہ رہتا، یارو! پان اگر ناجائز ذرائع سے حاصل ہوا تھا اور خلافِ قانون تھا تو لانے والوں کو شوق سے سزا دیتے پانوں کا کیا قصور تھا، ارے ہم جیسے لوگوں کیلئے تو پان کا عرق بھی آبِ حیات کا حکم رکھتا ہے، بھائیو! ہم تشنہ کاموں کے حلق میں ذرا سا ٹپکا دیتے کہ روح تازہ ہو جاتی اور جان میں جان آجاتی۔

شیخ صاحب کو اس لیڈر پر بڑا رشک آیا جو ڈھاکہ یاترا محض اس لئے کر کے آیا تھا کہ وہاں پان کھا سکے۔ کہتے ہیں کہ ڈھاکے کے لیڈروں سے گفتگو میں تو مذکورہ لیڈر سرخرو نہ ہو سکا لیکن پان کے بیڑوں سے ایسا سرخ رو ہو کر آیا کہ جس اخباری نمائندے نے کوئی سوال کیا جھٹ پان کی گلوری بڑھا کر اسے ایسا نہال کیا کہ وہ ساری چوکڑی بھول گیا۔ شیخ صاحب کفِ افسوس ملتے کہ سرکاری دفتروں میں بلاوجہ عمر تیر کی صحافی بنے ہوتے تو کم از کم لیڈر موصوف ہی کے طفیل میں پان میسر آجاتے شیخ صاحب نے زندگی بھر کبھی شعر موزوں نہ کیا تھا لیکن پانوں کے فراق میں وہ کچھ کچھ موزوں طبع بھی ہوتے جا رہے تھے۔ مثلاً ایک موقع پر انھوں نے یوں گنگنانا شروع کیا۔

پان عنقا ہے شہر میں یارو کس طرح ہجر میں جئے کوئی
جیبِ داماں کو کیوں رفو کیجے چاک دل کے مرے سیئے کوئی
پان کی پیک پی رہے ہیں غیر زہر کے گھونٹ اب پئے کوئی

وغیرہ وغیرہ

اوران رشحات فکر کو باقاعدہ قلم برداشتہ لکھ کر احباب کو سناتے پھرتے۔

شیخ صاحب کے بلند اقبال برخورداروں کو باپ کی طرف سے اب تو فکر ہوئی کہ لیجئے بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہوا کہ ابا جان شعر کہنے لگے کہیں بیچ بیچ سر پھوڑتے ہوئے صحرا نوردی کو نہ نکل جائیں لہذا طبیبوں سے رجوع کیا جائے۔ ہر چند ان کی بیویوں نے احتجاج کیا اور بہت سمجھایا کہ بڑے میاں بقیدِ ہوش و حواس ہیں اخبار پڑھتے ہیں صرف اخبار کے ساتھ پان نہیں چباتے ہیں۔ پان اگر آجائیں گے اور اخبار بینی و پان کی جگالی کا وظیفہ شروع ہو جائے گا تو خود بخود مرض ٹھیک ہو جائے گا صحت بحال ہو جائے گی اور شعر گوئی سے نجات مل جائے گی لیکن کسی کی کچھ پیش نہ گئی۔ ڈاکٹر سے رجوع کیا گیا تو شیخ صاحب نے سب سے پہلا سوال خود ڈاکٹر سے یہ کیا:

"حضرت آپ پان بھی کھاتے ہیں؟"

ڈاکٹر حیران ہوا اور بولا "نہیں، میں تو نہیں کھاتا، میرا کمپاؤنڈر ضرور کھاتا ہے"

بولے "بس بس آپ میرا علاج نہیں کرسکتے۔ میرا علاج آپ کا کمپاونڈر کرسکتا ہے"

کمپاونڈر نے خشک منہ دکھاتے ہوئے کہا "جناب میں تو خود ہی ترس رہا ہوں"۔ غرضکہ ڈاکٹر نے بطور لطیفہ نسخہ کی جگہ پان لکھ دیا اور صاحبزادگان بلند اقبال ایک ایک اور ڈیڑھ ڈیڑھ روپیہ کے حساب سے پان لائے اور شیخ صاحب نے بشوق تناول فرمائے اور برسوں کا فاقہ ٹوٹا۔

لیکن صاحب جو شخص پان پر پان کھاتا ہو اسے ایک پان کا سواں حصہ ملے اور وہ جگو جگو کر اور بھگو بھگو کر فریج میں اور کبھی فریزر میں محفوظ رکھ رکھ کر ملے تو وہی بات ہوئی کہ اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ پھر شیخ صاحب ٹھہرے یار باش اور زندہ دل آدمی، پان کھاتے کم اور کھلاتے زیادہ تھے۔ اس ٹوٹکے سے کیوں کر خوش ہوتے، علاوہ اس کے سارے شہر کے پان کھانے والوں کو دیکھو تو سوگ لئے ہوئے منہ خشک چھالیا پھانک رہے ہیں ان میں ایک شخص اتنی بڑی عیاشی کرے تو تابکے صاحبزادے سے بولے:

"گل سے قطعاً پان نہیں آئیں گے۔"

پوچھا گیا ——— "کیوں؟"

کہا ——— "بس میرا حکم ہے، جب تک پان اپنی اوقات پر واپس نہیں آئے گا اُسے منہ نہیں لگایا جائے گا۔" حکم حاکم مرگ مفاجات، پان آنا موقوف ہو گئے۔ ایک دن کسی نے شیخ صاحب کو یہ مژدہ سنایا کہ گلبرگ میں ایک نیا رئیس مجلس امام حسین منعقد کرتا ہے۔ تبرک کے طور پر کھانا وغیرہ تو کھلاتا ہی ہے پان کی گلوریوں پر گلوریاں بھی یاران طریقت اڑاتے ہیں اور رئیس مذکور کی تیوری پر بل بھی نہیں آتا۔ سینکڑوں گلوریاں لوگ کھا جاتے ہیں۔ یہ خبر ایسی نہ تھی کہ شیخ صاحب نہ پسیجتے۔ فوراً مجلس میں جا پہنچے اور جو کچھ سنا تھا آنکھوں سے دیکھ لیا بلکہ منہ میں جس قدر سما سکتی تھیں گلوریاں ٹھکس لیں اور جگالی شروع کر دی نگاہیں بچا کر دو چار گلوریاں بٹوے میں رکھ لیں اور سیدھے اپنی بیوہ بھاوج کے پاس پہنچ گئے بولے "دلھن دیکھو ایسی نعمت لے کر آیا ہوں کہ دل سے دعائیں دوگی ———"، اب جو شیخ صاحب نے گلوریاں نکال بھاوج کو دیں تو وہ باغ باغ ہو گئیں ہزاروں دعائیں دیں۔

شیخ صاحب دوسرے روز بھی مجلس میں جا پہنچے اور بدستور پان خوب کھلائے۔ پانوں

کی لذت اور حلاوت بھی خوب تھی اور وہ معطر و معنبر بھی تھے لوگ مزے لے لے کر پان کھا رہے تھے کہ اچانک کچھ سرکاری کارندے پہنچے اور پانوں پر قبضہ کر کے رئیس مذکور سے نا روا سوالات کرنے لگے اور انھوں نے یہ انکشاف کیا کہ ہندوستان سے اسمگل شدہ پان روزانہ آپ کے گھر پہنچ رہے ہیں۔ آپ پر دفعہ ...... مقدمہ قائم کیا جاتا ہے۔ رئیس مذکور کا جو حال ہونا تھا ہوا شیخ صاحب ایسے سراسیمہ ہوئے کہ فوراً اپنی بیوہ بھاوج کے یہاں جا پہنچے، بے خیالی میں انھیں یہ خیال بھی نہ رہا کہ پان کی گلوریاں منہ کی منہ میں دھری تھیں اور جیب کی جیب میں انھیں۔ جو بھاوج نے دیکھا پانوں کی توقع میں کھل اٹھیں لیکن شیخ صاحب کے بجھے ہوئے مایوس چہرے کو دیکھ کر قدرے متوحش ہو گئیں پوچھا "خیر تو ہے کیا آج پان نہیں ملے"۔

شیخ صاحب نے نفی میں گردن ہلائی اور جیب سے بٹوہ نکال کر پانوں کی گلوریاں نکال کر ہتھیلی پر رکھ لیں۔ بھاوج نے ہاتھ بڑھا کر گلوریاں اٹھانا چاہیں تو شیخ صاحب نے مٹھی بھینچ کر گلوریاں مسل ڈالیں، بھاوج کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تو شیخ صاحب نے منہ میں دبی ہوئی گلوریاں تھوک دیں۔ گلاس میں پانی لے کر خوب کلی کی، بھاوج نے کہا "خیر باشد ـــــ کہیں گلوریوں میں زہر تو نہیں تھا؟"

شیخ صاحب نے اثبات میں گردن ہلائی اور آنسوؤں سے بھری آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔ چھڑی اٹھائی اور بھاوج کو سراسیمہ حالت میں چھوڑ کر یہ جا اور وہ جا۔

وہ تو رمتے جوگی کی طرح تھا، آج یہاں تو کل وہاں جہاں سینگ سمایا نکل کھڑا ہوا جب تک کسی بستی میں جی چاہا رہا سہا۔ ہوٹلوں کے بچے کھچے کھانے، کوڑے کرکٹ پر پڑی گلی چیزوں ہی پر جب گزارا کرنا ہو تو ایسے میں نہ غمِ روزگار ستاتا ہے اور نہ کسی تردّد سے سروکار ہوتا ہے۔ قریہ قریہ، بستی بستی وہ سیر کرتا تھا کہیں نیند آگئی تو فٹ پاتھ پر، کسی دوکان کے برآمدے میں، کسی کھوکھے کے نیچے پڑ رہا۔ سگریٹ بیڑی کی طلب ہوئی تو سڑکوں سے ٹرے اور ٹوٹے جمع کر لئے اور مزے سے بیٹھ کر پی لئے۔ کسی نے ننگا کھا! دیکھ ترس کھایا تو کچھ پہن لیا، ورنہ چیتھڑے لگے ہیں تو پروا نہیں اور کسی نے ولایتی کپڑے خرید کر دے دیئے تو ان کی کوئی قدر نہیں، غرضکہ مزے میں گزر رہی چلی جا رہی تھی۔

تیئیس سال قبل کیا ہوا تھا، یہ بھی اسے اب کچھ خواب سا یاد رہ گیا تھا کہ ایک

ٹرین میں بہت سے مردوں اور عورتوں کے درمیان وہ سفر کر رہا تھا اور پھر ٹرین کہیں رُکی تھی پھر بڑا کشت و خون ہوا تھا۔ خون کی چادریں کی چادریں اُس پر سے گزر گئیں تھیں۔ انسانی اعضا بکھرے پڑے تھے۔ لاتعداد لاشیں جلی پڑی تھیں اور دور دور تک تعفن اور بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ انھیں لاشوں کے درمیان کہیں وہ بھی لاش کی طرح پڑا ہوا تھا جسے اسپتال والے لے گئے اور چند دن اسے وہاں رکھ کر خارج کر دیا گیا۔ اس وقت سے آج تک وہ اسی طرح گھوم رہا تھا۔ کبھی کسی نے پولیس کے حوالہ کر دیا، کبھی جیل کی سیر کر لی کبھی پاگل خانے کی یاترا کو نکل گیا اور کبھی نگری نگری محلے محلے سیر کرتا پھرا۔

ایک روز یوں ہی گھومتا گھامتا وہ ایک سڑک پر ہو لیا تو کیا دیکھتا ہے کہ شہر کی ساری خلقت ایک وسیع و عریض میدان پر ٹوٹی پڑتی ہے۔ گاڑیاں، بسیں، ٹرک بھر بھر کر لوگ آرہے ہیں اور ایسے فلک شگاف نعرے لگا رہے ہیں کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ تاحدِ نگاہ آدمیوں کے سر ہی سر نظر آتے ہیں کہ اگر تھالی پھینکو تو سر ہی سر جائے گر نے نہ پائے۔ وہ بھی قریبی فٹ پاتھ پر کھڑا ہو گیا۔ یوں ہی بلا وجہ، بغیر کسی ارادے کے کھڑا رہ گیا۔ تقریریں ہوئیں، نعرے لگے زندہ باد مردہ باد، لیکن نہ اس کے پلّے تقریریں پڑیں نہ نعرے، البتہ جب اِملو پہلو آگے پیچھے کسی طرف چلنے کو راستہ نہ ملا تو فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے کھوکھے کے نیچے جا بیٹھا اور پھر پتہ نہیں کب آنکھ لگ گئی اور وہ سو گیا۔

دن چڑھے آنکھ کھلی تو سڑک پر پھر وہی ہنگامہ تھا۔ میدان لوگوں سے بھرتا جا رہا تھا مگر اب اسے شدّت کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ کھوکھے کے نیچے سے نکل کر اِدھر اُدھر نظر ڈالی تو ایک جگہ دیکھا کہ روٹیاں اور کباب تقسیم ہو رہے ہیں۔ بے منّت خلق روٹیاں اور کباب کھا کر خوب ڈگڈگا کر پانی پیا اور ہجوم کے دھکّے کھاتا ہوا خود بخود میدان میں پہنچ گیا۔ پھر وہی

تقریریں ہوئیں وہی نعرے لگے جو اس کے مطلقاً پلّے نہ پڑے۔ خیر اسے ان باتوں سے کیا غرض لیکن اسے اچھا بہت لگا اور کئی بار جی چاہا کہ کم از کم ایک نعرہ تو لگا ہی لینا چاہیے مگر ہر بار ارادے کی لہریں دل سے اٹھ اٹھ کر لبوں تک آ آ کر رہ رہ گئیں اور وہ نعرہ نہ لگا سکا۔

کھوکھے کے نیچے رہنے میں بڑا مزا آیا۔ صبح صبح کھانے کو بھی مل جاتا اور کھوکھا بھی کچھ ایسا لاوارث تھا کہ نہ کوئی اسے چھوتا نہ چھیڑتا نہ ڈانٹتا نہ ڈپٹتا۔ مزے سے گزرتی چلی جا رہی تھی۔ روزانہ اسی طرح جلسے ہوتے۔ تقریریں ہوتیں۔ نعرے لگائے جاتے اور مزے سے لوگوں کے آتے جاتے ہجوم کو دیکھ کر، ان کے جوش و خروش کو محسوس کر کے خوش ہوتا۔ کیوں خوش ہوتا یہ اسے معلوم نہیں تھا لیکن ان گنت انسانوں کے ہجوم میں، ان کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس سے اسے انجانی خوشی سی ہوتی۔

ایک روز حسب معمول جلسہ برخاست ہوا تو ایک طرف لوگوں کا مختصر سا ہجوم لگ گیا وہ بھی اس ہجوم میں شریک ہو گیا۔ لوگ ہنسی خوشی پرچم لے لے کر لوٹ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ بھی وہاں پہنچ گیا جہاں کپڑے کے بڑے بڑے پرچم تقسیم ہو رہے تھے۔

اسے دیکھ کر ایک شخص نے پوچھا "آپ کا نام؟"

دوسرے نے اسے سرتاپا دیکھ کر، اس کے چیتھڑوں پر نگاہِ حقارت ڈالتے ہوئے کہا "ارے یہ تو پاگل ہے ــــــ وہی جو سامنے کھوکھے کے نیچے رہتا ہے۔"

پورے مجمع میں کئی آدمیوں نے قہقہے لگائے۔ ایک شخص بولا "ابے تو کیا کرے گا کہاں لگائے گا یہ پرچم؟"

دوسرا بولا "وہی جو شیش محل ہے اس کے باپ کا بنوایا ہوا، اسی پر لہرائے گا۔"

دو چار آدمیوں نے اسے دھکے دیئے "چل بے مٹ یہاں سے۔"

اس نے کئی بار سوچا کہ وہ کہے کہ وہ پاگل نہیں ہے لیکن اسے کسی نے کچھ کہنے کی مہلت ہی نہ دی۔ ایک آدمی نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا "ابے ہٹ یہاں سے۔"

وہ بولا "دھکیلو نہیں بابوجی۔"

اسے بولتے ہوئے دیکھ کر پرچم تقسیم کرنے والا بولا "کیا تم کھوکھے پر پرچم لگاؤ گے؟"

اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا "میں اس کی قمیص بنوا کر پہنوں گا۔" اس نے ہجوم کو اپنا ننگا بدن دکھاتے ہوئے کہا "دیکھو مجھے سردی لگتی ہے۔"

ہجوم میں پھر قہقہے گونجے اور ایک آدمی نے اسے پرے دھکیل دیا۔

کنجی

ہر چند کہ مکھن سنگھ کی شخصیت میں وہ نرمی، لطافت اور چکنائی کہیں دُور دُور تک نظر نہیں آتی تھی، جو مکھن میں پائی جاتی ہے لیکن معلوم نہیں کیوں اُس کے باپ کرتار سنگھ نے اس کا یہی نام پسند کیا تھا۔ بچپن تو خواب کی طرح گذر گیا۔ مکھن سنگھ کو نہ ماں کا پیار ملا، نہ باپ کی شفقت ہوش سنبھالا تو خود کو مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں میں کھیتوں میں مزدوری کرتے ہوئے پایا۔ دن کے وقت گھڑی دو گھڑی کو درختوں کے سائے میں سستانے کے سوائے کبھی آرام کا موقع نہ ملتا۔ رات دن بیلوں کی طرح کام میں جُٹا رہتا۔ رات گئے تک زمیندار اجیل سنگھ کے پاس آتے جاتے رہتے اور وہ اُن کی سیوا میں لگا رہتا۔ ذرا انگا ہوں سے اوجھل ہوا کہ اجیل سنگھ کی گرجدار آواز آتی "مکھن" اور وہ ڈرتا لرزتا فوراً خدمت میں حاضر ہو جاتا۔

مکھن سنگھ اچھے باڑ کا آدمی تھا۔ چھ فٹ سے اونچا ہی قد نکلا تھا اُس نے۔ چوڑی چھاتی پر سیاہ گھنے بالوں کے گچھے کے گچھے کنڈلیاں مارے براجمان تھے۔ خوب سیاہ داڑھی۔ بڑی بڑی مونچھیں

لمبے لمبے کیس، سرخ سرخ آنکھیں اور خوب کالی رنگت، ریچھ کا ریچھ اور بھِل کا بھِل ہو رہا تھا وہ۔ کہ رات میں دیکھو تو ڈر جاؤ۔

زمیندار اچل سنگھ سے رشتہ ناطہ تو کچھ تھا نہیں اُس کا بس اتنا تھا کہ جب زمیندار اچل سنگھ مغربی پاکستان کے صوبہ پنجاب سے ہجرت کر کے ہندوستان کے مشرقی پنجاب میں پہنچا تو اُس نے مکھن سنگھ کے باپ کرتار سنگھ کو جسے وہ پاکستان میں چھوڑ آیا تھا خط لکھا کہ راستہ صاف ہے مال لے کر آجا —— کرتار سنگھ اور اُس کی بیوی پر راہ میں جانے کیا گذری کہ قافلے والوں نے انھیں ایک صبح مرا ہوا پایا۔ مکھن سنگھ قافلے کے ہمراہ اپنی منزل پر پہنچا، تو اسے اچل سنگھ کے حوالہ کر دیا گیا —— وہ دن اور آج کا دن تھا کہ مکھن سنگھ کولھو کے بیل کی طرح اچل سنگھ کی زمینوں کے گرد چکر کاٹ رہا تھا اور خون پسینہ ایک کر کے عمدہ سے عمدہ فصلیں اگا رہا تھا۔

مکھن سنگھ کی ہیبت خواہ مخواہ تمام گاؤں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ یوں تو گاؤں میں کئی گبھرو پڑے تھے کہ اپنے کیسوں میں کنگھی کر کے، داڑھیوں کو جما جما کر، مونچھوں کو مروڑ مروڑ کر ریشمی لاچے باندھ کر، بڑھیا کرتے پہن کر، پگڑیوں میں طرّے اڑس اڑس کر گاؤں کے میلے ٹھیلے میں جاتے تو کنواریوں کے دل دھڑکنے لگتے۔ اُن کی چوڑی چھاتیاں مضبوط جسم اور جوانی کے نشے سے بوجھل بوجھل سرخ آنکھیں۔ گاؤں کی لڑکیوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتیں اور جب یہ بانکے جوان لُڈّی ناچتے تو نہ جانے کتنی ہی لڑکیاں بے تحاشہ اُن کے ساتھ ناچنے کے لئے بے چین ہو جاتیں —— لیکن مکھن سنگھ کے چہرے کی خشونت۔ کرختگی اور نگاہوں کی گرمی و تپش میں کوئی ایسی چھپی ہوئی بات تھی جس سے لڑکیوں اور عورتوں کا تو ذکر کیا گبھرو جوان بھی خائف سے رہتے تھے۔

مکھن سنگھ بالکل اجڈ گنوار تھا۔ نہ بولنے کا ڈھنگ، نہ بات کرنے کا سلیقہ، اس پر ستم یہ کہ آواز ایسی بھاری اور کرخت کہ پیار سے بھی بولتا تو یوں لگتا کہ سانڈ ڈکرا رہا ہے، ہنستا تو محسوس ہوتا کہ پہاڑی سے پتھر لڑھکائے جا رہے ہیں۔ زوروں سے بولتا یا کسی کو پکارتا تو سننے والا یہ سوچے بغیر نہ رہ سکتا کہ کہیں مست ہاتھی چنگھاڑ رہا ہے۔ اس وجاہت کا یہ اثر تھا کہ مکھن سنگھ گاؤں میں جدھر سے گذر جاتا، لوگ راستہ چھوڑ دیتے۔ اچل سنگھ کے کھیتوں کی طرف کیا مجال کہ کوئی آنکھ اُٹھا کر دیکھ لے یا حویلی کے پاس سے سر جھکائے بغیر گذر جائے۔

ایک رات حویلی کے پاس ہی گردوارے میں کیرتن ہو رہا تھا۔ اچل سنگھ نے کہا، "مکھن جا، تو بھی کیرتن میں شامل ہو جا۔" ویسے تو وہ پیدائشی سکھ تھا اور پکا مذہبی آدمی لیکن اسے مذہبی تقریبات میں شرکت کا موقع ہی کہاں ملتا تھا۔ آج جو مالک نے اجازت دی تو سیدھا گردوارے جا پہنچا۔ کیرتن کے گیت کے بول بوند بوند بن کر اس کے دل کی پتھریلی زمین پر گرنا شروع ہوئے تو اس نے محسوس کیا کہ پتھر برف کی طرح پگھل رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا اس مقام پر پہنچ گیا جہاں نوجوان عورتیں، مرد، بوڑھے بیٹھے ہوئے بڑے خشوع و خضوع سے بھجن گا رہے تھے۔ وہ ایک ستون سے لگ کر آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے بھی نہ گذرے ہوں گے کہ اچانک کچھ عورتیں بے تحاشہ چیخنے لگیں۔ بھجن بند ہو گیا لوگ کھڑے ہوگئے اور مکھن سنگھ ہر ایک کو ہکا بکا دیکھنے لگا کہ یہ اچانک کون سی آفت ٹوٹ پڑی۔ غور کیا تو سب اسی کو دیکھ رہے تھے جیسے بھیڑوں کے گلے میں شیر گھس آیا ہو۔ اُس نے محسوس کر لیا کہ اُس کی ہیبت ناک شخصیت ایسے نرم و لطیف ماحول کے لئے سازگار نہیں۔ اُس نے وہیں کھڑے کھڑے ایک بار سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ دل میں واہگرو کو یاد کیا اور پھر مڑ کر کسی کو دیکھے بغیر وہاں سے چلا آیا۔

یہ واقعہ بجائے خود پورے گاؤں کی فضا میں خوف کی گھٹا بن کر چھا گیا۔ لوگ طرح طرح

کی باتیں کرنے لگے۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ لکھن سنگھ کی آنکھوں میں ضرور کوئی بھوت پریت اُترا ہوا ہے۔ عجب اتفاق ہے کہ لکھن کا پورے گاؤں میں کوئی سنگی ساتھی بھی نہ تھا۔ اسے بچپن ہی سے تنہا تنہا سی زندگی گذارنے کا چسکا پڑ چکا تھا۔ جی کام میں بہلا رہتا تھا۔ تھک جاتا تو سو رہتا تھا۔ کھانے پر جٹتا تو چار چار آدمیوں کا کھانا اکیلے ہڑپ کر جاتا۔ باتیں کرنے کو جی چاہتا تو کھیتوں، درختوں، زمین آسمان اور ندی نالوں اور نہروں سے پہروں باتیں کرتا رہتا۔ دن میں کھیت، رات گئے تک حویلی کا کام کاج، اسی چکر میں اس کی زندگی گزر رہی تھی کہ اچل سنگھ کے بڑے لڑکے اتم سنگھ نے اسے دیکھ کر باپ سے اپنے موٹروں کے کارخانے کے لئے مانگ لیا۔ پہلے پہل تو لکھن سنگھ بہت خوش ہوا کہ شہر جا کر مزے سے رہے گا۔ جانے کتنے لوگ اچل سنگھ کے پاس شہر سے آتے تھے: بڑی بڑی کاروں میں بیٹھ کر، انگریزی کپڑے پہنے ہوئے۔ وہ کتنے اچھے لگتے تھے لیکن شہر جا کر اسے گاؤں اس قدر یاد آیا کہ ایک روز تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ اتم سنگھ نے اسے سمجھایا کہ "شہر میں تیری زندگی بنانے کے لئے لایا ہوں۔ کچھ ہنر سیکھ لے گا تو زندگی اچھی طرح گذر جائے گی ورنہ زمین پر ہل چلاتے چلاتے مر جائے گا اور کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔"

لیکن وہ کیا کرتا یہاں تو اسے گاؤں کے کھیت، درخت، پگڈنڈیاں، چھوٹے چھوٹے مکان یاد آتے تھے۔ گاؤں میں مٹی سے جو مہک اٹھتی تھی۔ وہ سیدھی اس کے دل میں گھستی ہوئی روح میں حلول کر جاتی تھی اور اس میں آج بھی وہی سکون ملتا تھا جو ماں کی چھاتیوں سے دودھ پی کر معصوم بچے کو ملتا ہے لیکن اُتم سنگھ کے ڈر سے وہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا، کام میں لگا رہتا تھا۔ بڑے بڑے کرینوں سے بھاری بھاری، ٹرک، موٹریں، جیپیں، ٹریکٹر اور چھوٹی موٹی گاڑیاں اُٹھا اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے میں اسے حیرت سی ہوتی تھی لیکن رفتہ رفتہ دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں حتیٰ کہ مہینے سالوں میں بدلنے لگے۔ اس کے دوست احباب بھی پیدا ہونے لگے۔ کام میں

مشاقی بھی بڑھنے لگی اور چند سالوں میں دیکھتے دیکھتے وہ اتم سنگھ کے کارخانے میں روح رواں بن کر دوڑنے لگا۔ اسے طاقت کا سرچشمہ سمجھا جاتا، دوست احباب اُسے لکھن سنگھ کے بجائے بھوت سنگھ کہنے کہ بڑے بڑے کام جو کسی جن یا بھوت سے بھی نہ ہو سکتے لکھن سنگھ چٹکی بجاتے میں کر دیا کرتا۔ گاؤں تو اسے ضرور یاد آتا۔ لیکن وہ یوں سوچتا کہ جب خوب دولت کما کر شادی بیاہ کر کے بال بچوں کو پال پوس کر جوان کرے گا تو پھر گاؤں واپس چلا جائے گا اور باقی ماندہ زندگی واہگرو کی یاد میں بھجن گا گا کر گذار دے گا۔ گاؤں کی یاد ایک کسک بن کر رہ گئی تھی جس طرح کڑی دھوپ میں سفر کرنے والے کو درختوں کے سائے میں بہت سکون ملتا ہے۔ اسی طرح شہر کی زندگی کے صنعتی اور نیم سرمایہ دارانہ نظام کی تیز ترین مشینی رفتار سے تھکا ہوا مزدور گاؤں کے تصور سے فرحت محسوس کرتا ہے۔

کبھی کبھی روشنی طبع بیچ بیچ بلا بن جاتی ہے۔ بیچارے لکھن سنگھ کی فنی مہارت کا چرچا اس قدر ہوا کہ فوج کے محکمہ میں اس کا نام بھیج دیا گیا طلبی ہوئی اور جب اس کا کام بیچ بیچ چوکھا نکلا تو اسے رسد رسانی کے لئے ٹرک ڈرائیور کی اسامی پر بھرتی کر لیا گیا۔ جس طرح گاؤں سے شہر آنے پر اسے دکھ ہوا تھا اسی طرح شہر سے فوج میں جانے پر بھی اسے انجانا سا دکھ ہوا لیکن چند روز میں اسے بھی دوستوں کی رفاقت حاصل ہو گئی۔ اس نے دل کو تسلی دے لی کہ زندگی شاید نئے نئے تجربے کرنے ہی کا نام ہے اور بیچ بیچ ہے بھی یہی کہ جس طرح سمندر کی لہریں باہم گرل جل کر دوڑتی اچھلتی کودتی مچلتی یہاں سے وہاں اور اِدھر سے اُدھر سفر کرتی رہتی ہیں۔ انسان بھی حالات کے امواج میں بہتا ہوا جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے لکھن سنگھ کو ٹرک ڈرائیور کی حیثیت سے کام کرتے کچھ عرصہ گذرا تو اسے اس میں بھی مزا آنے لگا۔ قطار اندر قطار انجانے راستوں اور سنسان سڑکوں پر ٹرکوں کے قافلے جب راتوں کی تاریکی میں چلتے تو ایسے میں انجانے خوف کی لذت کتنی انوکھی

ہوتی تھی۔ اسے واقعی مزا آنے لگا۔ چپکے چپکے، آہستہ آہستہ چوہوں کی طرح رینگتے ہوئے قافلوں کی شکل میں ٹرک چلانا کتنا عجیب تھا۔ پہاڑوں، میدانوں، بستیوں اور کھیتوں سے گذرتے ہوئے اس کے دل میں گدگدیاں سی ہوتے لگتیں اور جب کشمیر کے محاذ پر دوران جنگ رسد رسانی کے سلسلے بار بار منقطع ہوتے تو ایسے میں گولیوں کی بوچھاڑ، توپوں کی گھن گرج میں، اچھے اچھے جیالے بھی حوصلہ ہار جاتے تھے لیکن لکھن سنگھ ہتھیلی پر جان لے کر محاذ پر پہنچتا تھا۔ اس تہوّر کو دیکھ کر لوگ عش عش بھی کرتے اور اس کی ہیو قوفی پر ہنستے بھی لیکن ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر وہ صرف یہ سوچتا کہ اس کے دل میں چھپا بیٹھا کوئی شخص اس سے یہ کہہ رہا ہے کہ خطروں میں گھر کر بہادری کے کام کرنے ہی میں سب سے زیادہ لذت ہے اور اسی لئے وہ کام میں مگن رہتا۔ اسے کسی کی داد بیداد سے کوئی سروکار نہ تھا خطروں میں کام کرنا من کو بھاتا تھا اس لئے وہ ایسے موقعے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیدا کرتا اور اپنے کام میں جٹا رہتا۔

کشمیر کے محاذ پر اُس نے ایسے ایسے کام کیے کہ تمام ڈرائیوروں پر اس کی دھاک بیٹھ گئی بنگال میں گڑبڑ ہوئی تو سارے ہندوستان کے منتخب ہنرمند سپاہیوں کو بنگلہ دیش کے محاذ پر بھیجا گیا، ظاہر ہے کہ لکھن سنگھ بھی بھیجا گیا اور حسب معمول اُس نے وہاں بھی خطرناک مہموں میں حصہ لیا۔ دریاؤں، نہروں اور جنگلی نالوں میں گھرے ہوئے پُر خطر راستوں سے رسد رسانی کا کام کچھ آسان نہ تھا۔ جگہ جگہ پر خطرہ۔ ایک ایک موڑ پر ڈر اس پر طرہ یہ کہ نئی سرزمین، نئے راستے کچھ خبر نہیں کہ کدھر سے کس وقت کس قسم کا حملہ ہو جائے گا۔ اس کے ساتھی اکثر خائف رہتے تھے بعض دوسری جنگ عظیم میں برما پر جاپانی یلغار کے حوالے دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ایسے راستوں سے بچ نکلنا آسان کام نہیں لیکن لکھن کو اس ہلکے ہلکے خوف میں بڑا مزا آتا وہ بڑھ چڑھ کر ان مہمات کے لئے اپنا نام خود پیش کرتا اور اکثر خطرات میں پھنس کر

دل ہی دل میں خوش ہوتا کہ لو بھئی لکھن سنگھ ہو گئے زندگی کے دن پورے، اگر توپ بندوق سے بچ گئے تو اوپر سے ہوائی جہازوں کی بمباری سے کیسے بچو گے، یار تمہاری لاش کا بھی پتہ نہیں چلے گا، چیلیں، گدھ، کتے اور بھیڑیئے تک بارود میں سڑے ہوئے گوشت کو نہیں پوچھتے۔ بلے کیا مزہ آئے گا جب لاش کو ٹینک کچلتے ہوئے گذر جائیں گے۔ گولے پھٹیں گے اور جسم چیتھڑے ہو کر بکھر جائے گا۔ لیکن ہونا کچھ بھی نہیں، لکھن سنگھ ہمیشہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا۔ کبھی کبھی تو واقعی بالکل بال بال بچتا۔ کشمیر کے محاذ پر ایک بار اس کے کانوائے کو دشمن کے جہازوں نے آ لیا۔ پورے پانچ خونخوار جہاز تھے، سارا کانوائے اسلحہ سے لیس تھا۔ کوئی ٹرک، کوئی ڈرائیور اور کوئی سامان سلامت نہ بچا لیکن لکھن سنگھ حیرت انگیز طور پر بم پھٹنے سے ٹرک کے اگلے حصے سمیت فضا میں بلند ہوا، ٹرک نیچے گرا اور وہ درخت کی جھاڑیوں میں پھنس گیا۔ جب سارا اسلحہ بھسم کر تباہ ہو گیا تو وہ مزے سے اترا اور جا کر اپنے کانوائے کی رام کہانی سنادی اور دوسرا کانوائے لے کر پھر محاذ پر پہنچ گیا۔ اس کے بعد تو لکھن سنگھ ہر ایک سے یہی کہتا کہ بھائی موت جب آتی ہے تو آدمی کو فولاد کے قلعے سے توڑ کر نکال لے جاتی ہے ورنہ گولیوں کی بوچھاڑ میں مزے سے ٹہلتے رہو کوئی گولی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔

بنگلہ دیش کے محاذ پر مہینوں اسے رسد رسانی کا کام انجام دینا پڑا۔ ایک بار تو غضب ہی ہو گیا کہ جس کانوائے کی لکھن سنگھ رہنمائی کر رہا تھا وہ عین دشمن کے مورچے پر جا نکلا اور سارا کانوائے گرفتار ہو گیا۔ لکھن سنگھ بھی گرفتار شدگان میں شامل تھا۔ اگرچہ دشمن کا سلوک بہت اچھا تھا لیکن ابھی ایک دن بھی تمام نہیں ہوا کہ دشمن کو دوسرے محاذ پر جانے کا حکم ملا اور پیچھے سے اچانک اس کے یونٹ کے دوسرے سپاہیوں نے آ لیا۔ لکھن سنگھ کے لئے اتنا حوصلہ بہت تھا اُس نے وہیں سے ایک مشین گن اٹھا کر دشمن کو بھون کر رکھ دیا۔ لیکن اُس نے مہمان نوازی

کرنے والے دشمن پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اس کے یونٹ کے سپاہی جب وہاں پہنچے تو مکھن سنگھ کے اس کامیاب آپریشن کی سب نے تعریف کی اور کہا کہ اسے کوئی نہ کوئی تمغہ ضرور ملے گا مگر تمغے کی اسے کیا ضرورت تھی اس کا تمغہ تو اسے مل چکا تھا۔ جب وہ خطرے میں گھر چکا تھا اور ہر لمحے موت سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ ایسے میں اسے قدر لطف آیا جب اس کے تمام سنگی ساتھی گرفتار ہو چکے تھے اور اسے سرینڈر (SURRENDER) کرنے کا حکم دیا گیا تھا تو لوگ بری طرح کانپ رہے تھے لیکن اس نے سرینڈر کرتے ہی قہقہے لگانا شروع کر دیئے تھے۔ دشمن کے ایک سپاہی نے اسے دیوانہ وار قہقہے لگاتے ہوئے دیکھ کر حیرت سے کہا تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے مکھن سنگھ اس سے بے تکلفی سے پنجابی زبان میں بولا تھا "تاڈے کول مکھن روٹی اے؟" (تمہارے پاس مکھن روٹی ہے) اور وہ بڑے پیار سے بولا تھا "آہو سرداراں، مکھن روٹی دی کی لوڑ پے گئی؟" (ہاں ہاں، سردار جی، مکھن روٹی کی کیا ضرورت پڑ گئی) اور وہ اس سپاہی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا تھا "سانو بھک لگ رہئی اے" (ہمیں بھوک لگ رہی ہے) اس کے تمام ساتھی حیرت میں پڑے ہوئے تھے کسی نے ابھی تک ہاتھ نہیں گرائے تھے مکھن سنگھ گرج کر بولا تھا "اوئے گرا ہتھ نوں، اے ساڈے بھرا نیں" (ارے گرا لو ہاتھوں کو یہ تو اپنے بھائی ہیں) اور اس کامیاب آپریشن کے بعد جب مکھن سنگھ اپنے اس منہ بولے بھائی کی طرف متوجہ ہوا جس نے اسے گرفتاری کے بعد مکھن روٹی پیش کی تھی تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے مورچے میں ٹھنڈا پڑا تھا۔ مکھن سنگھ نے اسے بہت جھنجھوڑا "اوئے تینوں کی ہو یا؟" (ارے کیا ہوا) لیکن مرنے والا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکا تھا۔ مکھن سنگھ کو زندگی میں پہلی مرتبہ دھچکا لگا، اس دھچکے سے بھی زیادہ شدید دھچکا، جیسا ایک بار گردوارے میں اسے دیکھ کر لوگوں کے ڈر جانے سے لگا تھا، اس سے بھی زیادہ جیسا اسے گاؤں چھوڑ کر شہر آنے پر لگا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے دشمن کے

مرے ہوئے سپاہی پر لکھن سنگھ کو اس طرح جھکے ہوئے اور پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے دیکھ کر حیرت کی تھی اور ایک۔ لالہ جی بول پڑے تھے: "پتہ نہیں لکھن کو کیا ہو جاتا ہے۔ اے مے تو میں نے ٹھنڈا کیا ہے میں نے اور لکھن سنگھ اس پر جھپٹ کر بولا تھا 'اوے بزدلا، اے مہمان نوازی دا صلہ دیتا ای۔' (ارے او بزدل یہ مہمان نوازی کا صلہ دیا ہے)۔

چند دن تو اس واقعہ کو بھلانے میں لگے لیکن مہم جوئی کا رسیا لکھن سنگھ کب تک یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھتا۔ زندگی اور موت کا کھیل تو جنگ میں کھیلا ہی جاتا ہے، توپ اور بندوق سے پھول تو نہیں برستے اور نہ مکھن روٹی کی بارش ہوتی ہے۔ جنگ تو جنگ ہوتی ہے زندگی کی لہلہاتی کھیتیوں کو جلا کر رکھ دیتی ہے، سہاگنوں کی مانگوں کا سیندور، ماؤں کی ممتا، بہنوں کے دل کی تقویت سب کچھ آنِ واحد میں ختم ہو جاتا ہے۔ بستیاں شہر خموشاں بن جاتی ہیں۔ اس نے اچھے سے اچھے سپاہی کو لڑتے ہوئے بھی دیکھا تھا لیکن کس طرح؟ اس طرح کہ خوب شراب پی کر جب وہ ہوش و حواس کھو دیتا ہے تو زندگی اور موت کی تمیز مٹا دیتا ہے اور جب اپنے بیگانے کی حس ختم ہو جاتی ہے تو وہ خوب لڑتا ہے۔ جنگ واقعی شیطانی قوت ہے جس سے بربادیاں جنم لیتی ہیں لیکن لکھن سنگھ نہ تو ان نتائج و عواقب پر غور کرتا تھا اور نہ کر سکتا تھا۔ اس کا تو معاملہ ہی الگ تھا نہ تو وہ سپاہی تھا جو بندوق سنبھال کر مورچے میں بیٹھتا ہے اور نہ اسے جنگ سے دلچسپی تھی، اسے تو صرف خود کو مشکلوں میں پھنسا کر لطف آتا تھا اور اس کے لیے جنگی مہمات سب سے زیادہ موزوں تھیں۔ یہاں اسے اپنے اندر سے ایک اور لکھن سنگھ برآمد ہوتا نظر آتا تھا جو خود کو دکھ پہنچا پہنچا کر خود ہی ہنستا اور قہقہے بھی لگاتا تھا۔ بنگال کا علاقہ قدم قدم پر خطرات سے پر تھا۔ جنگلوں اور گھنے درختوں کے اندر سے گزرنے والی شاہراہوں پر رات کی تاریکی میں کانوائے لے کر گزرنا واقعی جان جوکھوں کا کام ہے جس میں بڑے بڑے سورما جی چھوڑ بیٹھتے ہیں لیکن لکھن سنگھ نے ہمیشہ

آگے بڑھ کر اس کام کو سنبھالا۔

اس کے اکثر ساتھی بنگال کی مہم میں شریک ہونے سے زیادہ کلکتے کے بازاروں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ بلیک آؤٹ کے زمانے میں کلکتہ تو شہرِ خموشاں تھا اور جنگ روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ مشرقی بنگال کو ہندوستانی افواج نے تین اطراف سے گھیرے میں لے کر فائر کھول دیا اور جنگ کی رفتار تیز کر دی یہاں تک کہ چند روز میں جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ بلیک آؤٹ ختم ہو گیا اور کلکتہ کی رونقیں واپس آ گئیں مکھن سنگھ کے سنگی ساتھی تو کلکتے میں جی بہلانے لگے اور وہ پاکستانی افواج کے گرفتار شدہ سپاہیوں کو ٹرکوں میں بھر بھر کر قیدیوں کے کیمپوں میں پہنچاتا رہا "بنگلہ دیش" میں اب وہ آزادی سے گھومتا پھرتا، جدھر چاہتا جا سکتا تھا لیکن اس زمانے میں اس کے کام کی رفتار بڑھا دی گئی۔ اسے کلکتہ اور "بنگلہ دیش" کے مختلف شہروں کے چکر کاٹنے ہی سے فرصت نہ تھی کہ کچھ اور سوچتا البتہ مہم جوئی کا اب کچھ مزہ باقی نہ رہا، اب تو بس ایسا ہی کام تھا جیسے سردار اچل سنگھ کے کھیتوں میں وہ چپ چاپ کیا کرتا تھا۔ لہٰذا اُسے اب کچھ مزہ نہیں مل رہا تھا۔ بس فرض پورا کر رہا تھا۔

اسی مہم جوئی کے سبب اُس نے اپنے ایک دوست سے کہا "یار اب مزہ نہیں آتا لگتا ہے کولہو کے بیل کی طرح بس کام کئے جاؤ۔ جب تک جان جوکھوں کام نہ ہو اپنے کو چین نہیں آتا۔" اس کا دوست اس کے کندھے پر زور دں سے ہاتھ مار کر بولا تھا "اچھا تو پھر لگا دوں کام سے تجھے۔" مکھن سنگھ بولا "پیارے ! —— جلدی لگا۔ ہاتھ پیروں میں زنگ لگ رہا ہے۔" اس کے دوست نے اسے کلکتہ کے ایک بہت بڑے سیٹھ کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا اور بولا "سیٹھ جی —— سردار جی اس کام کے لئے کیسے رہیں گے؟"

سیٹھ نے مکھن سنگھ کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا "بہت اچھے، بہت مضبوط، کتنا

مال اٹھاؤ گے سردار جی!"

اس کا دوست سیٹھ کو آنکھ مار کے بولا "سیٹھ جی! ـــــ یہ کام ہم پر چھوڑ دو، بس یہ بتاؤ کہ مال پانی کا کیا انتظام ہے؟"

سیٹھ نے ایک مکروہ قہقہہ لگا کر کہا "لالہ تمہیں خوش کردوں گا، مگر بازار بہت مندا جا رہا ہے۔ اُدھر سے اتنا مال گرا ہے کہ اٹھلئے نہیں اٹھتا۔ کوڑیوں میں بک رہا ہے۔"

اس کے دوست نے بڑے کاروباری انداز میں کہا "سیٹھ ہم سے تریا چلتر نہیں چلے گا مال مال میں فرق ہوتا ہے ـــــ بتاؤ اس سے پہلے کا مال کیسا تھا؟"

"تھا تو اچھا" سیٹھ بولا "مگر دام کچھ اچھے نہیں اٹھے۔"

"اگر تم سے معاملہ نہیں پٹا تو خیر بمبئی والا سیٹھ ـــــ"

"بمبئی والا سیٹھ، تم کو کہاں ملا تھا وہ؟" سیٹھ پریشان ہوگیا۔ "ہوٹل میں" اس کے دوست نے کہا ـــــ "اچھا اچھا بابا جاؤ، تم دونوں کو خوش کردوں گا، مال تو اٹھاؤ۔"

دونوں مال سپلائی کرنے کا وعدہ کرکے چلے تو آئے لیکن مکھن سنگھ کے پلے کچھ نہ پڑا تو وہ بولا "یار کونسا مال ہے، کیسا کام ہے کچھ مجھے بھی تو بتا" ـــــ اس کے ساتھی نے بڑی رازداری سے اس کے کان میں کہا "دیکھ تجھے ہر ٹرپ (TRIP) پر سو روپیہ ملے گا۔ کام یہ ہے کہ سیٹھ کی کاریں یہاں سے جاؤ بنگلہ دیش کے ـــــ کیمپ پر، جا کر یہ نشان دکھاؤ" اس نے ایک چابی اسے دیتے ہوئے کہا "تو تم کو وہاں مہمان رکھ لیا جائے گا۔

"پھر" مکھن نے بے چین ہو کر پوچھا ـــــ اس کے دوست نے جواب دیا "پھر رات گئے تم کو جگا کر ایک جگہ لے جایا جائے گا وہاں چار پانچ ٹرک ملیں گے اور ہر ٹرک لوہے کی چادروں سے کورڈ (COVERED) ہوگا۔ اس کے دروازوں پر تالے پڑے ہوں گے

تالوں پر سیل (SEAL) لگی ہو گی۔ ہر ٹرک میں ڈرائیور موجود ہو گا، آگے کا ٹرک خالی ہو گا
اُسے تم چلا کر لیڈ دو گے، ہر کام احتیاط اور صبر سے ہو گا۔"

"پھر" مکھن سنگھ نے کہا ——— "پھر کیا ہو گا؟"

"وہ ٹرک یہاں کلکتہ پہنچائے جائیں گے، جنگل پر تم کو میں مل جاؤں گا۔"

"مگر یار" مکھن سنگھ بولا "یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ اس میں ہو گا کیا۔"

اس کا دوست خشمگیں انداز میں بولا "اس راز کی قیمت تم کو سو روپیہ ادا کی جا رہی ہے۔"

مکھن بولا "وہ تو ٹھیک ہے پر میرے یار، تو تو میرا یار ہے تجھے مجھ پر بھروسا نہیں۔"

"بھروسا تو ہے پر تجھے ابھی نہیں بتاؤں گا، بس تو تیار رہو۔"

"یار میں تیار ہوں مزیدار کام بتایا ہے۔"

اپنے دوست کے بتائے ہوئے راستہ پر وہ چل پڑا کہ مہم جوئی اس کا مزاج تھا اور خطروں سے کھیلنا اس کا دستور۔ چنانچہ مذکورہ کیمپ پر پہنچتے ہی جب اُس نے متعلقین کو نشان دے دیا تو اسے کیمپ میں حفاظت سے رکھ لیا گیا۔ رات گئے اسے بیدار کر کے ایک سنسان مقام پر لایا گیا، جہاں پانچ بکتر بند گاڑیاں کھڑی تھیں۔ چار گاڑیوں میں ڈرائیور موجود تھے۔ سب سے آگے کی پانچویں گاڑی خالی تھی۔ محافظوں نے سردار مکھن سنگھ سے کہا "خبردار خزانہ سنبھال کر لے جانا، خزانے کی کنجی سیٹھ کو پہنچ گئی ہے۔" اُس نے اپنے دوست کی ہدایت کے بموجب کہا "سب ٹھیک ہے۔" اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ تمام راستہ بڑی جان جوکھوں میں گزرا، سڑک خاصی مصروف تھی، جگہ جگہ پر درختوں کے جھنڈوں میں گاڑیاں روکنا پڑیں اندھیرے میں روشنی جلائے بغیر سفر طے ہوتا رہا لیکن آج مکھن سنگھ کو خزانے کی کھوج لگی ہوئی تھی کہ یہ کیسا خزانہ ہے، کہاں سے چلا ہے، کہاں جا رہا ہے۔ سیٹھ سے اس کا کیا تعلق

ہے، اُس نے سیٹھ کی خاطر یہ کام کس لئے قبول کر لیا، آخر اس کا انجام کیا ہو گا۔ لیکن ہر سوال کا جواب اس نقطہ پر آکر ختم ہو جاتا ہے کہ یہ مہم بھی مزیدار ہے جو کچھ بھی ہو دیکھا جائے گا۔

پانچ چھ گھنٹے کا سفر پورے دس گھنٹے میں طے ہوا، چنگی پر اس کا دوست مل گیا، اور چنگی کے محرر سے باتیں کرتا ہوا اس کے پاس آگیا، محرر کو سو روپیہ کا نوٹ دے کر اس کی بغل میں آ بیٹھا اور بیٹھتے ہی بولا "خزانہ سنبھال کر لائے ہو" ۔۔۔ محرر سلام کر کے رخصت ہوا، گاڑیاں چلدیں تو مکھن بولا "خزانہ تو لے آیا پر تو نے یہ نہ بتایا کہ یہ خزانہ ہے کیسا ۔۔۔ یار کوئی بینک وینک تو نہیں لوٹا گیا ہے؟"

"بینک!" اس کے دوست نے زوردار قہقہہ لگایا، اس کے بازو پر زور کی چٹکی لی اور آنکھ مار کر بولا "یار تو بالکل ہی بونگا ہے، خیر تو چل تو سہی تجھے خزانہ دکھا دیں گے ۔۔۔ ہے تو تو اپنا یار ہی۔"

مکھن بولا "مجھے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے، تو مکھن روٹی لایا ہے؟"

"لایا ہوں، ابے لایا ہوں، مرا کیوں جا رہا ہے۔"

منزل مقصود پر پہنچ کر اس کا دوست اُسے لے کر ایک عالی شان عمارت میں داخل ہوا، جہاں سنتری نے اسے سلام کیا اور راستہ دیا، ایک لمبے کوریڈور سے گذر کر جب وہ ڈرائنگ روم میں پہنچے تو سیٹھ انھیں ٹہلتا ہوا مل گیا۔ دونوں کو دیکھتے ہی بے چینی سے مڑا اور بولا "خزانہ پہنچ گیا ۔۔۔؟" اس کے دوست نے اطمینان سے کہا "پہنچ گیا ۔۔۔" مکھن سنگھ نے کہا "خزانہ کی کنجی پہنچ گئی؟" سیٹھ نے کہا "پہنچ گئی ۔۔۔ تم بہت ہوشیار آدمی ہو، تم کو پچاس روپیہ اور بھی ملے گا مٹھائی کھانے کے لئے ۔۔۔" مکھن سنگھ کو سیٹھ کے ڈائننگ روم میں کھانا کھانے کے لئے بھیجدیا گیا اور اس کے دوست اور سیٹھ وہیں ڈرائنگ روم میں باتیں شروع

ہو گئیں، وہی کاروباری باتیں، یہ رقم کم ہے مال بڑھیا ہے۔ یہ ہے، وہ ہے اونہہ اس کی بلا سے وہ تو مزے سے مکھن روٹی کھاتا رہا، خوب ڈٹ کر پانی پیا۔ کچھ دیر کے بعد اس کا دوست وہاں آیا اور اُسے لے کر ایک اور بڑے کمرے میں آ گیا جہاں ایک اسٹیج سا بنا ہوا تھا اور اسٹیج کے نیچے چند صوفے پڑے تھے۔ پورے کمرے میں جگہ جگہ پر مسلح سنتری کھڑے ہوئے تھے۔ سیٹھ تین چار موٹے موٹے بھدے اور ناٹے جسم کے مردوں کو لے کر داخل ہوا۔ پھر دروازے بند کر دیئے گئے اور مہمان صوفوں پر جم گئے، پہرہ سخت کر دیا گیا۔ اُس کا دوست آگے بڑھا، سیٹھ نے اُسے کنجی دے دی۔ دوست کنجی لے کر اسٹیج پر بنے ہوئے دروازے کے پاس چلا گیا، ایک سنتری نے دروازہ کھول دیا اس کے دوست نے اشارہ کیا، اندر سے دو آدمی ایک نوجوان لڑکی کو لے کر اسٹیج پر نمودار ہوئے، تیز روشنیاں کھول دی گئیں۔ لڑکی کے منہ پر پٹی بندھی تھی اُسے کھول دیا گیا، روئی ٹھنسی تھی منہ میں اسے نکال دیا گیا اور پھر دونوں آدمیوں نے نہایت بے دردی سے لڑکی کے جسم کا لباس چاک چاک کر کے اُسے بالکل برہنہ کر دیا۔ مکھن سنگھ دم بخود رہ گیا۔ سیٹھوں نے روشنی کے ادلتے بدلتے زاویوں میں اسے ہر طرح سے دیکھا۔ ایک نے کہا۔ "ایک ہزار۔" دوسرا بولا "بارہ سو"، تیسرے نے کہا "ساڑھے بارہ سو"۔ سیٹھ بولا "منظور"۔ دونوں آدمیوں نے لڑکی کو اٹھا کر دوسرے دروازے میں اچھال دیا اور دوسری لڑکی کو اٹھا لائے۔ پھر تیسری چوتھی، پانچویں، چھٹی ——— چھ تک تو اس نے لڑکیاں گنیں۔ پھر اس کے بعد اسے پتہ نہیں کہ وہ کب بیہوش ہو کر گر پڑا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ عورت کو بھیڑ بکریوں کی طرح خریدا اور بیچا جا سکتا ہے۔ ہوش آیا تو اس نے خود کو اپنے دوست کے کمرے میں پایا، سر کو بار بار جھٹکا کہ کہیں یہ بھیانک خواب تو نہ تھا لیکن اس کی جیب میں ڈیڑھ سو روپے کے کھڑکھڑاتے نوٹ ٹھنسے ہوئے تھے اور اس کا دوست کہہ رہا تھا "واہ بچو! بس ہار گئے، عورت کے ننگے جسم سے ہار گئے ———

وہ چپکے سے اٹھا، نوٹ اُس نے پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیئے اور اپنے دوست سے بولا "کیا ہر جنگ کے بعد یہی ہوتا ہے" ـــــ اس کا دوست ہکا بکا اسے دیکھتا رہا اور بولا "کیا ہوتا ہے؟" مکھن نے کہا "ہر مال ملے گا چار آنہ"! مکھن سنگھ نے کلکتہ کے فٹ پاتھوں پر جا بجا دوکان لگائے بیٹھے ہوئے دوکانداروں کو اسی انداز میں مال بیچتے ہوئے دیکھا تھا۔

"تمہارے پاس بس اسی خزانے کی کنجی ہے؟" اس نے اپنے دوست کو حقارت سے دیکھا اور ہلا ڈالا اور پھر بلک بلک کر رونے لگا، اس کے دوست نے اُسے سمجھانے کی بڑی کوشش کی تسلی دلاسا دینا چاہا مگر وہ وہاں سے چلنے لگا، اس کی نگاہوں میں اپنے دوست کے لئے اب نفرت ہی نفرت تھی۔ "سنو مکھن ـــــ تم کہاں جارہے ہو؟" دوست اُس کے قریب آکر بولا، لیکن مکھن نے اُسے پرے دھکیل دیا، دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور جب اُس نے دیکھا کہ اس کا دوست بھی اس کے پیچھے پیچھے آرہا ہے تو اس نے دوڑنا شروع کر دیا، دوڑتا رہا، دوڑتا رہا ـــــ حتیٰ کہ آبادی سے بہت دور نکل آیا۔ یہاں قریب ہی ایک گردوارے میں کیرتن ہو رہا تھا اور بھجن گائے جارہے تھے، آوازیں دور دور تک آرہی تھیں۔ گردوارے کی دہلیز پر گر کر وہ بلک بلک کر رونے لگا، چیخ چیخ کر رونے لگا اپنے کیس نوچ نوچ کر رونے لگا اور جب سارے لوگ کیرتن چھوڑ چھوڑ کر باہر آگئے تو ایک بزرگ سکھ نے اُسے دہلیز سے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا اور نہایت نرمی سے پوچھا "کیا بات ہے، کیا دکھ ہے؟" مکھن سنگھ سسکیاں لیتے ہوئے بولا "کنجی گم ہو گئی ہے ـــــ واہگرو رحم کرو، امن کی کنجی گم ہو گئی ہے ـــــ شانتی کی کنجی کھو گئی ہے"۔

بدلتا ہے رنگ آسماں

دو چار ستارے آسمان میں ٹمٹما رہے تھے جب مخدوم سردی میں سمٹا ہوا اسٹیشن پہنچا۔ گاڑی آئی، اِکّا دُکّا لوگ اُترے۔ دو ایک گاڑی میں چڑھے اور گاڑی چل دی۔ مخدوم نے سارا سفر سہم سہم کر طے کیا کہ مبادا کسی کی نظر اس پر پڑ جائے اور پھر اسے گھر پکڑ بلایا جائے۔

جس وقت لکھنؤ شہر کا چھوٹا اسٹیشن آغا میر کی ڈیوڑھی آیا اور گاڑی رُکی تو لوگوں کی بھیر کی بھیر گاڑی سے اُتری اور ہجوم کا ہجوم گاڑی میں سوار ہوا۔ اس ریل پیل اور دھکم دھکا میں کچھ دیر تک تو وہ ہکّا بکّا کھڑا ایک ایک کو تکتا رہا اور اس کے دماغ میں ملّو چاچا کا وہ فقرہ چکّر لگاتا رہا۔

ارے لکھلؤ کی کا کہت ہو ایک سے ایک نباب رہت ہیں۔ سارا سہر سونے میں پیلا اور چاندی میں سپید دکھت ہے، مانو ہن برستا ہو ہن!!

مخدوم گاڑی سے اترا، چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو عالم ہی دوسرا تھا۔ عمارتیں ہی

عمارتیں، سڑکیں ہی سڑکیں اور بگھیاں ہی بگھیاں ۔ آدمی بھی طرحدار، بانکے سجیلے، تنگ مُہری کے گھٹنے، تنگ آستینوں کے انگرکھے۔ دوپلّی چنی ہوئی ٹوپیاں۔ کیسے سپید سپید بگلے کے پروں کی طرح صاف شفاف کپڑے اور پھر چنے ہوئے دوپٹے گلوں میں پڑے، ہونٹوں پر پان کا لاکھا جما ہوا۔ آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا۔ مخدوم۔ مخدوم کو اپنے قصبے کا زمیندار یاد آگیا جو عید بقرعید صاف کپڑے پہن کر بستی بھر میں اترایا اترایا گھومتا تھا۔ یہاں اس کو ہر شخص زمیندار نظر آتا تھا۔

میلی دھوتی میں لپٹا لپٹایا مخدوم اسٹیشن کے باہر پہنچا تو دیر تک لوگوں کی آمد و رفت میں محو رہا۔ اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اب کیا کرے کہاں جائے اور کس سے نوکری طلب کرے۔ وہ دیر تک ایک جگہ کھڑا سوچتا رہا۔ ایک درخت کے نیچے ایک بگھی کھڑی تھی۔ گھوڑے دانا کھا رہے تھے۔ سائیس جلیبیاں کھا کھا کر مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا اور کبھی کبھی اسے گانا گانے کی لہر آتی تو گانے لگتا

چلا نہیں جائے ہم سے ہیوں ہیوں چلا نہیں جائے

اب چلا نہیں جائے ہاں چلا نہیں دیکھو چلا نہیں جائے

اور ساتھ ہی ساتھ دیدے بھی مٹکاتا جاتا، کولھے بھی چلاتا جاتا اور جلیبیوں کے چٹخارے بھی لیتا جاتا:

پہلی پٹھونی مورے سسر گھر آئے — سر گھر آئے

سسر کے سنگ مورا اٹھینگا جائے: را اٹھینگا جائے

ہم سے ہیوں ہیوں چلا نہیں جائے

مخدوم کو یاد آیا کہ زمیندار کے نوزائیدہ بچے کا عقیقہ جب ہوا تھا تو لکھنؤ کی ایک طوائف نے یہی گانا بھاؤ بتا بتا کر گایا تھا۔ سارا قصبہ گانے پر ریجھا ہوا تھا اور طوائف پر تو گویا لٹو ہو رہا تھا۔ رات بھر گیس کی روشنیوں میں اس سے یہی گانا سنا گیا اور اس پر روپیوں پیسوں کی بارش ہوتی رہی۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس گانے میں دلھن نہ سسر کے ساتھ جانے پر تیار ہوتی ہے اور نہ جیٹھ اور دیور کے

ساتھ جب "بلما" کا ذکر آتا ہے تو جھٹ جانے پر تیار ہو جاتی ہے :

بلما گھر آئے

بلما کے سنگ مورا جیا للچائے، ہم سے پیوں پیوں....

اور جب سائیں نے آخری بول گائے تو مخدوم ہنس دیا، سائیں بھی ہنس دیا اور بولا

"کرسی سے آرہے ہو ؟"

اور جب مخدوم نے نفی میں گردن ہلا دی تو بولا " پھر گونڈے سے آئے ہو گے ؟ "

اور جب گونڈے پر بھی مخدوم نے انکار کیا تو وہ بولا " نانپارے سے ؟ "

اور جب اس پر انکار ہوا تو جھنجھلا کر بولا " تو کیا جناب سیدھے عرش معلی سے تشریف لا رہے ہیں"

مگر مخدوم بولا " جمرول ضلع بہرائچ سے "

بگھی سے اتر کر گھوڑوں کو تھپتھپاتے ہوئے سائیں بولا ـــــ " گھر سے بھاگے ہو ؟"

اور مخدوم سن سے ہو گیا کہ اب اس کی خیر نہیں سائیں دوسرے ہی لمحے بولا " برخوردار گھبرائے کیوں ہو، اُدھر سے اِدھر جو بھی آتا ہے بھاگ ہی کر آتا ہے اور جو آتا ہے یہیں کا ہو جاتا ہے۔ اور پھر گھوڑوں پر ساز رکھتے ہوئے ایک لمحے ٹھٹھکا اور ٹھٹھکا۔ کر بولا " بڑا ظالم شہر ہے میاں ابھی تم کیا سمجھو گے اس شہر کو، اجی یہ شہر تو جادو کا تہ خانہ ہے جس کی کوٹھریاں طلسمات سے بھری ہوئی ہیں

اور ـــ اور خیر چھوڑو ـــ یہ بتاؤ کدھر جانا ہے ۔

مخدوم کو تو خود بھی اپنی منزل کا پتہ نہیں تھا، جواب کیا دیتا سر کھجانے لگا

سائیں بھی قیامت کا آدمی تھا، جھٹ تاڑ گیا بولا " اجی ہم سمجھ گئے تمہیں نوکری چاہیئے ہے ــــ خیر تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی رئیس سے پالا پڑا تھا۔ آج ہی نواب چھبن صاحب کے اصطبل پر نوکری لگ جائے گی مگر یاد رکھنا میرے یار بڑا بانکا رئیس ہے۔ بات کے لئے لاکھ بھی خاک کر دیتا ہے

ایک سے ایک قیمتی گھوڑا پڑا ہے اصطبل میں۔ ایسا ایسا چکنا گھوڑا کہ میاں مکھی تو مکھی نگاہ بھی پھسلتی ہے۔ جو ٹھیک سے کام نہ کیا تو کوڑے سے کھال ادھیڑ دے گا نواب۔ ہاں بھائی غصہ تو ایسا ہی ہے، منظور رہو تو ہاں کرنا نہیں تو نا کر دینا۔" اور پھر گھوڑوں کو بگھی میں جوت کر سائیس بولا! "ایک بات ہے میاں صاحبزادے! اگر نواب تم سے خوش ہو گیا تو سمجھو دلدّر دور ہو گئے، دن پھر گئے۔ ناکوں ناک دولت میں ڈوب جاؤ گے۔" اور پھر مزے سے بگھی میں جا بیٹھا۔ لگام اٹھانا ہی چاہتا تھا کہ مڑا اور بولا۔ "منظور ہو تو پیچھے پاؤں دان پر کھڑے ہو جاؤ۔" اور مخدوم بلا چوں و چرا کئے پاؤں دان پر کھڑا ہو گیا۔

بگھی بان نے لگام اٹھائی۔ سر پر ٹوپی ٹھیک سے جمائی۔ گلے میں پڑے ہوئے تعویذ کو چوما۔ گھوڑوں پر دعا پڑھ کر دم کی اور پھر یا علی اور کہنی کہہ کر گھوڑے ہانک دیئے۔ بگھی چل پڑی اور بگھی ایک کشادہ سڑک پر آئی ہی تھی کہ سائیس بگھی روک کر نیچے اترا اور دو آدمیوں کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور لگا جھک جھک کر سلام کرنے۔ دونوں آدمی بوڑھے تھے، خشخشی داڑھیاں تھیں۔ سپید براق سے کپڑے پہنے تھے۔ ایک نے بگھی بان سے پوچھا "کیوں بھئی مرزا خیرو۔ بھلا کدھر جا رہے تھے؟"

"حضور، بگھی بان یعنی مرزا خیرو جھکا اور بولا "سرکار کی قدمبوسی کو حاضر ہو رہا تھا" اور مخدوم اچنبھے میں آگیا کہ چند لمحے پہلے مٹکنے تھر کنے والا سائیس کیسا ثقہ بن گیا تھا؟ اور کس ادب تمیز سے گفتگو کر رہا تھا۔

سواریاں بیٹھیں اور بگھی دریا والی سڑک پر دھیرے دھیرے چلنے لگی۔ راستے میں ہزاروں بگھیاں، ٹمٹمیں، یکے، شکرمیں، تانگے ملے، جن میں سواریاں بیٹھی تھیں اور لوگ ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔ دریا والی سڑک پر انگریز اور ان کی میمیں اور انگریزی فوج کے گورے صاحب بھی سیر کرتے تھے۔ ڈولیاں، چوپہلے، پینیس اور سکھپال بھی کہار اٹھائے اٹھائے دوڑتے تھے۔ خدمتگار، حبشی، خدمت

چوبدار اور مصاحب نوابوں کے جلو میں چلتے تھے۔ گھوڑوں اور ہاتھیوں پر جدا لوگ چلتے تھے اور شہر میں ایک آدھ موٹر بھی نظر آ جاتی تھی جسے لوگ حیرت سے دیکھتے تھے۔ سودے سلف کے بیچنے والے، خوانچے والے، پھرتے تھے اور مخدوم پھٹی پھٹی آنکھوں سے شہر کو دیکھتا کہ یا اللہ اتنا بڑا شہر اور ایسی رونق۔

اپنے قصبے میں کئی میلے ٹھیلے اس نے دیکھے۔ ہاٹ بازار بھی دیکھے تھے۔ مگر اس رونق کو کوئی نہیں پہنچتا تھا۔ اس کے سنگی ساتھی لپ چھپ کر بہرائچ کی نمائش دیکھ آئے تھے تو کیا کیا ہوا باندھتے تھے کہ اتنے لوگ دیکھے، اتنا مجمع دیکھا۔ کہیں دیکھ لیں نکھلو تو چھاتی پھٹ جائے۔ رستے بھر اس نے نئے نئے سودے دیکھے، نئی مٹھائیاں، نئے نئے تماشے، بانک بنوٹ والے بھی دیکھے، نٹ اور پہلوان بھی، ڈوم ڈھاڑی بھی اور بھانڈ کشمیری بھی۔

جھٹپٹا وقت ہونے لگا۔ دور افق میں سورج ڈوبا اور چراغ میں بتی پڑی کہ مرزا خیرو مخدوم کو لے کر ایک حویلی کے سامنے جا پہنچا۔ کئی کئی ڈیوڑھیاں اور غلام گردشیں طے کرتا ہوا جب مرزا خیرو ایک دالان میں پہنچا تو وہاں تختوں کا چوکا لگا تھا۔ جھاڑ فانوس روشن تھے۔ مردنگیں بجتا نے اور دو شاخے روشن تھے۔ اور دیوان جی مصاحبوں کے جھرمٹ میں بیٹھے تھے۔ داستانگو بیٹھا داستان کہتا تھا۔ افیم گھلتی تھی اور لوگ واہ واہ کے نعرے لگاتے تھے۔ اس ٹھاٹ باٹ کو دیکھ کر پہلے وہ دیوان جی ہی کو نواب چھبن صاحب سمجھ بیٹھا تھا لیکن دیوان جی تو نواب صاحب کے مختار تھے۔ مرزا خیرو نے جھک کر سلام کیا۔ پھر دیوان جی نے نگاہ اٹھا کر ایک ذرا مخدوم کو دیکھا، بولے "خیر تو ہے مرزا خیرو کیسے آنا ہوا؟"

"حضت یہ چھوکرا جرول سے بھاگ کر ادھر آنکلا تھا۔ میں نے سوچا چلو نواب صاحب کے اصطبل میں کھپ جائے گا تو اس کی زندگی بن جائے گی۔"

دیوان جی نے ناقدانہ نظروں سے مخدوم کو دیکھا۔ مخدوم سہم گیا۔ دیوان جی اسے نظروں ہی نظروں میں ٹٹول رہے تھے جیسے قصائی گائے کو دیکھتا ہے۔ پھر گردن ہلا کر بولے "میاں تم تو جانتے ہی ہو۔ اس سرکار میں بیسیوں کی پرورش ہوتی ہے لیکن ہر شخص کچھ نہ کچھ ہنر بھی جانتا ہے۔ کوئی کنکوا بنانے میں طاق ہے تو کوئی اڑانے میں۔ کوئی کبوتر بازی میں شہرۂ آفاق ہے تو کوئی مرغ بازی میں۔ کسی کو بٹیر بازی میں ملکہ حاصل ہے تو کسی کو شاعری میں ــــــ مگر یہ چھوکرا تو بالکل گاؤدی نظر آتا ہے۔ بھلا یہ کیا ہنر جانتا ہے"؟

مرزا خیرو نے کہا "دیوان جی یہ تو بس گھوڑوں کو کھریرا کر دیا کرے گا اور اصطبل میں پڑا رہے گا۔ اسے پیٹ بھر کی روٹی اور تن بھر کا کپڑا چاہیئے"۔

دیوان جی کے بولنے سے پہلے ہی ایک مصاحب بولے "ارے صاحب ذرا ٹھونک بجا کے سودا کیجیئے گا۔ بڑا موذی زمانہ آلگا ہے۔ ہر شئے ملمع، ہر شئے کھوٹی کہیں رہبر کے بھیس میں رہزن نہ ہو۔ ہزار چور اچکے، بد معاش لفنگے سوانگ بھر بھر کے خلق خدا کو لوٹتے پھرتے ہیں" ــــــ

دوسرے بولے "نا صاحب ہیں تو یہ لڑکا کوئی یتیم معلوم ہوتا ہے۔ ضرور اپنی سوتیلی ماں کی بدسلوکی سے بھاگا ہے کیوں رے لڑکے"؟

سوتیلی ماں کے نام پر مخدوم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کچھ رقیق القلب مصاحبین بھی رو پڑے پھر کیا تھا۔ اسی دم نوکری مل گئی پھٹی پرانی گدڑی بھی مل گئی۔ اسی میں لپٹ کر اصطبل سے ملحق کوٹھری میں جب وہ جا کر پڑا ہے تو پڑتے ہی بھوسہ ہو گیا۔ جب صبح کا گجر بجا، وردی بجی اور موذن نے اذان دی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ لالٹین لیئے ہوئے جب سائیس اصطبل میں داخل ہوا تو گھوڑے ہنہنانے لگے۔

مراد علی نواب جبین صاحب کے اصطبل کا نگراں تھا۔ اصطبل میں سا سے گھوڑے تھے اور ہر گھوڑے کے خواص الگ الگ تھے۔ کچھ گھوڑے ران سواری کے لئے تھے اور کچھ ٹم ٹم اور دوسری سواریوں کے لئے۔ مراد علی نے مخدوم کو ہر ہر گھوڑے کے بارے میں سمجھایا اور بتایا۔ ہر گھوڑے کی غذا بتائی اور اس کے مزاج کا حال اُس کے ذہن نشین کرایا۔ ران سواری کے گھوڑوں کی کاٹھیاں اور ساز سمجھائے۔ ہر گھوڑے کی چال بتائی۔ پدی کسے کہتے ہیں، دُلکی کیا ہوتی ہے، سرپٹ کیسی ہوتی ہے۔ ہوا خوری کے لئے کون کون سے گھوڑے موزوں ہیں۔ سیر اور شکار کے لئے کون کون سے، موسم بدلنے پر گھوڑوں کے لئے کیا کیا کرنا پڑتا ہے اور نواب صاحب کو کون کون سے گھوڑے زیادہ عزیز ہیں اور کس وقت کون سے گھوڑے پر سواری کرتے ہیں۔ کس پر ہوا خوری کو نکلتے ہیں اور کون سا سیر و شکار کے لئے استعمال میں آتا ہے۔ مہینوں تربیت حاصل کرنے کے بعد مخدوم کو اس بات کی ہمت ہوئی کہ وہ ایک صبح نواب صاحب کی ہوا خوری کو گھوڑا لے کر حویلی کے سامنے پہنچا۔ نواب صاحب خوب لمبے تڑنگے، دوہری ہڈی کے وجیہہ نوجوان آدمی تھے۔ انگریزی بزجبس میں سرخ و سپید رنگ پھوٹا نکلتا تھا۔ مضبوط چہرے کی ساخت پر سنہری چمکدار مونچھیں سو سو جوبن دکھاتی تھیں۔ ہاتھ میں چمڑے کا تازیانہ تھا جسے وہ اپنی پنڈلی پر بار بار پٹختے تھے۔ مخدوم پہلی نظر میں نواب صاحب کے جلال کا شیفتہ ہوگیا۔ جیسے ہی اُس نے گھوڑا پیش کیا۔ نواب صاحب نے مڑ کر مراد علی کو دیکھا۔ مراد علی نے سلام کیا اور مخدوم کو اشارہ کیا۔ مخدوم جھک کر آداب بجالایا۔

نواب بولے ''کون؟''

اور جھٹ مراد علی بولا ''حضور کا نمک خوار''

نواب نے پوچھا ''نام''

مخدوم نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''خانہ زاد کو مخدوم کہتے ہیں''

نواب مسکرائے۔ گھوڑے کی باگ اٹھائی اور یہ جا وہ جا۔ اس مسکراہٹ نے مخدوم پر جادو کر دیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کرشن کی من موہنی مسکراہٹ میں رادھا نے تن من دھن تج دیا تھا اس طرح نواب کی مسکراہٹ نے اسے خرید لیا۔ اس کی شب و روز کی محنت اور ریاضت ٹھکانے لگی۔ یہی مسکراہٹ اس کا انعام تھی۔ مراد علی نے فاتحانہ نظروں سے مخدوم کو دیکھا اور مخدوم کا جی چاہا کہ مراد علی کے پاؤں پکڑ لے جس کی تربیت نے اسے نواب سے سرخرو کیا۔ اس طرح متعارف ہونے کے بعد مخدوم اکثر صبح اور سہ پہر کے اوقات میں نواب کو گھوڑے پیش کرنے لگا اور اس کی جھجک ختم ہونے لگی۔ دیوان جی کے پیر بھی دبانے لگا اور ان کے مصاحبوں کے لئے حقے بھی بھرنے لگا۔ داستانیں سنتا تو کھو کے رہ جاتا اور طلسماتی محل جادو کے گھوڑے، خوبصورت شہزادیاں اس کے خوابوں میں آنے لگیں۔ رات گئے جب مخدوم اپنے حجرے میں قدم رکھتا تو نواب صاحب کے دیوان خانے سے رسولن بائی کے الاپنے کی آواز آتی:

مرلی والے شام

مرلی والے شام

اور دھیمی دھیمی موسیقی کی لے پر اس کی آنکھیں نیند کے بوجھ سے مندنے لگتیں۔

ایک روز رسولن بائی نے مخدوم کو تنہائی میں بلوایا۔ وہ سہما سہما اور ڈرا ڈرا جب پہنچا تو رسولن بائی نے اس کو چوکی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نواب صاحب علاقے پر گئے ہوئے تھے۔ محلسرا خالی تھی۔ چند ملازمین رہ گئے تھے۔ کسی کو کانوں کان اس کے یہاں آنے کی خبر نہیں ہوئی تھی اس پر بھی مخدوم کا مارے ڈر کے برا حال تھا۔ رسولن بائی پختہ عمر کی عورت تھی۔ ڈیل ڈول بھاری تھا۔ رنگت سانولی تھی۔ لیکن پاتے ہیں بوٹی سی گوندنی کی طرح امڈی پھندی تھی۔ چہرے پر بے فکری اور آسودگی تھی۔ سامنے پاندان دھرا تھا۔ اگالدان پاس رکھے تھے۔ آگے سٹک حقہ لگا ہوا تھا۔ اگالدان

بھی قرینے سے لگا تھا۔ ایک ملازمہ پیچھے کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی۔ باچھوں کی سرخی انگوٹھے اور درمیانی انگلی سے سمیٹتے ہوئے رسولن بائی بولی "بیٹھ جاؤ۔"

مخدوم بیٹھ گیا تو رسولن بولی "بیٹا تم تو جانتے ہو کہ لوگ ہمارے سائے سے بھاگتے ہیں۔ گو ہم گانے بجانے اور مجرے کے سوا کوئی پیشہ نہیں کرتے پھر بھی بدنام ہیں، کوئی منہ تک نہیں لگاتا۔"

مخدوم نے گردن ہلا کر کہا "جی"

رسولن بولی "تم سے کیا چھپانا، میری ایک بیٹی ہے۔ نانپارے میں اپنے ماموں کے ہاں رہتی ہے۔ وہ موذی اُسے اپنے پنجے میں دبوچے ہوئے ہے۔ نہ بچی یہاں آسکتی ہے نہ میں وہاں جا سکتی ہوں مگر میرا جی اسے دیکھنے کو تڑپتا ہے۔"

یہ کہہ کر رسولن رونے لگی۔ دوپٹے کے آنچل سے آنسو پاک کر کے بولی "نواب کی نوکر ہوں، اس سرکار کو خدا سلامت رکھے، سو رُپے ماہوار ملتا ہے اور عید محرم الگ انعام واکرام مل جاتا ہے۔ لگی لگائی روزی کو لات مارنا بھی تو کفرانِ نعمت ہے۔"

مخدوم بے وقوفوں کی طرح بولا "جی جی"

"تو میاں میرا ایک کام کر دو تو گویا مجھے بے دام خرید لو اور جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا ویسی تمہاری خدمت بھی کر دوں گی۔"

"جی"

رسولن بھرائی ہوئی آواز میں بولی "میں دامن پھیلا کر تم سے بھیک مانگتی ہوں، للّٰہ مجھے بے آس نہ کرنا۔"

"جی" مخدوم ہکا بکا رہ گیا۔

"مجھے میری بسم اللہ سے ملا دو۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ تمہیں دے دوں گی، اپنی ساری عمر کی

کمائی تمہاری نذر کردوں گی، تمہیں اپنی بسم اللہ بھی دیدوں گی۔"

"جی، جی، ہیں ـــــ ہیں۔"

"ہاں بیٹے تم بھی یہ کام کر سکتے ہو۔ میں نے سنا ہے کہ تم بہرائچ کی طرف کے رہنے والے ہو اور جو یہ کہو کہ یہ بڑھیا فریب کرتی ہے مکر کرتی ہے تو لاؤ قرآن پاک پہ لکھ دوں کہ زباں سے پھروں تو اللہ سمجھے۔ اور جو یہ کہو کہ نواب سے کیوں نہیں کہتی کہ بھیا تم تو جانتے ہو کہ نواب کو لڑکی کی بھنک بھی مل جائے تو قدری ہو جائے پھر وہ اس کی نتھ اتارے بغیر نہیں رہ سکتے اور میں مولا مشکلکشا علیؑ اور عباس علمبردار کو گواہ کرتی ہوں کہ بسم اللہ کو شریف بہو بیٹی کی طرح رکھنا چاہتی ہوں اور بھیا اگر تم اس نیک کام کے لئے تیار ہو گئے تو میری پیٹھ قبر سے لگ جائے گی۔"

جب رسولن بائی سب کچھ کہہ چکی تو دیر تک مخدوم کا منہ تکتی رہی کہ اب وہ کچھ کہے مگر مخدوم کو کچھ بن نہ پڑا، کام اتنا خطرناک تھا کہ اس کے ہوش وحواس بھی بجا نہیں تھے۔

رسولن پھر بولی "تمہیں زیادہ زحمت نہیں ہوگی یہ عورت۔" اس نے پنکھا جھلنے والی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ عوت اسے تمہارے پاس لے آئے گی۔ تم ریل گاڑی پر بٹھا کر لئے چلے آنا۔"

اور مخدوم سکتے کے عالم میں آگیا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ نواب صاحب کے دیوان خانے میں وہاں بیٹھا ہوا تھا جہاں نواب کی موجودگی میں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ رسولن مضطرب تھی، جلدی جواب چاہتی تھی، بولی "پھر کیا منظور ہے؟"

اور مخدوم بہزار سعی صرف یہ کہہ سکا کہ "میں سوچوں گا۔" اور پھر وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔
شام کو جب وہ اپنے حجرے میں لیٹ کر اس مقدمے پر غور کرنے لگا تو اس کی ہمت نے جواب دے دیا۔ دوسری طرف دولت سے کھیلنے کا خواب اسے شرمندۂ تعبیر ہوتا معلوم ہو رہا تھا

لیکن اس میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ اتنے بڑے معرکے کو سر کرلیتا۔

کچھ روز تک رسولن بائی کی آواز بار بار اس کے کانوں میں گونجتی رہی اور اسے ایک نئی زندگی کی دعوت بھی دیتی رہی۔ بسم اللہ کا ہوش ربا تصور بھی اس کی جان سے چمٹا رہا لیکن نواب صاحب جیسے ہی علاقے سے واپس آئے روزانہ کے معمولات نے اس کے تصورات کو اس طرح تھپک تھپک کر سلا دیا جیسے یہ تصورات کبھی تھے ہی نہیں۔

نواب صاحب نے مخدوم کو اپنا مقرب بھی مقرر کر لیا تھا۔ ایک رات وہ گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا کہ اچانک اس کو کسی نے جگایا۔ حکم ملا۔ نواب صاحب دیوان خانے میں بلاتے ہیں، چادر لپیٹ لپاٹ، آنکھیں ملتا ہوا جب وہ دیوان خانے پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ عجب جشن ہو رہے ہیں۔ بارہ دری جھاڑ، کنول اور مردنگوں کی روشنیوں میں بقعۂ نور بنی ہوئی ہے۔ تختوں کے چوکے پر گاؤ تکیے اور مسندیں لگی ہیں۔ نواب کے احباب جمع ہیں، رنڈیوں کے طائفے حاضر ہیں، سازندے ساز بجاتے ہیں۔ رنڈیاں آ آ کر بصد ناز و انداز مجرے کرتی ہیں، بیل پڑتی ہے۔ جھک جھک کے سلام کرتی ہیں اور اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتی ہیں۔ نواب ہیں کہ جام پہ جام چڑھائے جاتے ہیں اور مٹھی بھر بھر کے روپے لٹاتے جاتے ہیں۔ رسولن بائی کو کبھی بھجن گانا پڑتا ہے اور کبھی بھیرویں الاپنا پڑتی ہے۔ مقصودن کو کبھی کتھک نچایا جاتا ہے کبھی خیال، ساری محفل عجب بے ہنگم اور بے تکان تھی۔ مخدوم کو دیکھتے ہی دیوان جی ایک کونے میں لے گئے اور کان میں ایک بات کہی جسے سنتے ہی مخدوم الٹے پیروں اصطبل واپس آیا۔ گھوڑا نکالا، ساز کسا، سڑک پر آ، رات کی تاریکی میں اللہ کا نام لے کر ایک سمت کو چل پڑا۔ جاڑے کی یخ بستہ رات کہ جگر تک ٹھٹھرتا تھا، اور ایسا سناٹا کہ ہو مارتا تھا اور مخدوم گھوڑے پر اڑا چلا جاتا تھا۔ ایک سنسان سے میدان میں ایک جگہ ایک چراغ جلتا تھا اور ایک لکڑی کی ٹوٹی پھوٹی دوکان میں ایک بوڑھا بیٹھا

اونگھتا تھا۔ مخدوم نے پہنچتے ہی کہا" دیوان جی نے سلام کہا ہے"۔

اور بوڑھے نے جواباً اس کی طرف دیکھا، کچھ سوچ کر ٹھٹھکا، پھر بولا "مرزا بانکے کہاں ہیں؟"

"علاقہ پر" اور پھر معاً کچھ سوچ کر بولا" نواب صاحب رتجگا منا رہے ہیں"۔

بوڑھے نے توبڑے سے چار بوتلیں نکال کر اس کے حوالے کیں، بولا" رتجگے منائیں، سجائیں رچائیں، اندر بن جائیں، پریاں نچائیں، دولت لٹائیں، ہم کون؟ ہم تو کہتے ہیں میاں کہ یہ سرکار بنی رہے اور ہم کو روٹی ملتی رہے"۔

مخدوم نے بوتلیں تھیلے میں ڈالیں اور سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا چشم زدن میں واپس آگیا۔ آیا تو دیکھا دیوان جی کھڑے راہ دیکھتے تھے اور نواب صاحب ہنکارتے تھے" دیوان جی! دیوان جی!"

دیوان جی بھاگے ہوئے پہنچے" جی سرکار"۔

"اب تو جام صبوحی کا وقت آگیا حلق میں کانٹا پڑا جاتا ہے اور تم ہو کہ تم نے اس لال پری کو سات کنوؤں میں چھپا کے رکھا ہے۔ ہائے ظالم! یہی تو وہ آتش سیال ہے جو رگوں میں بجلیاں دوڑاتی ہے"۔

ایک مصاحب نے جام بھرا چسکی لی اور لہک کر بولا" قبلہ آپ کس زاہد خشک کے منہ لگتے ہیں"۔

ایک شوخ سی رنڈی نے دیوان جی کو آنکھ ماری اور بولی" حضور ان زاہدوں کے دل کا حال کچھ ہمیں جانتے ہیں"۔

محفل ایک قہقہہ زار بن گئی۔ دیوان جی نے اپنی خشخشی داڑھی پہ ہاتھ پھیرا اور جھینپ کر الگ جا کھڑے ہوئے۔ دوسرے مصاحب بولے" واللہ مزہ آگیا۔ آہا ہا! بھئی حافظ شیرازی نے

بھی خوب کہا ہے۔

من حالِ دلِ زاہد با خلق نخواہم گفت   دیں قصہ اگر گویم با چنگ و رباب اولیٰ

ابھی شعر ختم ہی ہوا ہوگا کہ چنگ و رباب پھر حرکت میں آ گئے۔ رسولن بائی گا رہی تھیں:

ایں خرقہ کہ من دارم در رہنِ شراب اولیٰ   دیں دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ

من حال.......... الخ

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو

(یہ مصرع پھر دیوان جی کی طرف اشارہ کر کے پڑھا گیا)

رندی و ہوسناکی در عہدِ شباب اولیٰ

اور پھر ہاہا واہ واہ کے نعرے بلند ہونے لگے کہ اچانک صبح کی وردی بجنا شروع ہوئی، موذن نے اذان دی۔ مخدوم نے دیکھا نواب کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ محفل میں سناٹا چھا گیا۔ دیوان جی جل جلالہ، جل شانہ کا ورد کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔ جب مخدوم اور نواب کے سوا کوئی نہ رہ گیا موذن کی آواز لا الہ الا اللہ کہتی ہوئی فضا کی خاموشیوں میں تحلیل ہونے لگی تو نواب دھڑ سے سجدے میں گر کر گڑگڑا گڑگڑا کر استغفر اللہ ربی من کل ذنبٍ و اتوب الیہ، استغفر اللہ ربی من کل ذنبٍ و اتوب الیہ کے جاں گداز نعرے مارنے لگے۔ مخدوم وہاں سے چپ چاپ ہٹ آیا اور اپنے حجرے میں آ کر نہایت خضوع و خشوع سے نماز فجر ادا کرنے لگا۔

اسی زمانے میں یکایک محلسرا میں ایک بڑی بھاری تبدیلی ہوئی۔ نواب چھمن صاحب کی شادی شہر کے سب سے بڑے رئیس نواب پٹن صاحب کی صاحبزادی سے بڑے دھوم دھڑکے سے ہوئی اور انھوں نے ہاتھی گھوڑے پالکی نالکی کے سوا چھکڑے بھر بھر کے اپنی لڑکی کو جہیز

اور ہیرے جواہرات سے نواب صاحب کا گھر پاٹ دیا۔ پارات میں رُپے اشرفیوں کی تھیلیاں لٹوا دیں۔ نوکروں، چاکروں، غلاموں، کنیزوں کے علاوہ کئی تعلقے بھی دیے لیکن نواب دولت کی ریل پیل پر بھی ذرا نہ پسیجے۔ مزا یہ کہ دلہن کا گھونگھٹ اٹھا کر جو انھوں نے منہ لبسورا تو کئی دن تک اٹواٹی کھٹواٹی لئے پڑے رہے۔ ماں باپ، بہن بھائی، دوست احباب، مصاحب خواص ہزار ہزار جتن کر تھکے کسی کی ایک پیش نہ گئی۔ آخر شدہ شدہ یہ خبر چوک کے بالاخانوں تک پہنچ گئی۔ پھر کیا تھا۔ وہاں تو ایک سے ایک زہرہ جبیں نواب کے نام پر جان چھڑکتی تھی۔ ہونے لگیں تدبیریں ایک سے ایک شہر کے چھٹے ہوئے کٹنے بہانے بُتوں سے ملنے لگے نواب صاحب سے اور لگے اپنے اپنے حربے آزمانے، مگر واہ رے نواب کہ ہر وار اور ہر حملے کی خوب خوب کاٹ کی۔ ایک دن کیا ہوا کہ اپنے سبزے گھوڑے پر نواب بانکی چیتونوں اور پیاری اداؤں کے ساتھ چوک سے گذر تے تھے اور خلق خدا تماشہ دیکھتی تھی کہ ایک بالاخانے پر ایک نازنین مہرجبیں بصد تمکین سوگوار لباس پہنے کھڑی تھی۔ اس کی ادا میں ایسی فراغت تھی کہ نواب ٹھٹھک کر رہ گئے۔ گھوڑے سے کود دنادن زینہ چڑھتے ہوئے اوپر جا پہنچے۔ لوگ پیشوائی کو دوڑے آئے۔ عورتیں صدقے واری گئیں۔ قدموں پر رُپے نچھاور کئے گئے۔ نواب کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا مسند اور گاؤ تکیے پیش ہوئے، مجرے ہوئے، سلامیاں ہوئیں مگر نواب خاصدان سے ایک گلوری کھا، اشرفی کا ایک توڑا پھینک دل برداشتہ سے واپس چلے آئے ـــــ جو نازنین ان کو نظر آئی تھی جب وہی ندارد تھی تو دل کی کلی کیوں کر کھلتی۔ اب کیا تھا، نواب روز اُس نازنین کے فراق میں جاتے۔ پہلے تو وہ نظر آتی جب اندر پہنچتے تو غائب ہو جاتی۔ نواب نے بھی ہزارہا اشرفی لٹا دی اور آنکھ پر ذرا میں نہ آیا ادھر سارے شہر کی زبان پر یہی افسانہ تھا۔ ہر محفل، ہر صحبت میں یہی ذکر۔ محلسرا کے اندر اور باہر ایک واویلا مچی ہوئی۔ نواب روز شام کو گھر آتے خاصہ تناول کر کے اب جو باہر دیوان خانے میں

اڈوانی گھٹوا ڑی لے کر پڑتے تو بس صبح ہی کی خبر لاتے۔ صبح کی ہوا خوری بھی موقوف اور سیر و سیاحت بھی۔ دوست احباب سیر و شکار پر لے جانے کو کہتے۔ مشاعروں میں چلنے کی ترغیب دیتے۔ نئی نئی رنڈیوں کا ذکر کرتے لیکن نواب نے بس اپنی جان کو روگ لگا لیا تھا۔۔۔۔ رسولن بائی کے بھجن اور ٹھمریاں سن سن کر نواب کو وجد آتا تھا۔ اب رسولن کا مجرا بھی پڑا زنگ کھاتا تھا۔ بی مقصودن نے کئی بار رقص کی پیش کش کی۔ نواب نے قبول نہیں کی۔

ایک رات نواب چھپر کھٹ پر پڑے سر میں پٹی باندھے ہائے ہائے کرتے تھے کہ مخدوم کسی کام سے ادھر گیا۔ خود بخود اس کے قدم بارہ دری کی طرف اٹھ گئے۔ چپ چاپ نواب کے پائینتی جا کھڑا ہوا۔ نواب کروٹیں بدلتے تھے اور اُف اُف کے نعرے مارتے تھے، مخدوم پر جو نظر پڑی تو دیکھا وہ زار و قطار رو رہا ہے۔ بولے "کیوں بھئی تجھے کیا ہوا؟"

اور مخدوم بولا "کچھ نہیں سرکار آپ کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔"

نواب نے دوسری کروٹ بدلی۔ اُف کا نعرہ مارا اور پہلو دبا کر بولے "ہاں بھئی تو نمک حلال نوکر ہے۔ کیوں نہ ہو، پھر کچھ دیر چپ رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولے "ایک ذرا سر تو دبا دے۔"

اور مخدوم چپ چاپ سر دبانے لگا۔ پھر خود بخود بولا۔ "سرکار اس کا علاج نہیں ہے؟"

نواب چپکے رہے۔ کچھ دیر سوچتے رہے، پھر سرگوشی کے انداز میں بولے۔ مخدوم میرا ایک کام کر دے گا؟"

مخدوم بولا "سرکار کام کیسا جان بھی حاضر ہے۔"

"تو کل میرا سبزہ گھوڑا دریا پر رات کے آٹھ بجے لے کر آ جانا مگر دیکھ کسی کو پتہ نہ چلے۔"

"کیا مجال سرکار"

وہاں میں ٹھیک آٹھ بجے پہنچوں گا۔ سبزے پر بیٹھ کر چلا جاؤں گا اور لال گھوڑا چھوڑ جاؤں گا۔

جو کچھ میرے ساتھ دیکھنا کسی سے نہ کہنا۔"

"بہت اچھا سرکار۔"

وہ رات مخدوم کے لئے عذاب بن گئی۔ کاٹے نہیں کٹتی تھی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو شام پکڑنی دشوار ہو گئی۔ سات بجے مخدوم نے گھوڑا کسا اور یہ جا وہ جا۔

دریا والی سڑک پر ٹھیک آٹھ بجے سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا کوئی آیا۔ نکڑ پر گھوڑا رکا۔ آواز آئی "مخدوم"

مخدوم بولا "جی سرکار گھوڑا حاضر ہے۔" مخدوم نے دیکھا کہ ایک خوبصورت نوجوان عورت گھوڑے پر آگے بیٹھی ہے۔ نواب نے گھوڑا بدلا۔ عورت کو آگے بٹھایا۔ ایک اشرفی مخدوم کے ہاتھ پہ رکھی اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ اس کے بعد تو شہر میں اودھم مچ گیا کہ نواب چھبن صاحب نے چوک سے فلاں فلاں عورت کو یوں اڑا لیا۔ ہر محفل، ہر صحبت میں یہی چرچا، ہر طرف یہی ذکر، نواب چھبن صاحب ایک ہفتے تک تو مفقود الخبر رہے مگر ایک رات ٹھیک ٹھاک بارہ بجے کسی نے مخدوم کا پھیر بلایا۔ اب جو اس نے دیکھا نواب کھڑے ہیں۔ منہ پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کو کہا۔ مخدوم نے نواب کے پاؤں پکڑ لئے۔ نواب نے کہا کہ محب اللہ پور میں فلاں فلاں باغ میں پڑاؤ ہے، وہاں آجایا کر اور پھر سبزہ گھوڑا باندھ کر لال گھوڑے پر بیٹھ یہ جا وہ جا۔

اب جو صبح ہوئی تو ہر ایک حیران پریشان، گھوڑا بدلنے کا واقعہ ہر ایک کی زبان پر۔ مخدوم سے سب پوچھیں تو وہ صاف مکر جائے۔ لوگوں نے اسے لالچ بھی دیئے۔ دھمکیاں بھی دیں لیکن اس نے "نہیں" سے "ہاں" نہیں کی۔ اپنی نہیں پر اڑا رہا۔ آخر لوگ تھک ہار کر بیٹھ رہے کہ ایک روز شام ہوتے ہی مخدوم گھوڑا لے محب اللہ پور چل دیا اور پتہ لگاتے لگاتے نواب کے پاس پہنچ ہی گیا۔ دیکھا تو آموں کے باغ میں بیچوں بیچ ایک سپید بارہ دری ہے کہ جھما جھم چمکتی ہے چاندنی میں اور آموں کے بور

سے باغ پڑا مہکتا ہے۔ دروازے پر پہنچ کر مخدوم نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر کے بعد نواب چھبن صاحب برآمد ہوئے۔ آتے ہی مخدوم کو چھاتی سے چمٹا لیا اور بولے "تو نے حق نمک ادا کر دیا۔"

مخدوم بولا "سرکار گھوڑا بدلنے سے سارے لوگ چوکنا ہو گئے ہیں اور میرے اوپر شک کرتے ہیں۔"

لیکن آج نواب کے تیور تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ پھر کر نواب نے کہا "کوئی بات نہیں ہم نے جو کچھ کیا ڈنکے کی چوٹ پر کیا جس کو مقابلہ کرنا ہو یہاں آ جائے ——— ہم ہر ایک سے نپٹ لیں گے۔"

مخدوم واپس آ گیا تو اس نے بھی بڑی دلیری سے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ لیکن اندر بیگم صاحبہ کو جو اس کی اطلاع پہنچی تو جھٹ دیوان جی کے ہاتھوں کچھ اشرفیاں دے کر چوک کی مشہور نائیکہ کو بلوایا اور چپکے چپکے سارا معاملہ تلپٹ کرا دیا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حالات دھیرے دھیرے معمول پر آ گئے۔ نواب زنان خانے میں بھی آنے جانے لگے۔ مجرے بھی سننے لگے اور "صاحب جان" کے لئے مکان بھی الگ لے لیا گیا۔ مخدوم اس مکان کا داروغہ مقرر ہو گیا۔ جب نواب زنان خانے میں رہتے تو مخدوم ڈیوڑھی میں پلنگ بچھا کر لیٹتا اور رات رات بھر حقے پیتا رہتا اور کھنکھارتا اور گانے گاتا یا خرّاٹے لے لے کر سوتا رہتا۔

صاحب جان چھریرے بدن کی نازک کامنی سی عورت تھی۔ سونے کی طرح پکّا پیلا رنگ، کتابی چہرہ، کھڑا کھڑا ناک نقشہ، بڑی بڑی آنکھیں، خوب لمبے گھنے بال، کالا لباس تو اس پر قیامت ڈھاتا تھا۔ ایسی سوگ میں ڈوبی ہوئی تصویر بن جاتی جیسے جوگن۔ مخدوم نے اکثر کنکھیوں سے صاحب جان کو دیکھا لیکن اس کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سوچا تھا۔ سوچنے کے تصور ہی سے اس کے اعصاب پر رعشہ طاری ہوتا تھا۔

نواب چھبن صاحب پہلے تو ہفتے میں دو چار بار صاحب جان کے پاس ضرور آتے لیکن

رفتہ رفتہ ہفتے مہینے میں بدل گئے اور اس کے دیکھتے دیکھتے مہینے سال کی مسافت طے کرنے لگے اور پھر اسی زمانے میں سنا گیا کہ نواب نے دوسری رنڈی بٹھالی۔ صاحب جان بھی عجب اللہ کی بندی تھی کہ نہ تو زبان سے اُف کرتی تھی اور نہ نواب سے شکوے شکایت کرتی تھی۔

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اسی زمانے میں نواب کو انگریز سرکار سے کئی کروڑ روپیہ ہاتھ لگا۔ کہتے ہیں کہ نواب کے آبا و اجداد سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے کوئی قرضہ لیا تھا۔ یہ اس کی ادائیگی تھی۔ روپے پیسے کی آگے ہی گھر میں ریل پیل تھی۔ اب جو نواب چھبن صاحب کو اس قدر روپیہ ملا تو بولا گئے اور رنگے اور بھی الٹے تللے کرنے۔ خوب خوب انگریزوں اور میموں کی دعوتیں کیں، شکار کھلوائے، شرابیں لنڈھائیں رنڈیوں پر پیسہ بہایا، جوئے کھیلے اور کھلوائے اور جب پھر بھی روپیہ ختم نہ ہوا تو ایک دن ایک نئی رنڈی پر رعب گانٹھنے کے لیے سارے سو سو کے نوٹ آگ کی انگیٹھی میں جھونک دیے اور یوں جب لاکھ کا گھر خاک ہو گیا اور نواب ککھ ہو گئے تو تھوڑے ہی عرصے میں دھیرے دھیرے نواب کے لواحقین علیحدہ ہونا شروع ہوئے اور جب صوبے کے گورنر کو اس ایسے کی خبر ہوئی تو ایک پارٹی میں وہ نواب کے پاس آیا اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا" ول نواب۔ اب ہم ٹم کو نواب سن دس دسنٹہ کہے گا"

گورنر نے جانے کس بھلی ساعت سے کہا تھا کہ فقرہ بھی ہونٹوں نکلا کوٹھوں پہنچا اور کچھ اس طرح سارے شہر میں رُلنا پھرا جیسے کھرا سکہ جو ٹکسال سے نکلتا ہے۔ لوگ انھیں نواب سنٹہ ہی پکارنے لگے اور دیکھتے دیکھتے لوگ چھبن صاحب بھول ہی گئے۔ بچے بچے کی زبان پر نواب سن دس نواب سن دس چڑھ گیا۔

اب باقاعدہ انحطاط کا زمانہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے مصاحبین اور دیوان جی نے گھر سے بوریا بستر باندھا۔ پھر زنان خانے سے مغلانیاں، استانیاں، خواصیں اور پیش خدمتیں بھرا مار کر یوں اڑیں جیسے مرغابیاں سوکھا تال چھوڑتی ہیں اور سال دو سال میں تو اندر باہر ملا کر چھ آدمیوں سے

زیادہ نہ تھے، جن میں نواب کی بیگم، رسولن، صاحب جان اور مخدوم بھی شامل تھے۔ جیسے موسم خزاں میں درخت لنڈا منڈا ہو جاتا ہے۔ اس طرح نواب سن دس پر خزاں آئی، نہ کوئی پتہ، نہ کوئی کونپل نہ کوئی پھول، نہ کوئی پھل، جائداد بکنا شروع ہوئی، باغ بغیچے بکے، علاقہ بکا، مکانات بکے حتیٰ کہ گھر کی سواریاں بکیں، سونے چاندی کے ظروف اور زیورات بھی بکنے لگے، ایسے وقت میں تو سایہ بھی جدا ہو جاتا ہے لیکن رسولن بائی، مخدوم اور صاحب جان نواب کے سایہ کی طرح ساتھ ساتھ رہے ایک دن رسولن بائی کے جی میں بیٹھے بٹھائے جانے کیا آئی کہ نواب سے بسم کا ذکر کر ہی بیٹھیں۔ نواب نے کچھ اوپری دل سے بسم اللہ کو بلانے کی اجازت دیدی۔ بسم اللہ کو مخدوم جا کر اسی عورت کے ساتھ بڑی ہوشیاری اور کمال حفاظت کے ساتھ اغوا کر لایا۔ دیکھا تو واقعی بڑی چٹاخ، تیز طرار اور کراری عورت تھی۔ رسولن بائی نے اس کی یہ اٹھان دیکھی تو جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی جی میں ٹھان لی۔ مخدوم جیسا حکم کا غلام تو موجود ہی تھا۔ نکاح کا بند و بست ہونے لگا۔ بڑے بڑے قیل و قال ہوئے کہ اچانک نکاح سے چند روز قبل ایک صبح کیا دیکھا کہ نواب صاحب بھی غائب اور بسم اللہ بھی ندارد۔ اب کیا تھا بی رسولن رو پیٹ کر ہلکے دا ویلا مچا کر چپکی ہو کر بیٹھ رہیں۔ مخدوم کی بھلا کیا مجال تھی کہ وہ ذرا بھی دم مار سکے۔ بس دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ رسولن بائی مخدوم سے یوں چمٹ چمٹ کر روئی جیسے اپنی اکلوتی بچی کی جوان مرگی پر رو رہی ہو۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ رسولن بائی کی عمر بھر کی کمائی بی بسم اللہ لے اڑی ہیں اور اپنی بیگم کے کل زیورات نواب صاحب لے کر چمپت ہوئے۔ خالی درخت پہ تو پرندے بھی بسیرا نہیں کرتے۔ جب سارے پرندے اڑ گئے تو رسولن بائی نے مخدوم سے کہا کہ میاں اب کیا کہتے ہو، مخدوم نے بے چون و چرا رسولن کے حکم کے بموجب بمبئی جانا طے کر لیا اور بالآخر ایک روز تاریک دن کی چھاؤں میں بگھی بلائی گئی۔ کچھ سامان لدا، رسولن آ کر بگھی میں بیٹھی تو میاں مخدوم اپنی سرکار کو سلام کر کے رخصت

ہوئے۔ دوسرے دروازے کی آڑ سے جیسے ہی نکلے کہ برقعے میں لپٹی لپٹائی گٹھری بغل میں دبائے دبے پیروں ایک اور عورت نکلی اور نکلتے ہی مخدوم کا دامن پکڑ کر مچل گئی کہ" اب مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں جارہے ہو؟"

"تم!"

اور صاحب جان نے نقاب اُلٹ دی" ہاں میں"

"مگر تم تو نواب صاحب کی امانت ہو"

"لیکن اب اس امانت کی حفاظت کون کرے گا؟"

مخدوم لاجواب ہوگیا اور بہت سٹپٹایا مگر اس کے پاس وقت کم تھا گاڑی چھوٹ جاتی اس لئے اس نے عورت کو بگھی میں بیٹھ جانے دیا۔ جب بگھی چار باغ اسٹیشن پر جاکر رُکی تو بوڑھے بگھی والے کو پیسے دیتے وقت مخدوم ٹھٹھکا" مرزا.........خیرو!"

"جی سرکار..... مگر معاف کیجئے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں"

مخدوم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا" میاں ہمیں اب تم کیا پہچانو گے ——— ہم تو آج بھی تمہارے بار احسان سے سر نہیں اٹھا سکتے۔ بھائی میں ہوں مخدوم"

"مخدوم!" مرزا خیرو چلایا" بھئی اللہ مبارک کرے، مگر میاں یہ تو بتاؤ کہ یہ نواب سن دس کو کیا سوجھی تھی کہ گھر پھونک تماشہ دیکھ ڈالا —— ہائے ہائے کیا تباہی آئی ہے۔ سچ ہے میاں جہاں اللہ دولت دیتا ہے عقل بھی سلب کرلیتا ہے، خیر بھائی خوش رہو ——— مرزا خیرو دعائیں دیتا ہوا ایک طرف کو چل دیا اور مخدوم اسٹیشن کی طرف لپکا۔ گاڑی تیار ہی کھڑی تھی۔

ڈبویا مجھ کو....

میں اس ہجوم سے بھاگا، سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگا، مڑ کر بھی پیچھے نہ دیکھا کہ مبادا پتھر کا نہ بن جاؤں مگر ہونی کو کون روک سکتا ہے، آنکھیں بند کر کے اب جو بگٹٹ بھاگتا ہوں تو سمندر میں در آیا، اور اب جو پانی کی چادریں کی چادریں اُٹھ کر حملہ آور ہوئیں تو یوں لگا کہ زمین تلوؤں کے نیچے ہی نیچے سے کھسک رہی ہے۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں تو خود کو بیچوں بیچ سمندر میں پایا۔ ہر طرف پانی ہی پانی اور اونچی اونچی بڑی بڑی تند و تیز لہروں کی یلغار میں خود کو گھرا ہوا دیکھا۔ ذرا پنجوں کو زمین میں گڑو دیا تو محسوس ہوا کہ میں پاتال میں دھنستا جا رہا ہوں۔ گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا تو سر آسمان سے ٹکرا رہا تھا۔ میں پتھر کا بن چکا تھا اور کسی مینار کے مانند ساکت ہو چکا تھا بلکہ منجمد ہو گیا تھا۔

تو اس طرح میں پتھر کا بن گیا۔ پاؤں میرے پاتال میں۔ سر میرا آسمان میں۔ مشرق و مغرب میرے آگے اور پیچھے۔ شمال و جنوب میرے اہلو بہلو اور زمان و مکان میری مٹھی میں اور سر تھا کہ

مسلسل برقی رو سے چمک رہا تھا کرنیں اس سے یوں پھوٹ رہی تھیں کہ جیسے سینکڑوں سورج چمک رہے ہوں ۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں اور پوچھا" اے میرے معبود! یہ میں ہوں کہ میرے وجود کو ہر طرف سے جکڑ کر رکھ دیا گیا ہے ، زمان و مکان کے شکنجے میں کس دیا گیا ہے اور وقت کہ ہمیشہ مجھ سے گریزاں تھا۔ میری مٹھی میں دے دیا گیا ہے اور سر کہ جملہ احساسات کا مرکز ہے ہزار ہا نظام شمسی کا مرکز بنا دیا گیا ہے "۔

جواب ملا" ہاں یہ تو ہے کہ تو اشرف ہے اور ممتاز ہے تمام مخلوق میں اور احسن تقویم ہے کل کائنات میں اور نائب ہے ہمارا اس زمین پر جو آسمان کے نیچے واقع ہے اور سمندروں سے محیط ہے اور امین ہے جملہ علوم کا جو ہم نے پیدا کئے "

میں نے کہا" لیکن زمین سے میرے قدم نکل گئے اور سمندر نے مجھے جکڑ لیا اور آسمان ہے کہ میرے وجود پر اوندھا ہوا ہے اور سر کہ علوم کا منبع تھا تیز و تند روشنیوں کے ہجوم میں سلگ رہا ہے جل رہا ہے اور بھیجا میرا پگھلا جا رہا ہے ۔

جواب ملا" یہی تو روشنی طبع ہے ـــــ یہی تو تیری عقل ہے جو اس محیط عالم میں ہر شے کو مسخر کر رہی ہے "

میں نے کہا" یہ ہجوم جو میرا پیچھا کر رہا تھا اور شور مچا رہا تھا اور نعرے لگا رہا تھا ، کہاں غائب ہو گیا ؟ مجھے نظر نہیں آتا نہ آواز کان میں آتی ہے "

جواب ملا" اب تو اُن سے بالاتر ہے کہ وہ سب کے سب تیرے سامنے بالشتیے تھے ۔ نگاہ ان کی محدود عقل ان کی وقت کے گرداب میں پھنسی ہوئی ۔ آواز ان کی زمانے کے جال میں اُلجھی ہوئی تھی ۔ انھیں وقت نے نگل لیا اور تو نے وقت کو مسخر کر لیا اور تو امر بن گیا "

میں نے کہا" اور یہ جو جانب مشرق مجھے گھٹا ٹوپ اندھیرا نظر آ رہا ہے ۔ مغرب میں عین میری

پشت پر واقع ہے اور میں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکتا۔ کچھ روشنی سی ہو رہی ہے۔ اس میں کیا رمز ہے"۔

جواب ملا: "ہم نے تجھے سب کچھ بتا دیا اور ہر شے میں تیرے لئے واضح اشارے رکھ دیئے کہ تو پہچان لے"۔

میں نے کہا: "اے اللہ میں پہچان گیا — میں نے جان لیا۔ لیکن جو کچھ میں نے جان لیا کیا وہ ہر ایک پر روشن ہے؟"

جواب ملا: "ہر ایک پر روشن ہے لیکن وہ کہ جنھوں نے ہمارے واضح اشاروں کو نظر انداز کیا ہمارے غضب کا شکار رہیں گے اور دردناک عذاب کی انھیں کے لئے بشارت ہے"۔

میں نے کہا: "اے اللہ یہ جو سیاہ رنگ کی سیال چادریں بڑی سرعت سے گزر رہی ہیں میرے آگے میرے پیچھے میرے اطراف پہلو کہیں وقت تو نہیں، قرن اور صدیاں تو نہیں؟"

جواب ملا: "بے شک تو نے صحیح پہچانا لیکن تو اُن سے ماورا ہے"۔

میں نے کہا: "کیا کسی قرن، اور صدی کو مٹھی میں تھام کر میں مشاہدہ کر سکتا ہوں"۔

جواب ملا: "اب اس کی کیا ضرورت ہے۔ کیا یاد نہیں تجھے کہ ہم نے تیرے پیکر میں جب روح پھونکی اور فرشتوں سے تجھے سجدہ کرایا اور فرشتوں کے سرغنہ نے انکار کیا اور آدم سے لے کر تیرے وجود تک دنیا کی گردش پر لیل و نہار کے طلسم کو قائم کیا اور پھر قرنوں، اور زمانوں کے انبوہ میں نسل انسانی کو سفر کرایا وہ کس قدر قلیل و مختصر تھا"۔

میں نے کہا: "زندگی میں تو ایک ایک لمحہ پہاڑ معلوم ہوتا تھا اور اب تو چشم زدن کا سا وقفہ محسوس ہوتا ہے۔ ازل تا ابد کا فاصلہ"۔

جواب ملا: "بے شک اس وقت، وقت تجھ سے گریزاں تھا اور اب تو نے وقت کو مسخر کر لیا ہے اور ہم نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے تو قرنوں کو مٹھی میں لے کر جو چاہے حکم دے سکتا ہے"۔

میں نے کہا: "کیا مضائقہ ہے یہاں میں تنہا ہوں اور اپنی ذات میں اکیلا ہوں۔ سر میرا آسمان میں پاؤں میرے پاتال میں آگے پیچھے میرے مشرق و مغرب اہلو پہلو میرے شمال و جنوب اور سرہے کہ روشنئ طبع سے ....."

جواب ملا: "اگرچہ تجھے اختیار ہے کہ جو چاہے کر کہ ہمارا وعدہ تھا مگر دنیائے زشت سے تیرا جی سیر نہیں ہوا؟"

میں نے اتنا ہی غنیمت جانا جھٹ اپنا ہاتھ بلند کیا اڑتے ہوئے سیاہ سیاہ دھوئیں کی چادر پر ہاتھ مارا مٹھی میں بھر کر کہا "اے قرن تھم جا" اور مٹھی کھول کر کیا دیکھتا ہوں کہ سیاہی رفتہ رفتہ چھٹتی جارہی ہے اور کچھ نقطے ہیں کہ ابھر رہے ہیں اور مقدس بوڑھا ہے کہ پیشانی سے اس کی نور ہویدا ہے بیٹھا لق و دق کشتی بنا رہا ہے۔ لوگوں کا ہجوم ہے کہ اس کے آس پاس سے گزر رہا ہے اس پر ہنس رہا ہے استہزا کر رہا ہے لیکن بوڑھا کشتی بنانے میں محو ہے کہ ناگاہ پانی اسے چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔ لوگ ڈوبنا شروع ہوتے ہیں۔ بوڑھے نے چند لوگوں کو کشتی میں بٹھا لیا۔ سامان رکھ لیا۔ کشتی میں حرکت ہونے لگی۔ بوڑھا پریشان سے گھبرا گھبرا کر اپنے بیٹے کو آوازیں دے رہا ہے اور بیٹا ہے کہ پہاڑ پر چڑھتا چلا جا رہا ہے۔ بوڑھا مایوسی سے آسمان کی طرف دیکھتا ہے جہاں سے بجلی کوندتی ہے۔ بوڑھا کشتی ہی پر سر بسجود ہو جاتا ہے ـــــ بس بس اتنا ہی کافی ہے۔ میں نے مٹھی کھول دی اور قرن مٹھی سے پھسل کر نکل گیا۔ آواز آئی: "کیوں ـــــ جی بھر گیا؟"

میں نے دوبارہ ہاتھ بلند کیا اور بولا "نہیں جی تو نہیں بھرا مگر زمانہ پسند نہیں آیا" اور مٹھی میں دوسرے قرن کو لے لیا اور کہا "اے قرن تھم جا" اب جو مٹھی کھول کر دیکھتا ہوں تو سیاہی رفتہ رفتہ چھٹتی جارہی ہے اور کچھ نقطے کہ ابھر رہے ہیں۔ ایک عالی شان دربار ہے اور عالی مرتبت سلطان ہے کہ جاہ و حشم اور رعب اس کی آنکھوں سے ٹپکتا ہے اور پہلو میں اس کے ملکہ بیٹھی ہے۔ ایک درباری انگلی

کا اشارہ کرتا ہے کہ ہزارہا سانپ ایوان میں پیدا ہو جاتے ہیں اور زمین و زماں کو اپنے وجود سے پُر کر دیتے ہیں۔ لہراتے ہوئے، پھنکاریں مارتے ہوئے لپک رہے ہیں۔ ان کی خوفناک زبانیں شعلوں کی طرح لپک رہی ہیں۔ بس بس اتنا ہی کافی ہے۔ میں نے مٹھی کھول دی اور قرن مٹھی سے پھسل کر نکل گیا۔

آواز آئی۔۔۔ "کیوں، کیا ہر فرعون کے لئے موسیٰؑ پر تمہارا ایمان نہیں۔ ابھی موسیٰ نے طلسم سامری توڑا ہی نہیں اور تم گھبرا گئے؟"

میں نے کہا۔ "اے میرے معبود نہیں گھبرایا نہیں، بلکہ دیکھتا ہوں کہ آخری قرن میں فراعین تو بہت ہیں طلسم سامری کے کارخانے ہیں کہ کھلتے چلے جا رہے ہیں مگر موسیٰ کا کہیں پتہ نہیں۔ آخری قرن کیا موسیٰ سے خالی ہے؟"

جواب ملا: "نہیں کوئی زمانہ موسیٰ سے خالی نہیں صرف پہچاننے والی آنکھ کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا: "لیکن فراعین نے زمین کو ظلم و ستم سے بھر دیا ہے۔"

جواب ملا: "ان کی رسی دراز کر دی گئی ہے لیکن وہ بچ نہیں سکتے۔ ہماری طرف ان کو لوٹنا پڑے گا۔"

کیا تمہیں یاد نہیں کہ لمن الملک الیوم کی بشارت دی گئی ہے اور للّٰہ الواحد القہار ہمارا ارشاد ہے۔"

میں نے کہا: "اے اللہ مجھے یاد ہے، مجھے بخوبی یاد ہے۔"

اتنے میں ایک شوخ و شنگ قرن میرے قریب سے گذرا اور میں نے اُس پر جھپٹا مارا معاً مجھے چاندی کی گھنٹیوں کی سی سریلی آوازیں سنائی دیں۔ سیاہ نقطوں میں جان پڑنی شروع ہو گئی دیکھا کہ مصر کی وہ حسینہ کہ چار دانگ عالم میں حسن کا اس کے چرچا ہے۔ زنانِ مصر کے ہجوم میں گھری

بیٹھی ہے اور بیبیاں ہیں کہ اُسے چھیڑ رہی ہیں۔ پھر اس نے کنیزوں کو حکم دیا کہ ترنج سے زنانِ مصر کی ضیافت کریں۔ ترنج اور چھریاں تقسیم ہو گئیں لیکن کسی معشوق کی آمد کا انتظار ہے۔ چہلوں اور شوخیوں کا آوازہ گونج رہا ہے کہ ایک سرو قد، سیمیں بدن چہرے پر نقاب ڈالے سرِ بزم پہنچ کر تسلیم بجا لاتا ہے۔ نقاب الٹتا ہے تو سورج کی سی تابش پیدا ہوتی ہے۔ نگاہیں خیرہ اور زنانِ مصر میں الامان و الحفیظ کا غلغلہ اٹھتا ہے اور وہ مسکراتی ہے کہ بیبیاں اپنی اپنی فگار انگلیوں سے لہو پونچھتی ہیں۔ قرن ایک بار پھر مٹھی سے پھسل کر نکل جاتا ہے۔

میں ایک لمحے انتظار کرتا ہوں کہ شاید ادھر سے کوئی فرمان آئے لیکن وہاں خاموشی چھائی رہتی ہے۔ اس واقعہ پر اپنی طرف سے کوئی رائے زنی کرنا بجائے خود سوءِ ادب تھا اس لئے میں بھی خاموش رہا۔ اس اثنا میں سیاہ رنگ کے سیال دھوئیں کی چادریں کی چادریں شائیں شائیں کرتی ہوئی گذرتی رہیں اور میں ساکت و صامت کھڑا سوچتا رہا کہ اب کیا کروں کہ میں نے دونوں ہاتھ بلند کئے اور دونوں مٹھیوں میں دو قرن پکڑ کر بھینچ لئے۔ ایک مٹھی کھولی تو موہوم نقاط منجمد ہونے لگے اور آہستہ آہستہ ان نقاط میں جان پڑنے لگی۔ دیکھا کہ زرتشتی تہذیب کی بزم آراستہ ہے۔ آتش بھی ہے اور آتشِ سیال بھی۔ برسرِ دربار پیرِ مغاں موجود ہے مغبچے بھی ہیں اور ساقی بھی رندانِ میکدہ جھومتے ہیں اور مستی کے عالم میں ساغر کو چومتے ہیں کہ دیارِ غرب سے ایک آواز بلند ہوتی ہے جسے سن کر رند ساغر توڑ دیتے ہیں۔ ساقی مے کدہ سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ پیرِ مغاں آگ کو بجھا دیتا ہے اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین و زماں دہل جاتے ہیں۔ دیارِ مغرب کے کلیساؤں سے اٹھنے والی صدائیں تھم جاتی ہیں۔

میں مٹھی کھول کر اس قرن کو رہائی دے دیتا ہوں۔ پھر دوسری مٹھی کھولتا ہوں۔ یورپ کے جاگیردارانہ نظام کی کوکھ سے صنعتی اور سرمایہ دارانہ نظام جنم لے کر براعظم یورپ، ایشیا اور

افریقہ پر اپنے سائے پھیلاتا چلا جا رہا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے موہوم نقاط آہستہ آہستہ تھم کر قائم ہو جاتے ہیں گھنی گرجدار آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ بے حد خون خرابے بمباری اور آہ و بکا کی دلدوز اور کرب ناک آوازوں اور چیخوں کے درمیان دیارِ مشرق میں ایک چکا چوند پیدا کر دینے والی روشنی نمودار ہوتی ہے اور ایک ایسا دھماکہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا عالمِ تحیر میں ڈوب جاتی ہے اور رفتہ رفتہ ایسا شور بلند ہوتا ہے اور میں خود کو سرپٹ بھاگتا ہوا پاتا ہوں کہ ایک ہجوم ہے، ایک جمِ غفیر ہے جو پیچھے میرے چلا آ رہا ہے۔ میں سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگا۔ مڑ کر بھی پیچھے نہ دیکھا کہ مبادا پتھر کا نہ بن جاؤں۔ مگر ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ آنکھیں بند کر کے اب جو بگٹٹ بھاگتا ہوں تو سمندر میں در آیا اور اب جو پانی کی چادریں کی چادریں اُٹھ کر حملہ آور ہوئیں تو یوں لگا کہ زمین تلووں کے نیچے ہی نیچے سے کھسک رہی ہے۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں تو خود کو بیچوں بیچ سمندر میں پایا۔ ہر طرف پانی ہی پانی اور اونچی بڑی بڑی تند و تیز لہروں کی یلغار میں خود کو گھرا ہوا دیکھا۔ ذرا پنجوں کو زمین میں گڑو دیا تو محسوس ہوا کہ میں پاتال میں دھنسا چلا جا رہا ہوں۔ گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا تو سر آسمان سے ٹکرا رہا تھا اور میں پتھر کا بن چکا تھا۔ اور کسی مینار کی مانند ساکت ہو چکا تھا بلکہ منجمد ہو گیا تھا۔

محل سرا

جاڑے میں سورج بھی ذرا دیر سے جاگتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ بڑے تکلف سے مشرق سے سر اُٹھا کر زمین کی سطح پر نظر ڈالتا ہے اس وقت زمین پر کہرے کی تہہ در تہہ چادریں پڑیں تھیں، عمارتیں اور درخت ان میں لپٹے لپٹائے دبکے پڑے تھے ابھی نواب یوسف علی خاں کی منڈیلی کے سب سے اونچے کلس پر دھوپ کی ایک ہی شعاع پھوٹی تھی۔

نتھو سقہ کندھے پر سوکھی مشک رکھ دونوں ہاتھ بغلوں میں دے کر سو سو کرتا ہوا بلدیہ کی نوکری پر چلا گیا۔ منڈیلی کے صدر دروازے کے پاس جو مکانات ہیں اُن سے نوکروں کے میلے کچیلے اور سردی میں سمیاتے ہوئے بچے نکل نکل کر رحمٰن کمہار کے سلگائے ہوئے الاؤ کے گرد جمع ہونے لگے رحمٰن کمہار کا داماد لطیف حسین سائیکل پر بیٹھ کر بچوں سے مونگ پھلی لانے کا وعدہ کرکے ریلوے کی نوکری پر چلا گیا۔ ابھی اس کی سائیکل کی چرچوں چرچوں سے خوابیدہ فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا ہی ہوا تھا کہ بتن دھوبی اپنے چکنے چوڑے بیل پر میلے کپڑوں کی گٹھری لادے گزرا اور بیل کے گلے

میں بندھی ہوئی گھنٹی سے نیند کا طلسم ٹوٹنے لگا۔ اللہ رکھے اس وقت گھوڑے کو کھریرا کرنا بند کر کے حقے پر چلم جماتا ہوا اصطبل سے نکل کر بتن دھوبی سے مخاطب ہوا:

"سلام مالیکم"

"مالیکم سلام بھائی اللہ رکھے۔ مجاج سریپھ کیسا ہے؟"

اور اللہ رکھے نے اس وقت ناک سڑک کر کہا: "مجاج سریپھ کو جکام ہو گیا ہے۔"

مسجد سے واپس آتے ہوئے میر صاحب تسبیح چوم کر کہنے لگے: "میں کہتا ہوں جی کہ تم نرے گاؤدی ہی رہو گے یا مردِ اشراف بھی بنو گے۔ ارے اللہ کے بندے یہ زبان پر ظلم ہے۔ اجی مزاج شریف کہو — مزاج شریف۔"

میر صاحب کی بات پر کسی نے دھیان نہیں دیا اور وہ دعائیں پڑھتے ہوئے ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے، اور اپنے کھرّے پلنگ پر بیٹھ کر بڑبڑانے لگے اور ان کا لڑکا علی حسین جلدی جلدی اپنی کاپی پر لکھنے لگا: "بتن دھوبی حقے کے دو کش لے کر چلا گیا۔ اس کے بیل کی گھنٹی کی ٹن ٹن دیر تک سنائی دیتی رہی۔ غلام حسین سائیس نے نواب صاحب کی ٹم ٹم مندیلی کے سامنے لا کر کھڑی کر دی۔ سارے ملازمین اور ان کے بچے بالے مندیلی کے صدر دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر سرکار کی آمد کا انتظار کرنے لگے اور جوں ہی سرکار تشریف لائے، پا جامہ، عراقی حمرو کی اچکن پر روئی کا دگلہ، پیروں میں وارنش کی سیاہ پمپ پہنے ہوئے ہاتھ میں چھڑی لئے ڈیوڑھی میں برآمد ہوئے کہ میر صاحب سب سے پہلے نہایت ادب سے آداب بجا لائے۔ ڈیوڑھی سے نکل کر نوکروں پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتے ہوئے ان کے سلام گردن کے پر وقار خم سے لیتے ہوئے سرکار ٹم ٹم پر آ بیٹھے اور ایک لمحے کو اپنے شاندار سرخ و سپید چہرے پر رکھے ہوئے ٹھیکوں پر ہاتھ پھیر کر انھوں نے بائیں ہاتھ کی ایک انگلی اٹھائی۔ سائیس نے جھک کر سلام کیا اور اللہ رکھے پچھلے پاؤں ان

پر کھڑا ہو گیا۔ سائیس نے لگام سرکار کو پیش کی اور اللہ رکھے کے برابر آ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹم ٹم چلدی اور دیر تک اس کی آواز گونجتی رہی۔ آواز جیسے ہی دور ہوتی ہوئی گم ہوئی، ہر طرف سے یوں عورتیں، مرد بچے نکل پڑے جیسے مرغیوں کے ہزاروں ڈربے کھول دیئے گئے ہوں اور احاطے میں یوں ہڑبونگ مچ گئی جیسے بچوں کے مدرسے میں ایک دم چھٹی ہو جاتی ہے۔ منڈیلی کے سب سے اوپر کی کھڑکی کے جھروکے سے عالیہ بیگم نے آنکھ لگا کر نیچے دیکھا۔ علی حسین بغل میں کتابوں کا بستہ دبائے سر جھکائے کالج جا رہا تھا اور انا پاس کھڑی ہوئی کہہ رہی تھی:

"اے میں واری جاؤں! بڑی سرکار یاد فرماتی ہیں پوچھا ہے نصیب دشمناں، مزاج تو ناساز نہیں، ہم دیدار کے مشتاق اور سلام کے منتظر ہیں۔"

اور بڑی بٹیا نے ٹھنک کر کہا:

"بھئی انا تم کہہ کیوں نہیں دیتیں امی جان سے۔"

"کیا کہہ دوں سرکار؟"

"اونھ، جو جی چاہے۔"

"اے میں قربان میں صدقے" انا سچ مچ صدقے قربان ہونے لگی "غصے میں جی ہلکان ہوتا ہے، میں واری گئی، یہ کیا جی میں سمائی ہے جو پہروں پہر تک ـــــ"

"بھئی ہمیں تنگ نہ کرو انا، ہم تنہا رہنا چاہتے ہیں۔"

اور اسی وقت دوشالے میں لپٹی لپٹائی امی جان ہاتھ میں تسبیح لئے خاموشی سے آ کر وہاں کھڑی ہو گئیں۔ عالیہ بیگم نے جھک کر سلام کیا۔ انا بیگم صاحبہ کو تین تسلیمیں بجا لائی اور پھر چلی گئی بیگم صاحبہ نے خوب گھور کر عالیہ بیگم کو دیکھا۔

عالیہ بیگم نے نظریں جھکا لیں اور سہم کر وہاں سے ہٹ کر چلی گئیں۔

ابا جانی (سرکار) دوپہر کے دربار سے آکر جب دسترخوان پر بیٹھے تو بیگم صاحبہ کے برابر بیٹھی ہوئی عالیہ بیگم کا دل دھڑک رہا تھا مگر ابا جانی نے عالیہ بیگم اور اس کے بالکل برابر بیٹھی ہوئی ثمینہ بیگم پہ پیار اور شفقت بھری نگاہ ڈال کر تمام نوکروں کو تخلیئے کا حکم دیا، انا اس وقت بھی حاضر رہی، اور ابا جانی علاقے کی خبریں بیگم صاحبہ کو سنانے لگے، خاندانی مقدموں کا ذکر کرنے لگے۔ مقدمے جو ان کے آبا و اجداد سے انھیں ورثے میں ملے تھے اور جن پر علاقے کی دولت پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی لیکن مقدموں کے ختم ہونے کی نوبت کسی طرح نہیں آتی تھی۔ دن ڈھلتے ہی سرکار ٹم ٹم پر بیٹھ کر جب ہوا خوری کو چلے گئے اور شام کے کھانے کے بعد مجرا سننے بیٹھ گئے تو عالیہ بیگم کی جان میں جان آئی، حویلی کے دریچوں سے ہلکی ہلکی موسیقی کی تانیں جب اٹھتیں تو چوکی پر نماز پڑھتی ہوئی امی جان کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتیں۔ انا دوپٹے کا دامن پھیلا کر چپکے چپکے قبلہ رو ہو کر کچھ بد بدانے لگتی۔ اس معمول کی اب عالیہ بیگم عادی ہو چکی تھیں۔

رات ہوتے ہی دالانوں میں پردے ڈال دیئے جاتے، انگیٹھیاں دہکنے لگتیں۔ انا اپنی پلنگڑی پر بیٹھ جاتی۔ بیگم صاحبہ تختوں کے چوکے پر گاؤ تکیئے سے لگ کر بیٹھتیں، ڈلی کترتیں، پان بناتیں اور خاصدان بھر بھر کے گلوریاں دیوان خانے میں بھجواتی رہتیں۔ ثمینہ بیگم لحاف میں دبک رہتی پاس ہی عالیہ بیگم کا پلنگ بچھا ہوتا ثمینہ بیگم کہتی:

"اے باجی لال شہزادہ نیلم پری پر جب عاشق ہو گیا اور اس نے اپنی شہزادی کو اندھے کنوئیں میں قید کر دیا تو پھر اس پہ کیا گزری؟"

کیا گزرنا تھا بے چاری پہ" عالیہ ٹھنڈی آہ بھر کر اپنے لحاف میں لیٹے لیٹے کہتی ۔

"خون دل پینے کو اور لخت جگر کھانے کو — یہ غذا ملتی ہے لیلیٰ ترے دیوانے کو"

"ہائے ہائے چہ چہ بیچاری شہزادی گھٹ گھٹ کر مر بھی گئی ہو گی — کیوں باجی ہے نا؟"

"نہیں بی بی مرجاتی تو دکھ کے بندھن ٹوٹ ہی نہ جاتے، اس کو تو مر مر کے جینا تھا اور جی جی کے مرنا ——"

"ہائے میرے اللہ کتنا ڈراؤنا ہوگا وہ منظر —— بھئی باجی ایسی کہانی نہ کہیئے مجھے تو ڈر لگتا ہے، معلوم ہوتا ہے جیسے میں ہی شہزادی ہوں اور لال شہزادے نے مجھے اندھے کنویں میں قید کر دیا ہے اور میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔"

کہنے کو تو ثمینہ بیگم یہ فقرہ کہتی لیکن محسوس عالیہ بیگم کو بھی یہی ہوتا کہ اس کا دم گھٹا جا رہا ہے۔ رات بھیگ گئی، ساری دنیا سو گئی لیکن عالیہ کا ذہن بیدار ہو گیا۔ محلسرا، امی ابا اور علاقہ یہ سب طلسمی کہانی معلوم ہونے لگے۔ محلسرا جس میں ایک شہزادی کا سر کاٹ کر چھینکے میں لٹکا دیا جاتا تھا۔ کالا دیو آ کر جادو کی چھڑیاں اٹھاتا، سر کو دھڑ سے ملاتا، چھڑیاں سرہانے کی پائینتی اور پائینتی کی سرہانے رکھتا، شہزادی الا اللہ کہہ کر اٹھ بیٹھتی، دیو اس سے شادی کرنے کا سوال دہراتا۔ شہزادی پھر حقارت سے اسے جھڑک دیتی۔ کالا دیو طیش میں آ کر شہزادی کو پھر اسی طرح مار ڈالتا۔ اور آپ آندھی طوفان کی طرح آناً فاناً ہوا میں اڑ جاتا۔ عالیہ بیگم کبھی کبھی سوچتی سچ مچ جیسے یہ مردہ شہزادی وہ آپ خود ہے کہ محلسرا میں اس کی لاش پڑی ہوئی ہے اور اور کالا دیو ابھی آ کر ایسا منتر پڑھے گا کہ سارا محل بھک سے جل کر خاکستر ہو جائے گا اور بس ——
اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ محلسرا میں خراٹوں کی آوازیں اسے متوحش کرنے لگتیں لحاف کا کونا اٹھا کر وہ امی کے پلنگ پر نگاہ ڈالتی تو سن سے رہ جاتی، امی ندارد —— ہائے اللہ یہ کیا طلسم ہے۔ ابا جانی کے دیوان خانے سے اب بھی ہلکی ہلکی موسیقی کی آوازیں آ رہی ہوتیں ہاتھ بڑھا کر وہ پردہ جو ہٹاتی اور دالان پر جو نظر ڈالتی تو یہ دیکھ کر اس پر سکتہ سا طاری ہو جاتا کہ امی سر پہ قرآن رکھے بال بکھرائے ایک ٹانگ پر کھڑی ہوئی کوئی عمل کر رہی ہوتیں۔ وہ پھر لحاف میں

دبک رہتی اور نہ جانے کیا کیا اوٹ پٹانگ باتیں سوچتی ہوئی سو جاتی۔

محلسرا میں جب انا کی لڑکی بوٹا آجاتی تو عالیہ بیگم کو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے اس محلسرا کے باہر بھی ایک دنیا آباد ہے جہاں کچھ اور بھی انسانوں کی بستی ہے۔ بوٹا عالیہ بیگم کے پیر دباتی جاتی اور ڈھیروں کہانی قصے سنائے چلی جاتی کہ عالیہ بیگم کی تشنہ روح کو ان قصوں کو سُن سُن کر کچھ عجیب سی طمانیت محسوس ہونے لگتی۔

"وہ جو گومتی کے کنارے سفید مسجد ہے وہاں تو جنات بابا رہویں ہیں۔" بوٹا اپنے وہمی مزاج کا اس طرح انکشاف کرتی: "تحسین گنج سے جو سڑک حسین آباد کے پہلے پھاٹک کو جاتی ہے اور وہ جو تحسین گنج کے نکڑ پر شہر کی سب سے اونچی اور سب سے بڑی جامع مسجد ہے وہاں تو دن دہاڑے جنات رہویں ہیں!"

ثمینہ بیگم بوٹا کی باتوں پر تڑسے بولتی: "یہ جنات کیا ہوتے ہیں ری بوٹا ــــ میں تو جانوں سب وہم ہے۔ ہاں پریاں ضرور ہوتی ہیں تبھی تو ان کی اتنی ڈھیر سی کہانیاں اور قصے مشہور ہیں۔"

"نہیں سرکار جنات بھی ہوویں ہیں، اللہ قسم اتا بڑا ڈیل ہوتا ہے جیسے کھجور کا درخت، سردار جو ہے نا، مغلانی بی کا لڑکا۔ ایک دفعہ رات کے ٹن ٹن بارا بجے جمعہ مسجد سے جو لوٹا تو کیا دیکھتا ہے کہ سڑک پر ادھر سے اُدھر تک، کوئی بیس گز کی لاش پڑی ہے اس نے جو چادر اٹھائی تو اس کے اندر ایک اور چادر اس نے دوسری چادر ہٹائی تو ایک اور چادر اس نے ساتویں چادر جو سرکائی تو زور سے آواز آئی چلا جا اپنے راستے پر نہیں تو پچھتائے گا!!"

"ہائے اللہ سردار نے چادر کا ہے کو سرکائی۔ توبہ توبہ ایسا نڈر۔"

"اے بی بی یہ نگوڑے مَردوئے سب کے سب نڈر ہوتے ہیں مجھے تو کوئی لاکھ روپیہ دیوے تب بھی ادھر نہ جاؤں۔ میں تو ایک دفعہ اماں کے ساتھ بڑی سرکار کے لئے دعا کرنے

جمعہ مسجد میں گئی تو کیا دیکھوں ہوں کہ ڈھنڈھار سی مسجد میں ایک مدھم سی شمع ٹمٹما رہی ہے۔ اتنے اونچے اونچے مسجد کے در بی بی کہ دس ہاتھی اگر تلے اوپر کھڑے ہو جائیں تو پتہ نہ چلے اور اس پراتی بڑی مسجد میں ایک بوڑھا آدمی نماز پڑھ رہا تھا۔ اب جو میں دعا مانگ کر مڑی تو بی! بوڑھا آدمی غائب، بیں تو بس تھر تھر کانپنے لگی، اماں سے کہا تو اماں بھی ڈر گئیں —— اب تو بی میری توبہ اللہ معاف کیجیو بندی نے کان پکڑے اب نہ جاؤں گی۔"

"جناّت ہوں گے؟"

"اور کیا سرکار جناّت تو وہاں رہویں ہیں۔"

علی حسین کو معلوم تھا کہ وہ نواب یوسف علی خاں کی منڈیلی کے باہر ڈیوڑھی پر چوبیس گھنٹے پہرہ داری کرنے والے ملازم کا لڑکا ہے اُیاز قدر خود بشناس' وہ اپنی حیثیت خوب پہچانتا تھا اسے تو اپنی قسمت سے گلہ تھا کہ اس کی قسمت میں شکستوں اور غموں کے سوا بھلا کیا رکھی بھلا وہ بامن یا پنڈت کو کیوں ہاتھ دکھائے مگر میر صاحب اس کے سر ہو گئے اور گرج کر بولے:

"ارے بیوقوف! بارہ برس کے بعد تو گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں ہم تو پھر بھی انسان ہیں، جاؤ پنڈت کو ہاتھ دکھاؤ پتہ نہیں کب اچھا ستارہ آجائے۔"

مگر علی حسین چپ چاپ بیٹھا کتاب پڑھتا رہا۔ ڈیوڑھی کے باہر چھوٹے چھوٹے گھروں کے دروازوں سے عورتیں پنڈت پر ٹوٹی پڑتی تھیں۔ ان کے شور و غوغے میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ ان میں سے ہر ایک اپنے ہاتھوں کی ریکھائیں اسے دکھا کر اپنا مستقبل معلوم کرنا چاہتی تھی، جیسے پنڈت انسان نہ ہو وحی کا کوئی فرشتہ ہے گویا جس کے سامنے مستقبل کھلی ہوئی کتاب کی طرح رکھا ہے:

"بامن جی! ہماری بٹیا کے ہاتھ کب تک پیلے ہوں گے؟"

"کیوں بامن جی! بٹیا کے اّبا کا دمہ تو جاتا رہے گا نا!"

"اجی پنڈت جی! ہم مقدمہ تو جیت جائیں گے نا!"

اور پنڈت سر پر پگڑی باندھے تلک لگائے پوتھی کھولے، سفید دھوتی اور مرزئی پہنے رام نام کا جاپ کر کر کے کچھ منتر پڑھتا جاتا، آنکھیں بند کر کے اور پوروں پہ کچھ حساب لگا لگا کر کہتا:

"اسی دسہرے تک بٹیا بیاہی جائے گی۔"

"ارے تیرے منہ میں گھی شکر، جُگ جُگ جیو رے پنڈت!"

برہمن پھر کہتا: "مقدمہ جیت جائے پر کشٹ بھوگنا پڑے گا۔"

"ارے بامن جی رحم کرو رحم!!"

"سارے سنکٹ نشٹ ہو جائیں جو دس بامنوں کو بھوگ دو۔"

"دس بامنوں کو بھوگ دینے میں کیا لگے گا بامن جی۔"

اور بامن نے حساب لگا کر کہا: "بیس آنے!"

"اُف بابا ـــــ بیس آنے ـــــ کم نہیں ہو گا؟"

"کم بھی ہو سکتا ہے پر ہلکا بھوگ ہو گا۔"

"کتنا کم ہو گا؟"

"دس آنے!"

"کوڑی کم نہیں؟"

"نہیں!"

"ارے کیا اندھیر ہے بامن جی، پچھلے ساون تک تو پانچ ہی آنے لگتے تھے"۔

"اب تو پانچ آنے کے چنے بھی نہیں ملتے میاں جی! دس بامن ہیں دس۔ بامن دو دو چار چار دن بھوگ نہیں لگاتا، پر جب لگاتا ہے تو چار دن پچھلے اور چار دن اگلے سب پورے کر لیتا ہے"۔

کتاب کے پیچھے علی حسین نے چہرہ سکیڑ لیا، بامن کی ان باتوں پر میر صاحب دل ہی دل میں اس کے علم کے قائل ہوتے جا رہے تھے اور بیٹے سے دوبارہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ اللہ رکھے اصطبل سے گھوڑے کو لے کر تالاب کی طرف جاتے ہوئے لمحہ بھر رکا وہاں عورتوں کا جم غفیر دیکھا تو لگا لہک لہک کر گانے:

"میری عمر ساری گجر گئی باکھدا تمہارے کھیاں میں
باکھدا تمہارے کھیال میں
میرا ہاتھ دیکھ، برہمنا! میرا یار مجھ سے ملے گا کب؟

" " " " " " " " "

تیرے منہ سے نکلے کھدا کرے
تیرے منہ سے نکلے کھدا کرے

اسی ماہ میں اسی سال میں
اسی ماہ میں اسی سال میں
ارے ہاں اسی سال میں
میری عمر ساری گجر گئی ــــــ"۔

تمام نوکروں کے مکانوں کے اندر عورتوں میں کھلبلی سی ہونے لگی دروازوں پر پڑے ہوئے ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے دبی دبی سی سرگوشیاں ہونے لگیں اور دبی دبی سی ہنسی کے فوارے چھوٹنے

لگے۔میر صاحب اللہ رکھے کی اِس بے ہودہ حرکت پر سخت جز بز ہوئے۔حقارت سے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور زور زور سے "لا حول ولا قوۃ ـــــ لا حول ولا قوۃ" کا وظیفہ پڑھنے لگے۔اور یہ وظیفہ اُس وقت تک پڑھتے رہے جب تک اللہ رکھے گھوڑے کو لیے ہوئے وہاں سے چلا نہیں گیا اچانک انا نے زینے پر کھڑے ہو کر زوروں سے آواز دی:

"اجی میر صاحب، اے میر صاحب"

"کیا ہے بی انا؟"

"ذرا بامن کو روک لیجئے گا بڑی سرکار کچھ پوچھیں گی۔"

"اچھا انا جی روکے لیتا ہوں۔"

"آپ روکے رہیئے، اندر پردہ ہو رہا ہے۔"

"اے بھائی بامن ـــــ اے میاں بامن سننے ہو۔" ـــــ میر صاحب دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھ کر زوروں سے چیخے

"ہاں صاحب کہیئے ـــــ؟"

بامن کی تو جیسے منہ مانگی مراد پوری ہوئی میر صاحب بولے:

"میاں ذرا یہاں آنا سرکار نے یاد فرمایا ہے۔"

بامن سب کو چھوڑ چھاڑ کر بھاگتا ہوا آن پہنچا۔ڈیوڑھی میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا، تنگ اور تاریک ڈیوڑھی میں دو پلنگ پڑے تھے ایک نماز کی چوکی، اس پر سیتل پاٹی بچھی ہوئی، ایک ٹوٹی ہوئی بیٹی، دو ٹین کے پیپے جو زنگ خوردہ تھے، رکھے ہوئے تھے۔دیوار پر دو کھونٹیوں پر ایک پٹرا ٹکا کر کتابیں رکھی گئی تھیں۔ایک پیپے پر لیمپ اور دوسرے پر لکھنے کا کچھ سامان کاغذ قلم پنسل وغیرہ کھری چارپائی پر علی حسین بے تعلقی سے بیٹھا رہا۔میر صاحب نے پنڈت کو ہاتھوں ہاتھ لیا

اپنی چارپائی پر بٹھایا اور خود ہی بولے :

"لڑکا ہے میرا انٹرنس پاس کر چکا ہے اے فے کا امتحان دے گا"

"ارے بھئی سکھی رہے آنند رہے جُگ جُگ جیئے"

"علی حسین ! سلام کرو پنڈت جی کو ـــــ دیکھو دعا دیتے ہیں"

اور علی حسین نے بے دلی سے ہاتھ اٹھا دیا، پنڈت جی کھل اُٹھے "سکھی رہو بیٹا سکھی رہو"

پھر پنڈت جی نے اچانک علی حسین کی پیشانی پر نظر ڈال کر بولے "ارے میر صاحب ـــــ بڑا ہی بھاگیوان ہے تمہارا پتر۔ رام کسم وہ تیج دیکھ رہا ہوں، وہ تیج دیکھ رہا ہوں جو کیول چندر روشی سورماؤں کو ملتا تھا ـــــ لا بیٹا ذرا ہاتھ تو دکھانا ـــــ"

میر صاحب کھل کھل اُٹھے نہال ہو کر بولے :

"دکھا دَ بیٹا ہاتھ، ذرا ریکھا تو دیکھنا یہ دُکھ کے دن کب تک بھوگنا ہیں ـــــ علی حسین نے ہاتھ بڑھا دیا لیکن بے دلی سے۔

"ارے واہ بھگوان کیا لیلا ہے تمہاری" پنڈت جی ریکھائیں دیکھ کر بولے "میر صاحب لکشمی کی ریکھا دیکھ رہا ہوں ہاتھ میں لکشمی بھی ہے شکتی بھی ہے دیا بھی ہے استری کا سکھ اور دَیا بھی سچ کہتا ہوں میر صاحب راجوں مہاراجوں کا ہاتھ بھی ایسا نہیں ہوگا"

اتنی بات سُن کر میر صاحب کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوگئی لیکن اچانک کسی گہرائی میں ڈوب کر بولے "دو مہینے کا بھی نہیں تھا، اس وقت اس کی ماں اللہ کو پیاری ہوگئی"

"ہے رام"

میر صاحب نے دامن سے آنکھوں کے گوشوں کو پاک کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے :

اُس وقت سے اب تک کلیجے سے لگائے لگائے پھر رہا ہوں اسے بڑی اللہ آمین سے پالتی اس کی

ماں اگر کچھ دن اور زندہ رہ جاتی۔"

پنڈت جی نے دلچسپی لی ٹھیٹھ پوربی لہجے میں بولا: "بیاہ نہیں کیھو دوسرا۔"

کیا بیاہ کرتا پنڈت جی! دوسری ماں اپنا سکھ دیکھتی اپنی چھاؤں، اسے کیا پڑی تھی کہ جو انہیں پال پوس کر جوان کرتی۔ چار دن میں گلا گھونٹ کر دوسرا بچہ جن لیتی —— میں نے کہا میاں میر حسن توبہ کرو اور دل سے دوسری شادی کا خیال نکال دو، سو بھیّا اللہ نے یہ دن دکھایا۔ دیکھئے دوسروں کی ڈیوڑھی پر اور کب تک کی تابعداری لکھی ہے ——"

لکڑی کے زینے پر نیم تاریکی اور نیم روشنی کی کثیف سی فضا نیچے سے اوپر تک ایک سی تھی۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بامن اور میر صاحب اوپر چڑھے بار بار انہیں ڈر لگتا کہ کہیں لکڑی کا شکستہ زینہ ٹوٹ نہ جائے۔ میر صاحب سالہا سال سے ڈیوڑھی میں پڑے تھے لیکن زینے پر چڑھنے کی ان کو پہلی بار اجازت جو ملی تو سمجھے گویا جنت کا پروانہ مل گیا۔ زینہ ختم ہوتے ہی ایک گول کمرہ آگیا جہاں چاروں طرف محراب دار دری در تھے۔ ایک محراب دار در مکان کے باہر کا منظر پیش کرتا تھا۔ ایک طرف تختوں کے چوکے لگے تھے، دوسری دو چوکیاں رکھی تھیں۔ چھت میں جھاڑ لگے تھے لیکن شکستہ، دیواروں کے پلاسٹر کا رنگ اڑ گیا تھا بے رنگ و روغن در و دیوار کے طاقوں میں دوشاخے اور پنج شاخے کنول لگے تھے جس میں کبھی مشعلیں جلتی ہوں گی لیکن اب مکڑیوں نے جالے لگا رکھے تھے۔ ایک طاقچے میں مٹی کے تیل کا لیمپ دھرا تھا اور اس سے متصل دھوئیں کی سیاہ لکیر چھت تک دوڑی ہوئی تھی۔ چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں پڑی تھیں۔ میر صاحب کو پہلے یوں محسوس ہوا جیسے نواب صاحب کا ظاہری کرّوفر کچھ اور رہے اور اندر محض ڈھول میں پول ہے۔ بامن کو ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ میر صاحب پردے کے پاس آکر بولے:

"ہم حاضر ہو گئے ہیں اور سرکارِ عالیہ کو تسلیمات بجا لاتے ہیں۔"

انا کی آواز آئی: "بڑی سرکار تشریف فرما ہیں۔ آداب قبول فرماتی ہیں۔"

میر صاحب بولے: "پنڈت جی آگئے ہیں اور پرنام کرتے ہیں۔"

انا کچھ توقف کے بعد بولی: "سرکار فرماتی ہیں پنڈت جی ذرا زائچہ بنا کر بتاؤ ہمارے برے دن کب ختم ہوں گے اور نواب صاحب کا علاقہ کب واپس ملے گا؟"

میر صاحب بولے: "سن لیا پنڈت جی؟"

اور پنڈت جی جھک کر انگلیوں سے زمین پر لکیریں بنانے لگا، کچھ دیر تک آنکھیں بند کر کے کچھ سوچتا رہا، پھر ہاتھوں کی پوروں پر کچھ جوڑنے لگا اور اس کے بعد سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے بامن جی؟" میر صاحب بولے:

بامن نے ایک دوہے کا بول پڑھا:

"من ماں راکھوں من جرے کہوں تو مکھ جر جائے"

پردے کے پیچھے ایک ہلکی سی جنبش ہوئی اور ایک سسکی سنائی دی سب پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ میر صاحب کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

لیمپ کی ملگجی ملگجی روشنی میں علی حسین کتابوں پر نظریں گاڑ کر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میر صاحب عشا کی نماز پڑھ کر، دونوں ہاتھ بلند کر کے گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہے تھے۔ جانماز لپیٹ کر ایک طرف رکھی اور امام حسینؑ کے روضے کی طرف رُخ کر کے انگلی اٹھا کر رقت آمیز لہجے میں زیارت پڑھنے لگے:

"السلام علیک یا ابا عبداللہ

السلام علیک یا ابن رسول اللہ

السلام علیکم و رحمتہ اللہ برکاتہٗ

پھر رسان سے پلنگ پر بیٹھ پٹاری اٹھائی چھالیہ لے کر سروتے میں زور سے دبائی اور بولے

"تت ہے !!"

"کیوں بابا؟" علی حسین بولا "! کیا بات ہے؟"

میر صاحب سروتے سے ڈلی کے دو ٹکڑے کرتے ہوئے بولے

"کسی کی ایک طرح سے بسر ہوئی نہ انیس

عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا"

علی حسین خاموشی سے سنتا رہا۔ میر صاحب خود ہی بولے :

"جائے عبرت سرائے فانی ہے"

"مگر قصہ کیا ہوا بابا جان کچھ کہیئے تو؟"

"ہونا کیا تھا وہی ہوا جس کا ڈر تھا !"

"یعنی؟"

میر صاحب جواب کے لئے بہت اہتمام سے اٹھے۔ اِدھر اُدھر دیکھ بھال کر اور خوب سا جائزہ لے کر علی حسین کے کان کے قریب منہ لے جا کر رازدارانہ انداز میں بولے :

"ڈھول میں پول ہے !"

"اچھا؟"

"کچھ نہیں رہ گیا، بس دکھاوا ہی دکھاوا ہے !!"

"تو پھر؟"

"بس اللہ بیلی ہے!"

بوٹا عالیہ بیگم کے پیر دباتے دباتے دھڑام سے سہری پر گر پڑتی اور جب اس کی آنکھ کھلتی تو عجیب بے ترتیب سے لباس میں سہری کے پائینتی پڑی ہوتی۔ فوراً حفظِ مراتب کا خیال آتا اور وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھتی۔ کہاں بڑی بٹیا اور کہاں وہ محض ایک انا کی لڑکی تھی بھلا اس کی یہ مجال کہ ایک ہی بستر پر لیٹے۔ بڑی سرکار دیکھ لیں تو کھال کھینچ کر بھوسہ بھروا دیا جائے۔ آنکھیں ملتی نیند میں چور جب وہ اپنی صحنچی میں پہنچتی تو اسے اکثر شبہ سا ہوتا کہ کوئی دبے پاؤں یہاں سے نکل گیا ہے لیکن جنات کے خوف سے وہ کانپ کانپ جاتی، ماں سے چمٹ کر لیٹ رہتی ماں بڑبڑا کر کہتی "کیا ہے ری بوٹا؟"

"ڈر لگ رہا ہے اماں!"

"چل سو جا! ——ڈر کیسا؟"

"اللہ قسم اماں ابھی ابھی کسی کے بھاری بھاری قدموں کی چاپ ہوئی تھی۔"

"کہہ دیا مردار سو جا، جنات نہ ہوویں۔"

جنات کا نام سنتے ہی اس کے ہوش اُڑ جاتے، تھر تھر کانپنے لگتی بید کی طرح۔ اسے خیال آتا جیسے ابھی ابھی ایک بڑا سا ہاتھ بڑھے گا اور اسے دبوچ لے گا۔ بس پھر کیا تھا۔ دل پتے کی طرح ہلنے لگتا اور یوں محسوس ہوتا جیسے ابھی ابھی حلق میں آکر پھنس جائے گا، اس کی گھگی بندھ جاتی۔

ڈیوڑھی کے گھٹے گھٹے ماحول میں میر صاحب کے خراٹے بلند ہوتے تو علی حسین سوتے سوتے

چونک پڑتا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ ہوتی جب محلسرا سے ملحقہ حویلی سے گانے بجانے کی آوازیں اس وقت بھی مدھم سروں میں آ رہی ہوتیں کبھی کبھی نواب صاحب کا گونجدار قہقہہ بلند ہوتا اور محلسرا کے در و دیوار کانپ کانپ اُٹھتے لحاف ہٹا کر وہ تاریک کوٹھری میں دیئے کی لو کو دیکھتا تو اس کو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے ساری فضا میں یرقان کی سی زردی پھیل گئی ہے۔ بند کواڑوں کی موٹی موٹی دراڑوں سے چاند مغرب کی طرف جاتا ہوا نظر آ رہا ہوتا مگر آج جب اس کی آنکھ کھلی تو چاند کا کہیں دور دور پتہ نہ تھا۔ رات سرد و تاریک تھی۔ میر صاحب کے بھیانک خراٹے بلند ہو رہے تھے مگر وہ اُن سے سوتے سوتے چونکا نہیں بلکہ آج تو اس کو اپنے رگ و پے میں پھوڑے کی سی ٹیس محسوس ہوئی۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ محلسرا کی ڈیوڑھی میں جاگنے والا ایک اکیلا وہ ہے اور محلسرا کے اندر جاگنے والوں میں شاید عالیہ بیگم اور ثمینہ بیگم ہوں گی۔

یوں تو وہ بچپن سے ہی عالیہ بیگم اور ثمینہ بیگم کو جانتا تھا۔ جب وہ اپنے بابا کی انگلی پکڑ کر پہلی بار منڈیلی میں داخل ہوا تھا تو انا اُسے بڑی سرکار کی خدمت میں لے کر گئی تھی۔ بڑی سرکار کس جاہ و حشم سے شہ نشیں پر گاؤ تکیہ سے لگی ہوئی تختوں کے چوکے پر مسند پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف مامائیں، کنیزیں اور خواصیں ہاتھ باندھے ادب سے کھڑی تھیں اور انا نے کہا تھا:

”لڑکے سلام کر سرکار کو!“

یہ سُن کر اس نے ڈرتے ڈرتے ننھے سے ہاتھ کو اٹھایا، ایک ذرا سا جھکا اور باریک سی آواز میں کہا:

”آداب عرض۔“

بیگم صاحبہ نے سر کے اشارے سے سلام لیا اور بولیں:

"کیا ننھے سے سن ہیں اس کی ماں اللہ کو پیاری ہو گئی"

کسی نے کہا "خیر تو ہے؟"

بولیں: "اے بی اس بچے کی ماں میرے ساتھ بچپن میں کھیلی تھی، نگوڑ ماری چلّے کے دنوں بیمار ہوئی اور جانے کیا آسیب ہوا کہ اچھی بھلی چارپائی سے جا لگی اور چٹ پٹ ہو گئی"

جانے کتنی آوازیں آئیں: "اے ہے"

"اللہ رحم کرے"

اس وقت دو بچیاں بڑی سرکار کے پہلو سے لگی بیٹھی اسے حیرت سے تک رہی تھیں ان کے گول مٹول چہرے، پھولے پھولے گال اور گول آنکھیں، چاندی کے بدن اور مبدء شہاب سی رنگت بھورے بھورے بال۔ یہ پورا ماحول کس قدر نرم اور دل آویز تھا لڑکیوں کی آنکھوں میں حیرت اور استعجاب کی چمک تھی۔

بیگم صاحبہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی چھوٹی سی اچکن کی جیب میں چاندی کے دو روپے ڈال دیئے اور رومال سے آنکھوں میں آئے ہوئے دو آنسو خشک کئے انا اسے واپس پہنچانے ڈیوڑھی تک آئی اور زینے پر کھڑی ہو کر بولی:

میر صاحب بچہ نیچے آرہا ہے اس کی جیب دیکھ لیجئے گا۔"

اگرچہ اس کے بعد پھر کبھی وہ زنانے مکان میں نہیں گیا۔ نواب صاحب کا حکم تھا کہ پانچ سال سے زیادہ عمر کا بچہ گھر میں داخل نہ ہو لیکن وہ باہر ڈیوڑھی میں صرف اس آس پہ پڑا رہا کہ جانے کب اسے محلسرا کے اندر داخلے کا پروانہ مل جائے اور وہ عالیہ بیگم اور ثمینہ بیگم کے ساتھ کھیلے کودے۔ اسی آرزو میں وہ مدرسے سے اسکول اور اب اسکول سے کالج جانے لگا۔ بچپن سے لڑکپن اور اب لڑکپن سے جوانی کی حدود میں داخل ہو گیا لیکن پھر کبھی زنان خانے میں جانے کا پروانہ

اسے نہ ملا۔ ایسا سخت پردہ کہ پرندہ بھی پر نہ مار سکے۔ عالیہ بیگم اور ثمینہ بیگم کا وہ ذکر بھی سنتا تو بڑی بٹیا اور چھوٹی بٹیا کے ناموں سے۔ نہ انہیں مدرسے بھیجا گیا اور نہ سکول اور کالج، گھر پر استانیاں آتیں پڑھا جاتیں، ایک انگریز خاتون انگریزی پڑھانے آتی تھی اور صرف دو گھنٹے پڑھانے کے پانچسو روپیہ ماہوار لیتی تھی یہ سب اس کو معلوم تھا لیکن اس نے بڑی بٹیا اور چھوٹی بٹیا کی ایک جھلک نہیں دیکھی۔

محرم آنے سے کچھ قبل محلسرا میں محرم کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ استرکاری ہوتی چونا پتوایا جاتا محلسرا میں شہ نشیں پر لگے ہوئے تختوں کے چوکوں پر سپید چاندنیاں بچھائی جاتی اور اونچے ٹانکے جاتے، سیاہ مخمل کے پٹکوں میں کناری گوٹا ٹنکا ہوتا پاڑھوں پر علم پٹکے ایستادہ ہوتے، سامنے ضریح و تعزیے رکھے جاتے جھلملاتے گنگا جمنی علم کے پنجوں پر نگاہیں نہیں ٹھہرتیں تھیں چاندی کی کشتی میں گلاب پاش اگربتی دان رکھے جاتے تعزیوں اور ضریحوں کے پس منظر میں سیاہ پٹکوں پر سپید اور سنہری زری کا کام بنا ہوتا جس سے عجب شاہانہ جلال پیدا ہو جاتا۔ شام کو کنول اور مردنگیں روشن کئے جاتے۔ جھاڑ۔ فانوس۔ ہنڈیاں، پنج شاخے، سہ شاخے اور دو شاخے روشن ہوتے اگربتیاں سلگائی جاتیں۔ گلاب پاش سے کیوڑہ گلاب چھڑکا جاتا۔ اگربتی اور گلاب کی ملی جلی خوشبو سے سارے امام باڑے کا ماحول پُراسرار بن جاتا شب میں محلے ٹولوں سے۔ بیبیاں آکر نوحے پڑھتیں اور عجیب دلگداز اور رقّت خیز فضا پیدا ہو جاتی، بڑی بوڑھیاں زور زور سے روتیں اور بین کرتی جاتیں۔

دن کو مردانی مجلس ہوتی، شہر کے رؤسا اور امراء سبز و سیاہ لباس امام حسینؑ کے سوگ میں پہن پہن کر آتے۔ اُن دنوں نواب دیوان خانے میں بیٹھنا چھوڑ دیتے۔ سیاہ انگرکھا، سیاہ چوڑی دار پاجامہ، سیاہ دو پلّی ٹوپی میں ان کی سُرخ و سفید رنگت پھوٹی نکلتی تھی۔ اس قیامت کی جامہ زیبی پر

ہر شخص کی نظر اٹھتی مجلس کا وقت ہوتے ہی میر صاحب شہ نشین کے سیاہ ریشمی پردے جو کلابتوؤں کی ڈوریوں سے بندھے ہوتے، سرکا دیتے۔ ضریح تعزیے علم تابوت شبیہ ذوالجناح، شبیہ گہوارہ علی اصغر پیش نظر ہوتے، لوگ احتراماً کھڑے ہو کر زیارت پڑھتے، میر صاحب اگربتیاں روشن کرتے۔ ذاکرِ امام حسین سیاہ سوگوار لباس زیب تن کئے ہوئے پہلے منبر کو چومتا پھر منبر پر جا کر میر انیس کی رباعیاں پڑھتا:

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

میر صاحب پورے مجمع میں سے زور سے "ہے ہے" کا نعرہ مارتے اور کہتے "سچ ہے بجا ارشاد ہے" اور پھر مرثیہ خوانی شروع ہو جاتی، واقعۂ کربلا کا نقشہ پیش ہوتا، خیر و شر کی قوتوں کی پنجہ آزمائی کا مفصل ذکر اس دل نشیں انداز میں ہوتا کہ یزید اور حسینؑ کے کردار روزِ روشن کی طرح لوگوں کے سامنے آجاتے اور مصائبِ امام مظلوم بیان ہوتے لوگ زار و قطار روتے۔ میر صاحب دھاڑیں مار مار کر روتے۔ نواب صاحب کی آنکھوں سے بھی گنگا جمنا بہتی اور وہ یہ منظر حیرت و استعجاب سے دیکھتا کہ رات گئے تک قہقہے لگانے والے نواب صاحب کیسے کیسے زار و قطار روتے اور ان کے چہرے پر کیسا حزن و ملال رہتا۔ جیسے ابھی ابھی سارے کنبے کو دفنا کر آرہے ہوں ــــــ!

میر صاحب کو ہمیشہ حسین آباد کے امام باڑے کی مجلس کی دھن لگی رہتی مجلس وہاں کون سنتا تھا ایک جم غفیر تبرک کے لالچ میں حسین آباد کے امام باڑے پہنچتا دو دو خمیری روٹیاں، سالن کا ایک ایک پیالہ، پلاؤ اور زردے کے طباق صرف دو حصوں میں دونوں باپ بیٹے شام تک

جھک جاتے۔ اس لالچ میں میر صاحب علی حسین کو لئے ہوئے حسین آباد کے امام باڑے پہنچتے۔ امام باڑے کے پھاٹک پر ہمیشہ دو سپاہی ستعدی سے بندوقیں سنبھالے کھڑے رہتے۔ اندر پہنچتے ہی نوک دق نہر نظر آتی، نہر پر پل اور دوسرے سرے پر امام باڑے کا کشادہ صحن دالان اور صحنچیاں، وسیع دالان، ور دالان کس قدر شاندار تھے اور شہ نشیں پر جھاڑ فانوس، کنول مردنگیں ہنڈیاں دو شاخہ سہ شاخہ پنج شاخہ ہر ہر رنگ و وضع کے شیشہ جات کیسے پر بہار نظر آتے۔ علی حسین کا جی چاہتا کہ وہ ان شیشوں کو چھو کر دیکھے لیکن وہ ایسا کبھی نہ کر سکا، شہ نشیں پر علم پٹکے اور پھریرے آویزاں نظر آتے۔ پہلوؤں میں قیمتی ضریحیں، تعزیئے ایک طرف موم کی بیس فٹ اونچی ضریح رکھی رہتی تو دوسری طرف باریک ابرق اور کاغذ کے بیل بوٹوں سے مرصع ضریح اور تعزیئے امام باڑے کے دونوں پہلوؤں میں دو مقبرے سپید سپید مینار اور گنبد ایک طرف چھوٹی سی خوبصورت مسجد، سبزہ زار میں، سپید سپید امام باڑا یوں نظر آتا جیسے مخمل کے فرش پر مرغابی کا انڈا رکھا ہوا ہو یا ہری کونپل پر شبنم کا قطرہ جو سورج کی کرن پڑنے سے جگمگاتا رہتا ہے لیکن محرم کی مجلسوں میں تو یہاں تل دھرنے کا ٹھکانا نہ ہوتا۔ اب جو آٹھ بجے صبح سے لنگر بٹتا تو دن کا ایک بج جاتا اور پھر کوئی ایک دروازے سے نہیں چار چار دروازوں سے۔ وہ دھکم پیل ہوتی کہ آدمی کا دم گھٹ جائے۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھالی پھینکو تو سر ہی سر جائے اتنا مجمع ہوتا۔

شہر میں بڑی بڑی مجلسیں ہوتیں۔ کپتان صاحب کی مجلس میں میر صاحب اسے ضرور لے جاتے لیکن کپتان صاحب اپنے جدی امام باڑہ "غفراں مآب" میں بارہ فٹ اونچے منبر پر بیٹھ کر خطبہ شروع کرتے تو امام باڑے کے باہر سڑک پر اور سڑک کے باہر منڈی کے نکڑ تک پر لوگوں کا مجمع ہی مجمع ہوتا۔ اس مجمع میں عورتیں مرد بچے سبھی شامل ہوتے سیاہ اور سبز لباس پہنے، منتیں زیب گلو کئے بچے امام حسینؑ کے نقیر بنے ہوئے ہاتھوں میں کڑے پہن کر چوبی ٹکڑے سے چھنا چھن بجا کر روایت

پڑھنے والے فقیر، بیاضیں، مرثیے، ماتم اور نوحوں کی کتابیں بیچنے والے کتب فروش، سبیلیں لگا کر پانی پلانے والے سقے، ننگے پیر ننگے سر ماتم کرنے والے سوگوار قمع اور زنجیروں کا ماتم کرنے والے عاشقانِ حسینؑ سب اس کو نظر آتے خطبے کی آواز سنتے ہی مجمع میں ایسا سناٹا چھا جاتا جیسے یہاں کوئی ہے ہی نہیں، اور صلواۃ کا نعرہ جب بلند ہوتا کہ جیسے یہ آوازیں آسمانوں کو چیرتی ہوئی عرش کے آخری کنگورے کو ہلا دیں گی۔

امام باڑہ آصفی، شاہ نجف اور حسین آباد میں روشنی ہوتی تو رات پر دن کا گمان گزرتا۔ علی حسین چاہتا تھا کہ وہ نہریں روشنی کے ڈوبتے ابھرتے جگنو دیر تک دیکھتا رہے کہ میر صاحب اسے گھسیٹ کر گھر لاتے اور سہرا ہرا کرتا اور ہری ٹوپی پہنا کر مشکیزے میں شربت بھر کر محسرا کے اندر منت پہنانے کے لئے لئے لے جاتے، اندر پردہ کر دیا جاتا۔ عورتیں ایک طرف پردے کے اوٹوں میں ہو جاتیں۔ میر صاحب شہ نشین پر جا کر حضرت عباسؑ کا علم سجتے اور علی حسین بچے بالوں کو اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے مشکیزے سے شربت پلاتا جاتا۔ جب میر صاحب کے ساتھ باہر آتا تو اندر خواتین نوحہ شروع کر دیتیں:

مارا گیا ہے ہے میرا غم خوار علمدار   غم خوار علمدار وفادار علمدار

ایک خاتون سعادت گنج سے بلائی جاتی تھیں جو بڑی پُردرد اور دل ہلا دینے والی آوازمیں نوحہ پڑھتیں:

لوٹ لیو بنجارہ بن ما

لوووٹ وولی لیھو

بن جا آ آ رہ بن ما

اس کو یوں محسوس ہوتا جیسے اس کا دل ابھی خون ہو کر بہہ جائے گا یا دل کی رگیں شدتِ غم

سے پھٹ جائیں گی۔ ان آوازوں میں وہ عالیہ بیگم اور ثمینہ بیگم کی آوازوں کو تلاش کرتا اور دل ہی دل میں دعائیں مانگتا کہ کاش مولا کے صدقے میں کہیں ان کی آوازیں ہی سننے کو مل جائیں۔ لیکن کہاں، وہ تو ان کی آواز کو بھی ترس گیا کہ پھر آواز تک نہ سُنی پر نہ سُنی شاید ان کی آوازوں پر بھی پہرے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر کے سونا چاہا۔ عین اسی وقت سناٹے کو چیرتی ہوئی موذن کی آواز آئی:

"اللہ اکبر اللہ اکبر"

اور میر صاحب کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ نہایت خضوع و خشوع سے نماز ادا کی دعائیں پڑھ پڑھ کر دم کرتے رہے پھر مناجات پڑھنے لگے ؎

سامانِ شتاب کر دے مرے دل کے چین کا
پروردگار واسطہ خونِ حسینؑ کا

(۲)

لو کے ایسے جھکڑ چل رہے تھے کہ آسمان گرد سے اٹا ہوا تھا اور اس کی نیلاہٹ دبیز مٹیالے رنگ میں چھپ گئی تھی۔ دھوپ کی شدت سے سڑکوں اور میدانوں میں بگولے اُٹھ رہے تھے اور فضا تونسی ہوئی تھی۔ دور دور تک آدمی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ ٹھیک دوپہر تھی۔ سورج سر پر تھا۔ تارکول کی سڑکیں پکس کر رہ گئی تھیں، ایک مریل سا گھوڑا تانگے کو کھینچتا ہانپتا ہوا آرہا تھا۔ تانگے والے کی بے ہنگم ٹخ ٹخ کی آوازیں دوپہر کے اس ماحول میں گھل مل گئیں تھیں۔ بل کھاتی اور گھومتی پھرتی سڑک سے گزرتا ہوا تانگہ منڈیلی کے صدر دروازے پر ٹھہر گیا۔ سب سے پہلے میر صاحب تانگے سے اُترے پھر اُنھوں نے ہاتھ بڑھا کر ایک ضعیف آدمی کو

تانگے سے اتارنے کے لئے سہارا دیا۔ ضعیف۔ بزرگ چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔ سپید کاکلیں، سپید داڑھی سپید پلکیں اور گلے میں لٹکی ہوئی بے شمار تسبیحیں ان کے سرخ و سپید چہرے کو پُر نور بنا رہی تھیں اُن کے پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں تھیں۔ سواریاں اُترتے ہی تانگے والے نے تانگہ نیم کے گھنے درخت کے سائے میں کھڑا کر دیا اور بالٹی لے کر تالاب سے پانی لینے کے لئے دوڑا گھوڑا ہانپ رہا تھا۔ میر صاحب اس عجیب و غریب شخص کو لئے ہوئے دیوان خانے کے دروازے پر پہنچے تو دروازے پر دستک دی گئی، دروازہ کھلا۔ میر صاحب اور پُر اسرار شخص اندر گئے اور دروازہ بند ہو گیا لیکن اندر جانے والے کی کھڑاؤں سے فرش پر کھٹ کھٹ کی آوازیں آتی رہیں اور پھر دھیرے دھیرے دور ہوتی گئیں حتیٰ کہ بالکل بند ہو گئیں۔

دیوان خانے کی بارہ دری میں بڑی نفاست سے تختوں کے چوکے پر سپید چاندنیوں کا فرش بچھا تھا۔ قرینے سے گاؤ تکیے لگے تھے۔ چھت میں پنکھا بھی لگا ہوا تھا جسے ملازم کھینچ رہا تھا اور نواب صاحب گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے تھے۔ اس وقت وہ شربتی چکن کا کرتا اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ سیاہ ٹھیکوں کی جگہ کھچڑی داڑھی سرخ و سپید رنگت کی جگہ سنولایا اور کسی قدر ستا ہوا چہرہ ان کی ضعیفی کے علاوہ ان کے دلی رنج و غم کا اظہار کر رہے تھے۔ شاہ صاحب ایک چوکی پر بیٹھے سرخ سرخ آنکھوں سے خلاؤں میں گھور رہے تھے اور ان کے سامنے لوبان سلگ رہا تھا۔ میر صاحب اس سارے منظر کو پُر اسرار نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ نواب صاحب کی طرح میر صاحب بھی بوڑھے، اور کمزور ہو گئے تھے اور نواب صاحب کا دیوان خانہ بھی شکستہ اور بے رنگ و روغن کسی بیوہ کی اُجڑی ہوئی اداس مانگ کی طرح سونا سونا اور خالی خالی سا لگتا تھا۔ اسی دیوان خانے میں نواب صاحب کبھی موسیقی کے جشن منعقد کراتے تھے اور خدا معلوم کتنے پری وش اور شعلہ رو معشوق ان محفلِ نشاط و انبساط کو شعلہ زار بناتے ہوں گے لیکن

اب شعلہ کیسا شوق کی آگ بھی سرد پڑ چکی تھی۔ راکھ میں دبی دبائی کوئی ایک آدھ چنگاری ہو تو ہو ورنہ نواب صاحب ع

صورت ہیں حالش مپرس

کی تفسیر بنے ہوئے تھے اور ان کی آنکھوں میں جیسے :

ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

لکھا ہوا تھا۔ نواب صاحب کی نگاہوں میں ویرانیاں رچی ہوئی تھیں اور قالب میں روح اس طرح گردش کرتی محسوس ہوتی تھی جیسے کسی ویران مقبرے کے وسیع گنبد میں کوئی تنہا اور اکیلی فاختہ پر پھڑپھڑا کر رہ رہ جاتی ہو۔

شاہ صاحب نے لال لال غلّہ سی آنکھیں نواب صاحب کے چہرے پر گاڑ دیں اور نواب صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنا شروع کیا تو نواب صاحب نے نگاہیں جھکالیں اور ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولے :

"اللہ الصمد!"

اور ایک بار جیسے پھر ویران مقبرے کے وسیع گنبد میں کوئی اکیلی فاختہ پھڑپھڑائی :

"اس محلسرا کی شہ نشین کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے!"

"بے شک ہے!"

نواب صاحب بولے۔ مگر میر صاحب پر جانے کیا گزری کہ اس انکشاف پر تھر تھر کانپنے لگے۔

"لیکن اس میں تو ہم لوگ آج تک نہیں گئے ـــــــ ابا جانی مرحوم نے منع کر دیا تھا کہ وہاں کبھی کوئی نہ جائے آسیب ہے اور ابا جانی کو دادا جان منع کرتے تھے۔"

"چالیس دیگیں اشرفیوں سے بھری ہوئی اس کی چھت سے لٹک رہی ہیں!"

شاہ صاحب بولے:

"اور تم کہتے ہو کہ ہم غریب ہیں ہمارے پاس پیسہ نہیں ہے قارون کے خزانے چھپا رکھے ہیں ــــــ"

میر صاحب تھر تھر کانپ رہے تھے اور شاہ صاحب اس طرح تقریر کر رہے تھے جیسے یہ سب ان کی نگاہوں کے سامنے موجود ہو ایک بار وہ پھر بنکارے:

"اگر چالیس روز کے اندر اندر دیگیں نہ نکالی گئیں تو مال پاپی ہو جائے گا۔ ہمارے موکل نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ اشرفیاں سانپوں اور بچھوؤں میں بدل جائیں گی۔"

نواب صاحب کی آنکھوں میں یکلخت چمک پیدا ہو گئی۔ اپنی جگہ سے اٹھے اور شاہ کے پاؤں پکڑ لئے "شاہ صاحب میں زندگی بھر کے لئے آپ کا حلقہ بگوش ہو جاؤں گا اور آپ کو جس قدر حاجت ہوگی مال و دولت لے لیجئے گا لیکن یہ تو بتایئے کہ انھیں برآمد کیونکر کیا جائے؟"

"اے عزیز،" شاہ صاحب نے کہا: "مجھے مال و دولت درکار نہیں۔"

"بے شک نفسِ مطمئینہ کے لئے دنیا عذاب ہے۔" نواب صاحب بولے، اور شاہ صاحب نے ہوا میں انگلی اٹھائی اور کسی طرف اشارہ کر کے بولے:

"تیری خاطر میں روزانہ دریا کی مسجد پر عمل کیا کروں گا پورے چالیسویں روز بارہ بجے رات کو تیرے پاس پہنچوں گا اور خزانہ برآمد کر دوں گا۔"

میر صاحب حواس باختہ ہو گئے۔ تین میل اُدھر سے جس شخص کو نہایت بے ضرر سمجھ کر وہ تانگے میں بٹھا کر لائے تھے وہ کیسے کیسے اسرار و رموز سے واقف تھا اور کیسے چشم زدن میں ایک خاندانی راز پر سے پردہ اٹھا دیا تھا۔ ان کو رہ رہ کر علی حسین پر غصہ آرہا تھا جس کو اس زمانے کی ہوا لگ گئی تھی کہ وہ ایسی باتوں پر ایمان ہی نہیں رکھتا تھا۔ یونیورسٹی پہنچتے ہی

اس کو ایسے پر لگے تھے کہ زمین پر پاؤں نہیں رکھتا تھا۔ کاش اس کو معلوم ہوتا کہ اس زمانے میں بھی ایسے پیر فقیر ہوتے ہیں جن کی روح میں روشنی اور دل میں نور رہوتا ہے بے شک ایسے ہی بزرگوں کے قدموں میں نجات ملتی ہے اور قلب و نظر منور ہوتے ہیں۔ مارے عقیدت کے میر صاحب کے آنسو نکل آئے، شاہ صاحب بولے:

"اے مردِ بزرگ اللہ کی یاد کے لئے حضوریٔ قلب ضروری ہے اسے کہاں تلاش کر رہا ہے، کہاں بھٹک رہا ہے۔ وہ تو تیرے ہی اندر جلوہ آرا ہے۔ اے مردِ حق آگاہ، خود آگہی، حق آگہی ہے!"

یہ سن کر میر صاحب زار و قطار رونے لگے اور بے تحاشا شاہ صاحب کے قدموں پر گر پڑے اور اب صورت یہ تھی کہ میر صاحب اور نواب صاحب دونوں شاہ صاحب کے قدموں میں پڑے ہوئے تھے اور پنکھا کھینچنے والا ملازم ہکا بکا یہ منظر دیکھ رہا تھا غالباً اس کے پیٹ میں چوہے کود رہے تھے کہ کب یہاں سے چھٹی ملے اور کب وہ دوڑتا ہوا جا کر اللہ رکھے کو یہ بتائے کہ تہہ خانے میں خزانہ ہے، اتنا بڑا خزانہ کہ اسے سن کر تیری چھاتی پھٹ جائے ــــ

اندر سے ایک ملازمہ دوڑتی ہوئی آئی اور یہ منظر دیکھ کر ٹھٹکی پھر اس کو کچھ خیال آیا چیخ کر بولی۔

سرکار نواب صاحب، نواب صاحب غضب ہو گیا" اور میر صاحب اور نواب صاحب اٹھ بیٹھے۔

"کیا ہوا؟"

"بڑی بٹیا کو غش آ گیا!"

"کیسے ؟" میر صاحب بولے۔

"پتہ نہیں کوٹھے پر سیر کر رہی تھیں، نہا کر اٹھی تھیں بال کھلے ہوئے تھے کہیں کوئی آسیب۔!"

نواب صاحب تیر کی طرح اندر چلے گئے، محلسرا میں کہرام پڑا ہوا تھا بیبیاں ماتم کر رہی تھیں:

اے کل کے مددگار مدد کرنے کو آؤ

بٹیا کو بچاؤ

کچھ عورتیں قرآن کی ہوا دے رہی تھیں کچھ چہل کنجی کا کٹورا دھو دھو کر اس کا پانی چہرے پر چھڑک رہی تھیں۔ بیگم صاحبہ اپنے زانوؤں پر لڑکی کا سر رکھے ہوئے تھیں اور بس روے چلی جا رہی تھیں۔ عالیہ بیگم کے دانت بھنچے ہوئے تھے اناکی لڑکی بوٹا اور ثمینہ بیگم صحن میں کھڑی زار و قطار رو رہی تھیں انا تلوے سہلا رہی تھی اور گھبرا گھبرا کر دعائیں مانگتی جاتی تھی۔

"اے مشکلکشا علیؑ، اے پیر دستگیر مدد کو پہنچئے میر بٹیا کو بچائیے"

"ہے ہے کس کی نظر لگ گئی، دور پار، تھو تھو بھٹ نظر، کس کو کھ جلی نے میری شیرنی کو ہونس دیا صدقے میں آتار دوں اُسے"

عالیہ بیگم کی گھٹی گھٹی سی آوازیں بلند ہو رہی تھیں گھٹی سی آوازوں میں وہ "ہوں ہوں آآ آئے ئے" چیخ رہی تھیں جسم نڈھال پڑا تھا ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑے تھے اور آنکھیں بند تھیں۔ نواب صاحب بولے:

"بھئی ذرا ہوا بھی تو آنے دو اتنے لوگوں نے گھیر لیا ہے" اور پھر بولے: "بی بی بٹیا" سر پر ہاتھ پھیرا ماتھے پر گال رکھ دیا اور عالیہ بیگم نے دونوں ہاتھ بلند کر کے باپ کے گلے میں بانہیں حمائل کر دیں اور زور زور سے رونا شروع کر دیا جیسے رخصت ہو کر دولہا کے گھر جاتے ہوئے عموماً لڑکیاں بابل سُن کر روتی ہیں۔ باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے اور

بیگم صاحبہ کی ہچکیاں اُلٹ گئیں اَنّا اور بھی زور زور سے رونے لگی۔ ثمینہ بیگم دھڑام سے مسہری پر گری اور تکیے میں منہ دے کر رونے لگی:

"باجی۔ ہائے میری باجی۔"

اور بوٹا وہیں زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی اس نے یہ بھی خیال نہیں کیا کہ ابھی اس کے ہاتھوں کی مہندی بھی میلی نہیں ہوئی تھی اور چوتھی کا جوڑا عطر میں جوں کا توں بسا ہوا تھا زمین پر بیٹھنے سے لباس خراب نہ ہو جائے اور اللہ رکھے اس پر غصہ نہ کرے کہ:

"میری رانی ابھی تک مٹی سے کھیلتی ہے۔"

بس اس کا تو سارا دھیان عالیہ بیگم میں تھا وہ عالیہ بیگم جو بڑی خاموش معصوم اور خوبصورت تھیں جن کی بڑی بڑی غلافی آنکھوں سے اسے ڈر لگتا تھا اور وہ ہمیشہ اپنی ماں سے کہا کرتی تھی:

بڑی بٹیا کی آنکھوں میں ضرور کچھ ہے۔"

اور انا ڈانٹ کر کہتی:

"کیا ہے موئی تجھے کیا دکھائی دیتا ہے ہف نظر تھو تھو۔"

"کسی جن کا سایہ ہے اماں، جبھی تو جب وہ اپنی لال لال آنکھوں سے دیکھتی ہیں تو لگتا ہے کہ کسی نے نشہ سا پلا دیا ہے۔"

"دور موئی اپنی للو سنبھال کسی نے سن لیا تو ماری جائے گی۔"

"سچ اماں ذرا غور سے دیکھیو۔"

پھر جب اس کی شادی اللہ رکھے سے ہوئی اور اس نے اللہ رکھے سے یہ بات کہی تو وہ زور سے ہنسا اور بولا:

"میری رانی! عورت جات جب جوان ہو تو سادی کر دینا چاہیئے بس ـــــ ہاں نہیں تو ـــــ نہیں تو ـــــ"

"ہاں نہیں تو" اس نے پوچھا "اگر نہ ہو تو؟"

"نہیں تو بُری عورت ہو تو کھراب ہو جاتی ہے نیک ہوتی ہے تو گیلی لکڑی کی طرح سلگتی رہتی ہے اور پھر اپنی جان کو کوئی روگ لگا لیتی ہے۔"

"ہائے میرے اللہ کہیں بڑی بٹیا نے کوئی روگ نہ لگا لیا ہو۔"

اور آج اس نے دیکھا کہ بڑی بٹیا بیہوش پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے جی میں کئی بار یہ آئی کہ یہ بات سب کو بتا دے پر وہ کچھ کہہ نہ سکی کیسی لاج کی بات تھی توبہ توبہ ـــــ اور بڑی بٹیا نواب صاحب کے گلے میں بانہیں ڈالے سسکیاں لے لے کر روئے چلی جا رہی تھیں۔ اندر اس قدر شور جو ہوا تو منڈلی کے باہر لوگ خیریت پوچھنے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ محلے ٹولے کی عورتیں اندر آئی ہوئی تھیں اسی ہڑبونگ میں علی حسین سوتے سے اٹھ بیٹھا اور ایک طویل انگڑائی لی، پھر جمائی روکنے کے لئے ہاتھ منہ تک لے گیا ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا ننھو سقہ جو نظر آیا تو اس نے پوچھا۔

"کیا بات ہے ننھو چچا، کیسا شور ہے؟"

اور ننھو چچا نے انگلی کے اشارے سے لاعلمی کا اظہار کیا تو رحمن کہار خالص پوربی لہجے میں بولا:

بھیتر مار ہلا ہو وت ہے مہراروں ما، گھورائی گھورائی کے گلا پرائے لاگا، ہمری تو اُو ہونا ہی سُننت نہے۔ بھیا! ہم تو ماجج ہوئی گیئن۔"

ٹھیک بارہ بجے رات کے بارہ بجے جب فضا میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور تیرگی بخت سیاہ کی طرح منڈلی کو پیٹے ہوئے تھی کہ شاہ صاحب سینٹل پاٹی سے اُٹھے۔ دیوان خانے میں میر صاحب اور نواب صاحب جو دونوں ایک چوکی پر بیٹھے ہوئے بار بار شاہ صاحب کے جلال و جمال کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایک دم اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ شاہ صاحب کے ہاتھ میں ایک لمبی سی تسبیح تھی اور زرد کفنی میں ان کا جسم لپٹا ہوا تھا۔ کافور اور اگر سے فضا بڑی پر اسرار بنی ہوئی تھی موم شمعیں روشن تھیں جن سے دیوان خانہ جگر جگر کر رہا تھا۔ میر صاحب نے کانپتے ہوئے شاہ صاحب کے سامنے لکڑی کی کھونٹی دار کھڑاویں رکھ دیں شمع کا کنول ہاتھ میں لیا اور دیوان خانے سے متصل ایک نشیبی زینے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ شاہ صاحب کی کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ یوں فضا میں بلند ہوئی جیسے کوئی زمین پر نہیں چھاتیوں کے اندر دھڑکتے ہوئے دلوں پر سے گزر رہا ہو۔ نواب صاحب نے بڑی سی کنجی ہاتھ میں لی کسی نے کسی سے کوئی بات نہ کی کھٹ کھٹ۔ کھٹ شاہ صاحب آہستہ آہستہ نشیبی سیڑھیاں طے کر کے اس برج نما تہہ خانے کے دروازے پر پہنچے جہاں برسوں سے ایک بھاری بھرکم قفل پڑا ہوا تھا۔ نواب صاحب نے کنجی قفل میں گھمائی میر صاحب نے شمع کا کنول تالے پر دکھایا قفل کھلا اور شاہ صاحب نے دروازہ کھولا۔ بسم اللہ کہہ کر قدم اندر رکھا اور میر صاحب کے ہاتھوں سے کنول لے کر اندر چلے گئے۔ چند لمحوں تک کوئی آواز نہیں آئی پھر دھیرے دھیرے شاہ صاحب کے قدموں کے لوٹنے کی آواز آئی دروازے پر پہنچ کر شاہ صاحب نے نواب صاحب کو اشارہ کیا۔ شاہ صاحب کے اشارے پر نواب صاحب اور میر صاحب دونوں نے قدم اٹھائے تو شاہ صاحب نے خشمگیں نگاہوں سے میر صاحب کو گھورا، ہاتھ کے اشارے سے روکا اور نواب صاحب کو لے کر اندر چلے گئے۔

میر صاحب تا دیر وہاں کھڑے رہے جب کوئی آواز نہ آئی اور ٹہل ٹہل کر صبح ہو گئی اذان

ہوئی نمازِ فجر پڑھی پھر بھی کوئی آواز نہ آئی تو میر صاحب کا ماتھا ٹھنکا۔ بسم اللہ کہہ کر دروازہ کھولا زینے پر قدم رکھا تو اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ اس قدر گھٹن اور گرمی تھی کہ جی گھبرا گیا الٹے پاؤں واپس آ گئے۔ لیکن راز کیسے کھلتا کہ نواب صاحب اور شاہ صاحب دونوں غائب تھے۔ ـــ!!

دوسرے دن سارے شہر میں تہلکہ پڑ گیا چار و ناچار پولیس کو اطلاع دی گئی چند عمائد شہر کی موجودگی میں تہہ خانہ کا دروازہ توڑا گیا تو نواب صاحب اور شاہ صاحب کی لاشیں برآمد ہوئیں سرکاری طور پر لاشوں کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو پتہ چلا کہ روشنی اور ہوا کے نہ ہونے اور تہہ خانے میں گھٹن کے سبب دونوں کی موت واقع ہو گئی لیکن دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح میر صاحب نے بھی یہی خیال کیا کہ عمل الٹ گیا اور اسی وجہ سے دونوں قہرِ الٰہی کا شکار ہو گئے۔ محلسرا کے اندر اور باہر وہ کہرام مچا کہ بیان سے باہر ہے۔ جب یہ قیامت گزر گئی اور چند روز کے بعد میر صاحب نے پس پردہ جا کر چپکے سے کہا:

"سرکار میں نہ مانوں ـــ شاہ صاحب۔ تھے بڑے پہنچے ہوئے تہہ خانے میں اشرفیوں کی دیگیں نکلیں پر نکلیں۔"

بیگم صاحبہ نے خفیہ طور پر اس مشن کو جاری رکھنے کی ہدایت میر صاحب کو دے دی مگر میر صاحب کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس معاملے کو اکیلے ہاتھ میں لیں۔ دو دو موتیں ان کے دیکھتے ہی دیکھتے واقع ہو گئی تھیں۔ میر صاحب کو یقینِ کامل تھا کہ وظیفہ الٹ گیا۔ غرضیکہ چند معتمد مزدوروں کو بلا کر راتوں رات تہہ خانے کے روزن کھلوائے گئے تاکہ روشنی اور ہوا پہنچ سکے اور دوسرے روز دن کے وقت میر صاحب بہ نفس نفیس تہہ خانے میں داخل ہوئے۔ نہایت عالی شان تہہ خانہ بنا ہوا تھا لیکن دیگوں کے نام پر کوئی ہنڈیا تک برآمد نہ ہوئی۔ میر صاحب نے جب یہ اطلاع اندر پہنچی تو بیگم صاحبہ بہ نفسِ نفیس صورت حال کا ملاحظہ کرنے چند خواصوں کے ہمراہ اندر تشریف

ر گئیں اور بے نیل و مرام واپس ہوئیں۔

جس طرح خزاں کے پتے اڑتے پھرتے ہیں یوسف علی خاں کی موت کے بعد مندیلی اسی طرح اجڑ گئی اور اس کے مکین تتر بتر ہونے لگے۔ میر صاحب بھی علی حسین کو لے کر پاکستان روانہ ہو گئے اور کراچی میں آباد ہو گئے۔ علی حسین نے پہلے تو ایک کالج میں لکچررشپ سنبھالی لیکن جلد ہی اسے یوں محسوس ہوا کہ زندگی کا ڈھرا یہاں کچھ بدلا ہوا ہے۔ نوکری کرتے کرتے آدمی مر بھی جائے تو حاصل کچھ نہیں ہوگا کچھ اور کرنا چاہیے۔ میر صاحب بھی خالی پڑے پڑے کیا کرتے سمندر کے قریب منوڑہ میں تو رہتے ہی تھے ذرا ٹہلتے ہوئے گودی میں لگے ہوئے جہازوں کی سیر کو نکل جاتے۔ جہاز آتے رہتے اور جاتے رہتے۔ مال آتا رہتا اور جاتا رہتا دیکھتے دیکھتے لاکھوں اور کروڑوں کے وارے نیارے ہو جاتے معلوم نہیں ایک میمن سیٹھ پر میر صاحب نے اپنی جادو بھری زبان کا کیسا سحر کیا کہ وہ میر صاحب کا کلمہ پڑھنے لگا آدمی میر صاحب شریف اور دیانتدار تھے پہلے تو سیٹھ نے آزمانے کے لئے چند سینکڑے میر صاحب کی تحویل میں دیئے، پھر ہزاروں تک نوبت پہنچی اور جب کوڑی بھر فرق نہیں پڑا تو سیٹھ نے لاکھوں کا کاروبار میر صاحب کے ہاتھ حوالے کر کے یورپ کی راہ لی۔ ادھر علی حسین نے جو ذرا غور کیا تو میر صاحب کے ہاتھ میں سیٹھ کو سونے کی چڑیا کی طرح پایا، اب تو اس نے خود بھی میر صاحب کے کاروبار میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے اللہ نے وہ برکت دی کہ میر صاحب نے پہلے تو سوسائٹی میں زمین خریدی پھر اس پر کئی لاکھ کی عمارت بنوا دی۔ بہت بڑا دفتر بنا علی حسین نے اس دفتر میں ایر کنڈیشنر لگوائے چاق و چوبند عملہ نوکر رکھا اور مچھلی کا کاروبار سمندری جہازوں کے ذریعے ملکوں ملکوں پھیلا دیا کئی کئی گاڑیاں لی گئیں میر صاحب بڑی شان سے گاڑی پر ہوا خوری کے لئے نکلا کرتے تھے۔ اس وقت وہ نواب صاحب کی مندیلی اور نواب صاحب

کی ٹم ٹم کو یاد کرتے اور جی میں ہنستے کہ عجب زمانہ تھا کہ ذراسی دولت کو کیا سے کیا سمجھ لیا تھا سب نے، دیکھتے دیکھتے چند سال میں یہاں اللہ نے وہ کچھ دے دیا تھا کہ نواب کو ان کے علاقے سمیت کئی بار خرید کر میر صاحب چھوڑ سکتے تھے۔ جب کبھی میر صاحب سمندر میں کھڑے ہوئے جہاز پر اپنا مال بار کراتے تو ان کو خیال آتا کہ نواب صاحب اور اُن کی کل کائنات گویا ایک چھوٹے سے کنویں کے مانند تھی جسے نادانستگی میں ہم سمندر سمجھتے تھے وہ وہ تہہ خانہ اور اس کی فرضی دولت کی طلسماتی کہانیاں بھی کیسی حماقت آمیز تھیں اصل اور حقیقی دولت یہ سمندر ہے جو دنیا کے تین چوتھائی حصے پر پھیلا ہوا ہے، تا حد نگاہ دیکھو تو پانی ہی پانی حتیٰ کہ دور آسمان اور سمندر کا افق مل جاتا ہے۔ پانی کی چادریں اُٹھتی مچلتی دوڑتی ہوئی ساحل تک آتیں اور لوٹ لوٹ جاتیں۔

میر صاحب محرم میں کبھی کبھار کھارادر یا مارٹن روڈ کے کسی امام باڑے میں مجلس میں شرکت کے لئے جاتے تو انھیں یہ ملحوظ رہتا کہ ان کا لباس اُن کی کار اُن کی کوٹھی اور ان کی دولت کی زیادہ سے زیادہ لوگوں پر دھاک جم جائے۔ وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے لوگوں کو اپنے گھر پکڑ پکڑ کر لاتے جنھوں نے کبھی ان کو نواب صاحب کی منڈیلی پر ڈیوڑھی میں پڑے ہوئے دیکھا تھا لوگ واقعی دیکھتے تو بے چارے حیران و پریشان رہ جاتے ایک سے دوسرے تک میر صاحب کی امارت کی داستان منتقل ہو جاتی لیکن میر صاحب خود جسے آل مجلس کہا کرتے تھے اور مظلوم امام کے مصائب پر زار و قطار روتے تھے اب بے تکلف رونے پر آمادہ ہوتے تھے۔

علی حسین شہر کے اونچے طبقے میں اٹھتا تھا بزار با غیر ملکی رنگین مزاج لوگوں سے اس کا بات کی بات میں یارانہ گٹھ جاتا تھا۔ امرا و روسا کے ساتھ بیٹھ کر اچھی سے اچھی شراب پینا، سیاست اور تجارت پر گفتگو کرنا اس کے محبوب مشاغل تھے۔ ملک میں بیٹھے بیٹھے جی گھبرا جاتا تو کاروبار کے بہانے

یورپ کے ملکوں میں سیر سپاٹے کی غرض سے نکل کھڑا ہوتا۔ شبینہ کلبوں، بارز (BARS) اور بال روموں سے جی بھر جاتا تو وطن واپس آجاتا اور باپ پر اپنی قابلیت اور محنت کی دھاک بٹھانے کے لئے اپنے نام نہاد ٹور کو کامیاب قرار دیتا جسے باپ سمجھ بوجھ کر بھی نظر انداز کر دیا کرتے۔ اس طرح باپ بیٹے مزے سے اطمینان کی زندگی گزار رہے تھے کہ ناگاہ میر صاحب نے علی حسین کو ہمراہ لے کر لکھنؤ جانے کا پروگرام بنایا علی حسین کو مطلقاً لکھنؤ سے دلچسپی نہیں رہ گئی تھی لیکن میر صاحب مصر تھے کہ علی حسین لکھنؤ ضرور چلے، میر صاحب کے ذہن میں دراصل منصوبہ یہ تھا کہ کسی طرح علی حسین کی شادی عالیہ بیگم یا ثمینہ بیگم سے کی جائے کیونکہ ظاہر ہے کہ اب میر صاحب نہ صرف امیر تھے بلکہ کروڑپتی تھے اور نواب مرحوم کے پس ماندہ خاندان پر وہ اس سے زیادہ احسان اور کیا کر سکتے تھے کہ ان کی بیٹی سے علی حسین کی شادی کر دیں۔ میر صاحب نے ہزاروں روپیہ زرمبادلہ کے طور پر تاجروں کے ذریعے بالا ہی بالا ہندوستان پہنچوایا اور پھر ایک روز کراچی سے بمبئی پی آئی اے (P.I.A) کے ذریعے پہنچ گئے۔ مطلوبہ رقم مقامی سیٹھوں سے بٹور کر بمبئی سے اڑے تو سیدھے لکھنؤ جا پہنچے، کارلٹن ہوٹل میں ٹھہرے اور اسی شام کو علی حسین کو لے کر سیدھے نواب صاحب کی سندیلی پہنچ گئے۔

شام کا وقت، جاڑے کی آمد آمد کا زمانہ آہستہ آہستہ روشنی غائب ہو رہی تھی اور دودھیالی تاریکی رفتہ رفتہ تمام چیزوں پر مسلط ہوتی جا رہی تھی۔ لمبے لمبے پام کے درخت گم ہوتی ہوئی روشنی میں بڑے بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ سندیلی کے چار منزلہ کلس پر شفق کی سنہری مائل سرخی بہار دکھا رہی تھی۔ اللہ رکھے اسی وقت تانگے میں گھوڑا جوت کر نکلا تھا۔ میر صاحب نے ٹیکسی رکوا کر زوروں سے پکارا:

"اللہ رکھے —— ارے میاں سننا اے اللہ رکھے"

اللہ رکھے نے تانگہ روک کر ٹیکسی میں بیٹھے دو آدمیوں کو جو دیکھا تو بہت سٹپٹایا کہ یہ دو صاحب

لوگ اس کے جاننے والے کہاں سے نکل آئے۔ تانگے سے اتر کر قریب آیا میر صاحب اور علی حسین کو دیکھا لیکن پہچان نہ سکا میر صاحب بولے :

"ارے میاں، میں ہوں میر علی حسن اور یہ ہے میرا بیٹا علی حسین !"

"ارے آپ میر صاحب !" اللہ رکھے نے چلا کر کہا "مجاج شریپھ، سلام مالیکم علی حسین بھیا آؤ آؤ" وہ بے تحاشا دونوں سے چمٹ گیا اور پھر مندبلی کی ڈیوڑھی پر کھڑے ہو کر چلایا :

"میر صاحب آئے ہیں !"

پھر خود ہی میر صاحب سے بولا :

"نواب صاحب کیا مرے کہ سب کچھ ختم ہو گیا سب چلے گئے ——— تم بھی گئے !"

علی حسین جو اب تک چپ چاپ تھا بولا :

"اللہ رکھے تم اب بھی تانگہ چلاتے ہو ؟ !"

اللہ رکھے ہنسا اور بولا :

"اور کا کریں بھیا تانگہ نہ چلائیں تو کھائیں کہاں سے لمبا کنبہ ہے۔" جیسے اس کا مطلب یہ تھا وہ تانگہ نہ چلائے کیا ہوائی جہاز اڑائے۔

علی حسین نے مندبلی کی اس ڈیوڑھی کو دیکھا جہاں زندگی کے کئی سال گزارے تھے۔ اسے وحشت سی ہونے لگی۔ اللہ اللہ جانوروں کی طرح کتنے سال گزار دیے اور پھر ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں کو دیکھا جو بدستور موجود تھیں اور ان پر ویسی ہی سیلی سیلی سی مانوس تاریکی تھی اتنا کی اوپر سے آواز آئی :

"پردہ ہو رہا ہے۔"

اُف، علی حسین نے سوچا، ہم پھر کئی صدیوں پیچھے چھلانگ لگا کر آگئے ہیں۔ کہاں یورپ کے صنعتی ملکوں کے خوبصورت خوبصورت شہر، ان کی سڑکیں عمارتیں اور صحت مند حسین عورتیں اور

کہاں لکھنؤ کا یہ بوسیدہ اور فرسودہ ماحول:

"بابا" اس نے گھبرا کر باپ سے کہا: "چلئے یہاں سے ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔"

"میر صاحب کچھ بولے نہیں صرف اسے گھور کر دیکھا، اس وقت بڑی دلدوز آواز میں کوئی فقیر گاتا ہوا آنکلا پہلے تو اس نے تان کھینچی:

"من ماں راکھوں من جرے کہوں تو مکھ جر جائے
گونگے کا سپنا بھیو، سوچ سوچ بورائے"

اور پھر ایک تارے پر گانے لگا ؎

کیا لیلا ہے بھگوان تری سنسار میں
جیتی بازی ہاری ہم نے پیار میں
کیا لیلا ہے بھگوان تری سنسار میں

میر صاحب بولے:

"بڑا درد ہے آواز میں۔"

اللہ رکھے ہنسا اور بولا:

"یہ تو وہی بامن ہے میر صاحب، اندھا ہو گیا ہے بے چارہ تو بھیک مانگتا ہے اب"

"اچھا؟" علی حسین بولا: "وہی جو یہاں......"

"ہاں ہاں بھیا وہی جو یہاں آیا کرتا تھا نا"

میر صاحب تڑپ کر باہر آگئے، اور زوروں سے پکارے

"ارے پنڈت جی ——— او بھائی بامن۔"

اندھا فقیر گانا گاتے گاتے رک گیا "کوئی پکار رہا ہے مجھے؟"

"ہاں ہاں ــــ میں ہوں ــــ میں میر علی حسن۔"

"میر صاحب" باممن بے نور آنکھوں کو جھپکا کر اور لکڑی کو تیزی سے زمین پر مار کر آگے بڑھتے ہوئے بولا:

"تم؟"

میر صاحب اس کے قریب پہنچ گئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تو بامن نے ہاتھ بڑھا کر خود بھی میر صاحب کو ٹٹولا، پھر اُن کے قیمتی سوٹ پر اُس کا ہاتھ جو پھسلا تو وہ ٹھٹک گیا ہاتھ ایک دم پھسل کر گر گیا۔ بے نور آنکھوں میں جو چمک پیدا ہوئی تھی وہ معدوم ہوگئی اور وہ بولا "تم"۔

میر صاحب اپنے جوش کو قابو میں لاتے ہوئے بولے "ہاں ہاں یہ میں ہوں"
اور پھر اس کا ہاتھ اپنے لڑکے کے کندھے پر رکھتے ہوئے بولے:

اور یہ ہے علی حسین میرا بیٹا ــــ بامن جی اب ہم سچ مچ کر وڑپتی بن گئے ہیں۔ تمہارا حساب کتنا سچا تھا۔

وہیں زمین پر بیٹھتے ہوئے بامن بولا:

"دیکھ لیجو سری دتیا کا کہن رہا ہیں ہم' کہ تمرے بتوا کیبر ماتھے پر دو تیج ہے وہ تیج ہے جو کیول راجون سمراٹھوان کے ہووت ہے۔"

میر صاحب بولے:

"سو بھیا سو فیصدی ٹھیک نکلا۔"

جیب سے ایک سو کا نوٹ نکال کر بامن کے دونوں ہاتھ پکڑ کر میر صاحب نے کہا:

"پنڈت جی یہ رکھ لو۔"

بامن نے پہلے تو نوٹ کو خوب اچھی طرح ہاتھوں سے مسا، وسلا پھر بولا :

"یہ کا ہے ؟"

میر صاحب بولے :

"نوٹ !!" اللہ رکھے جس کی آنکھیں سو کا نوٹ دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں تھیں بولا :

"ارے سو کا نوٹ ہے سو کا پورے ایک سو کا پنڈت جی جاؤ مجھے اڑاؤ یار ـــ کیا یاد

کرو گے کہ کس رئیس سے پالا پڑا تھا"

پنڈت نے نوٹ کو چوما، پیار کیا، ماتھے سے لگایا اور اپنی مرزئی میں رکھنے لگا، پھر کچھ

سوچ کر اُس کا ہاتھ رک گیا بولا :

"کہاں رہت ہو میر صاحب ہم سُنت راہیں کہ پاکستان چلے گیو ؟"

"ہاں ہاں" میر صاحب بولے "میں کراچی میں ہوں"

پنڈت آگے بڑھا اور نوٹ میر صاحب کی طرف بڑھا کر بولا :

"یو ہم ناہیں لیبیے" (یہ ہم نہیں لیں گے)

"کیوں ؟" ایک دم سے علی حسین نے پوچھا۔

"بات یو ہے" وہ بولا "کہ سو روپیہ بہوت ہووت ہیں ـــ یو ہم کا کریں، ہم کا ایک

روپیہ دیدیو"

"ارے پنڈت یہ ایک ہی روپیہ ہے"

وہ بولا "ناہیں ہم ناہیں لیبیے" (نہیں ہم نہیں لیں گے)

اس مرتبہ اللہ رکھے کو غصہ آگیا وہ بولا :

"کیا بات ہے بامن جی"

پنڈت بولا:

بات یو ہے کہ ہم اِدھر روج روج آوت ہیں کچھ بھکشا مل جاوت ہے اور سب کی آوجیں سن لیوت ہیں اور،" اُس نے زمین پہ زور سے لکڑی کو پٹک کر کہا۔

"یو جو دھرتی ہے اپنی' اس سے ناطہ ناہیں ٹوٹت ہے یدی ہم سو روپیہ لے لیھن پھر کا ہو گا —— پھر ہم اِدھر ناہیں آ سکت ہیں۔ میر صاحب تم ہمکا ایک روپیہ دیدیو تو ہم یہ ناہیں لیبھے۔"

علی حسین نے دانت بھینچ کر زیر زبان پنڈت کو کچھ کہا اور بڑبڑایا لیکن میر صاحب نے سو کا نوٹ رکھ لیا اور ایک روپیہ اُسے دے دیا۔ پنڈت نے ہزاروں دعائیں دیں، اوپر سے انا کی بوڑھی آواز آئی:

"پردہ ہو گیا ہے!"

پنڈت دعائیں دے کر تو اُدھر اور اِدھر میر صاحب علی حسین کو لے کر اوپر پہنچے۔ دو کرسیاں دھری تھیں۔ اللہ رکھے نے کہا:

"میر صاحب آ گئے ہیں۔"

میر صاحب نے جھک کر کہا:

"تسلیم عرض کرتا ہوں"

علی حسین کو بُرا تو بہت لگا لیکن اُس نے بھی آداب کیا۔ میر صاحب پر تو پنڈت کی بات کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ ذہنی طور پہ غیر حاضر سے ہو رہے تھے۔ انا نے کہا:

"بڑی سرکار آداب قبول فرماتی ہیں —— اور کہتی ہیں کہ ہماری ڈیوڑھی ویران کر گئے —— آپ سے تو ایسی امید نہ تھی۔"

علی حسین یہ سوچ رہا تھا کہ کاش ایک بار صرف ایک بار وہ عالیہ بیگم اور ثمینہ بیگم کی جھلک دیکھ لے اسے بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید اس بار انھیں وہ ضرور دیکھ سکے گا۔ شاید ان میں سے کسی کے ساتھ شاید ......!!

میر صاحب کہہ رہے تھے :

کیا عرض کروں بڑی سرکار ـــ بس لڑکے کے مستقبل کے خیال سے جانا پڑا بحمداللہ اللہ اللہ نے بہت کچھ دیا ہے ـــ بہت کچھ۔ آپ تشریف لے چلیں تو سب کچھ آپ کے قدموں میں ڈالدوں گا اور زندگی بھر خدمت کروں گا۔"

انا نے تھوڑی دیر بعد کہا :

بڑی سرکار فرماتی ہیں اللہ مبارک کرے ـــ اگر کبھی کربلا جانا ہوا تو ضرور کراچی آئیں گے لیکن مستقل طور پر جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔

میر صاحب نے اشارے کنائے میں بہت کچھ کہا اور علی حسین نے اس روایت پرستی پر سخت کرب محسوس کیا کئی بار اس کا جی چاہا کہ یہ حجابات اٹھا دے اور سیدھا منہ اٹھائے ہوئے اندر چلا جائے لیکن یہ ممکن نہ تھا ـــ یہ بھلا کہاں ممکن تھا کچھ دیر کے بعد میر صاحب نے رومال میں دس ہزار روپئے کے نوٹ باندھ کر بیگم صاحبہ کو یہ کہہ کر بھجوائے :

"سرکار کراچی سے کوئی تحفہ نہ لا سکا بڑی بٹیا اور چھوٹی بٹیا کے لئے کچھ منگوا کر دیدیجئے گا۔"

بیگم صاحبہ نے تحفہ قبول کر لیا اور میر صاحب سمجھے کہ اب میدان ہموار ہو رہا ہے۔ رشتے کی بات پکی ہو جائے گی۔ دوسرے روز دن کے کھانے پر میر صاحب اور علی حسین کو مدعو کیا گیا۔ علی حسین دل میں شوقِ دید اور میر صاحب رشتہ کی امید لے کر پہنچے، پر تکلف دعوت کے بعد ایک کشتی میں ایک قیمتی مگر پرانا دوشالہ انا نے لا کر رکھ دیا اور کہا بیگم صاحبہ نے عنایت فرمایا ہے۔

میر صاحب جھک کر تسلیم بجا لائے۔ پھر ایک دوسری کشتی میں ایک رومال اور ایک گنگا جمنی خاصدان لایا گیا۔ انا نے کہا:

"بیگم صاحبہ فرماتی ہیں کہ علی حسین کی دلہن کو ہماری طرف سے یہ تحفہ پیش کیجئے گا۔"

میر صاحب نے دیکھا تو دس ہزار کے وہی نوٹ تھے اور ان پر ایک گنی بھی رکھی ہوئی تھی یہ دیکھ کر میر صاحب کا دل بجھ سا گیا کہ منڈیلی اتنا بڑا قلعہ ہے جسے مسخر کرنے کے لئے دولت کی نہیں کسی اور شئے کی ضرورت ہے اور وہ شئے اُن کے پاس نہیں ہے شاید وہ ان کے پاس آ بھی نہیں سکتی۔ اس منڈیلی میں ان کی حیثیت آج بھی وہی ہے جو رذیل تھی۔ آخری سلام کر کے دونوں باپ بیٹے منڈیلی پر الوداعی نگاہ ڈالتے ہوئے باہر نکلے۔ علی حسین نے منڈیلی کی کھڑکی پر نگاہ حسرت ڈالی خستہ اور پرانی کھڑکی کا پردہ کسی نے فوراً برابر کر دیا۔ دونوں باپ بیٹے ٹیکسی میں آ بیٹھے۔ اسی وقت اللہ رکھے کے گانے کی آواز کانوں میں آنے لگی ؎

میری عمر ساری گجر گئی بالکھ تمہارے کھیال میں
میری عمر ساری .....

ٹیکسی اسٹارٹ ہوئی اور عین اسی وقت علی حسین نے منڈیلی کے اوپر جھروکے میں کسی سیم تن کا سایہ دیکھا جو پھر ایک بار جلد ہی نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ میر صاحب کو محسوس ہوا کہ جیسے منڈیلی کا سر فخر سے اور بلند ہو گیا ہے۔

قوم

سنا کہ معاہدۂ شملہ کی رو سے ہندوستان کے چند صحافی پاکستان پہنچ رہے ہیں۔ ان صحافیوں میں شانتی کا نام بھی شامل تھا۔ یقیناً آپ شانتی کو نہیں جانتے۔ سب سے پہلے تو آپ کو یہ بتا دوں کہ شانتی کسی عورت کا نہیں مرد کا نام ہے۔ دوسرے یہ عرض کر دوں کہ شانتی سروپ کھنّا میرا ہم جماعت ہے۔ فطری طور پر اس کی آمد کی اطلاع سے مجھے خوشی حاصل ہونا چاہیے تھی۔ شاید مجھے یہ خوشی حاصل بھی ہوتی۔ اگر اس کی آمد کا پس منظر اس قدر تلخ نہ ہوتا۔ پھر بھی دل میں نرم نرم گدگدی کا احساس سا جاگ رہا تھا۔ ماضی سے کسے پیار نہیں ہوتا پھر جب کہ ماضی معصوم بچپن کے دور سے عبارت ہو تو اور بھی پیارا لگنے لگتا ہے۔ شانتی بھی میرے معصوم ماضی کا حصہ تھا۔ میرا ہم سبق اور ہم جماعت تھا۔ ہم نے زندگی کا ایک دور ساتھ گزارا تھا۔ بھلا ہم ایک دوسرے کو اس قدر جلد کیسے بھول سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ادھر وہ کراچی میں داخل ہوا اور ادھر اس نے مجھے تار دے کر اطلاع بھیجی کہ میں اس سے ملوں۔

گو مجھے معلوم تھا کہ وہ لاہور ہوتا ہوا پنڈی، اسلام آباد اور غالباً پشاور بھی جائے گا لیکن وقت

کی قلت کے سبب میں نے کراچی ہی پہنچنا مناسب سمجھا۔ وہ خود مجھے ہوائی اڈے پر لینے پہنچا اور ہم نے
ایک دوسرے کو بھینچ بھینچ کر پیار کئے۔ گلے لگے کچھ روئے کچھ ہنسے اور پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کی
پیٹھ تھپتھپائی۔ شانتی میں بہت کم تغیر ہوا تھا، لیکن بقول شانتی کے میں از سرتا پا بدل چکا تھا۔ پھر بھی ہم
ایک دوسرے کو ماضی ہی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، ماضی کو کرید رہے تھے اور ماضی کے حوالے سے
بات چیت کر رہے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کو کوئی اٹھارہ سال کے بعد دیکھا تھا۔ بقول شانتی کے
رام چندر جی کا بن باس بھی چودہ برس کا تھا اور ہم پورے اٹھارہ سال کے بعد ملے تھے۔

ماضی کو کریدوں تو بات وہاں سے شروع ہوتی ہے کہ ہم سات سات آٹھ آٹھ سال کی
عمروں کے ہوں گے، تیسری جماعت میں پڑھتے تھے۔ نیکریں اور سوزے، جوتے پہن کر بانہوں میں
بانہیں اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اسکول کی راہداری میں اچھلتے پھرتے تھے۔ میدانوں میں دوڑیں
لگاتے، درختوں پر چڑھ جاتے، شہتوت اور امرود توڑ توڑ کر کھاتے پھرتے اور ہمیں قطعاً یہ احساس
تک نہ تھا کہ کل جو گذر گیا کیا تھا کیسا تھا اور کل جو آنے والا ہے کیسا ہوگا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جلسے
جلوس بھی ہوتے، زندہ باد اور مردہ باد بھی۔ دیواروں پر جگہ جگہ "سائمن کمیشن گو بیک - SIMON
COMMISSION GO BACK بھی لکھا ہوا دیکھتے۔ جگہ جگہ "وی" یعنی وکٹری کے نشانات بھی نظر آتے
جنگ کی خبریں، بمباری، جرمنی، ہٹلر، چرچل، ان سب کا چرچا سنتے لیکن ہمیں تو سرف وکٹری کا وی بنانے
ہٹلر کی مونچھیں اور چرچل کے سگار کی تصویریں بنانے کا شوق تھا۔

شانتی بڑا ہی معصوم لڑکا تھا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے خیالات بھی میرے لئے کچھ ایسے ہی تھے۔

ان تمام باتوں میں وہ میرا مکمل ساتھی تھا اور میں اس کا۔ ہمارے ذہنوں کی اٹھان اور تربیت
تقریباً یکساں تھی سوائے اس کے کہ ہمارے گھروں کے پس منظر مختلف تھے یعنی میری صبح صبح آنکھ کھلتی

تو دادی اماں با آواز بلند قرآن مجید کی تلاوت کرتی ہوتیں، امی جان مناجات پڑھتی ہوتیں اور شانتی کے گھر کی خواتین گیتا کا پاٹ کرتی ہوتیں۔ جیسے جیسے ملک کی آزادی کی منزل قریب آتی جا رہی تھی۔ جلسے جلوسوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، ادھر جنگ کے شعلے تیز ہو رہے تھے۔ جاپان نے برما پر یلغار کر دی تھی۔ کلکتے پر حملے کا اندیشہ بڑھتا جا رہا تھا لیکن برمی مہاجرین کو دیکھ کر ہمیں ان کے لباس کے عجیب و غریب ہونے کا تو احساس ہوتا جنگ کی تباہ کاریوں کا واضح تصور ذہان میں نہ جمتا ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ان برمی مہاجرین پر کیا گذری ہے اور یہ کن حالات میں یہاں پہنچے، ہمیں تو ان کی بود و باش پر تبصروں ہی سے فرصت نہ ملتی تھی کہ ان باتوں پر غور کرتے۔

ایک دن شانتی نے کہا:

— "باپو (گاندھی جی) بہت بڑے مہاتما ہیں ہمیں آزادی دلانے کے لئے جیل میں برت رکھ رہے ہیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ یہ شانتی نہیں اس کے گھر کا وہ کیلنڈر بول رہا ہے جس پر گاندھی جی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ وہ کسی مہاتما کے مانند چادر لپیٹے دست بستہ سلام کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ پھر میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ معاً ہمارے گھر کے کیلنڈر کی قائد اعظم محمد علی جناح کی شیروانی ٹوپی کی تصویر ذہن میں ابھری اور میں بولا:

— "ہمارے قائد اعظم بھی بہت بڑے لیڈر ہیں پاکستان ہمارے لئے بنوا رہے ہیں۔"

شانتی کو یہ جواب برا لگا تھا، اس نے مجھے گھور کر دیکھا تھا اور کوئی جواب دیئے بغیر چلا گیا تھا کئی دن قریب بھی نہ پھٹکا اور نہ بات چیت کی۔ میں بھی کھنچا کھنچا سا رہا لیکن زیادہ دنوں تک کھنچاؤ قائم نہ رہ سکا۔ بالآخر کھیل کھیل میں بات چیت شروع ہو گئی۔ شانتی نے گاندھی کا اور میں نے قائد اعظم کا پھر کبھی ایک دوسرے سے ذکر نہ کیا دونوں کے ذہنوں میں انجانا خوف تھا اور دونوں کو

اپنے تعلقات زیادہ عزیز تھے۔

ہماری زندگی میں وہ دن بھی چپکے سے داخل ہو گیا۔ جب برصغیر میں پاکستان بن گیا اور ہندوستان آزاد ہو گیا۔ برصغیر کے طول وعرض میں ہندو مسلم کشت و خون کا بازار خوب گرم رہا لیکن لکھنؤ تک یہ آگ نہ پہنچی صرف تباہ حال مہاجرین کے قافلے مغربی پنجاب سے پہنچتے رہے اور اکا دکا اہل لکھنؤ مہاجرت اختیار کرتے رہے۔ تاہم دلوں میں وہ پہلے جیسا تحفظ کا احساس خود بخود ختم ہونے لگا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے پاکستان ہمیں بار بار آوازیں دے کر بلا رہا ہو پھر بھی ہمارے گھر میں پاکستان جانے کا کہیں دور دور تک ذکر نہ تھا۔ شانتی بھی اس موضوع سے اجتناب کرتا تھا اور ہم بدستور زندگی کے سفر میں رواں دواں تھے۔ دونوں ملکوں کو آزادی ملے عرصہ ہو رہا تھا اور ہم کالجوں میں پہنچ چکے تھے کہ ایک رات ہمارے گھر والوں کا قافلہ چپ چاپ پاکستان روانہ ہو گیا۔ لاہور پہنچ کر ہم نے نئی زندگی کا آغاز کر دیا۔ نئے دوستوں میں گھس مل گئے اور ماضی کے زخم پر کھرنڈ جم گیا کہ ایک روز شانتی کا خط آیا جس کا تمام تر لب لباب یہ تھا کہ:

"یار تم سے ایسی امید تو نہ تھی کہ یوں چپکے سے کھسک جاؤ گے۔"

تو وہ زخم پھر تازہ ہوا اور خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شانتی نے مجھے یہ بھی اطلاع دی کہ آزاد ہندوستان میں اردو کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے لیکن وہ اردو صرف اس لئے پڑھ رہا ہے کہ یہ اس کے دوست کی یعنی میری زبان ہے میرے ملک کی زبان ہے، شانتی کے دوست کے ملک کی قومی زبان ہے وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے ایک عزیز کی لکھنؤ میں شادی تھی۔ ہم بڑے چاؤ سے لکھنؤ پہنچے لیکن جب اپنے عزیزوں کی خستہ وخراب زندگی کا بطور خاص اور مسلمانوں کا عموماً یہ نقشہ دیکھا کہ جہاں کبھی ہاتھی جھومتے تھے

وہاں خاک اڑ رہی تھی اور کتے لوٹتے تھے تو مجھے دکھ ہوا لیکن لوگوں کی خوشی ہماری آمد سے دوچند سہ چند تھی۔ چنانچہ شانتی سے ملا تو وہ بھی چمٹ چمٹ کر خوب رویا اور اس نے یہ بھی انکشاف کیا کہ میری صحت قابل رشک ہو گئی ہے اور پوری شخصیت میں عجب نکھار پیدا ہو چکا ہے اور یہ کہ صنف نازک کے لئے مجھ میں بڑی کشش پیدا ہو چکی ہے وغیرہ وغیرہ۔

غرض کہ شانتی نے اپنے بارے میں بھی انکشافات کئے کہ وہ بی۔اے کرنے کے بعد صحافت اختیار کر چکا ہے۔ اس کی وہ بات جو میرے دل میں گڑ کر رہ گئی۔ یہ تھی کہ شانتی نے نہایت صداقت کے ساتھ اعتراف کیا کہ برصغیر میں پاکستان کا قیام مسلمانوں کی بقا کا ضامن ہے ورنہ ہندوستان کے مسلمان ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہیں۔ اقتصادی لحاظ سے روز بروز وہ خستہ اور کمزور ہوتے جا رہے ہیں اور اس طرح یا تو وہ نابود ہو جائیں گے یا اکثریت میں ضم ہو جائیں گے۔ شانتی نے یہ بھی بتایا کہ شمالی ہند کے کٹر ہندو جو جن سنگھی ذہنیت رکھتے ہیں مسلمانوں کے خلاف نت نئے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ من حیث القوم مسلمانوں کے وجود کے دونوں طرح کے عناصر دشمن ہیں کیا انتہا پسند اور کیا میانہ روی اختیار کرنے والے۔ شانتی پاکستان کی اقتصادی زندگی کی نسبتاً بہتر صورت سے متاثر تھا۔ میرے وہاں سے چلتے وقت اسٹیشن پر شانتی مجھے رخصت کرنے آیا اور اس نے کہا:۔

"یار جس طرح کسی پودے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے ہیں اور دوسری جگہ کی سرزمین اسے قبول کر لیتی ہے تو وہ خوب پھلتا پھولتا ہے۔ لگتا ہے کہ یہاں کے تباہ حال مسلمانوں کو اس سرزمین نے اسی طرح قبول کیا ہے جہاں میرا یار پھولے پھلے، شاد و آباد رہے اس سرزمین کو میرا اسلام کہہ دینا۔"

وہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ اس ملاقات کو پورے اٹھارہ سال بیت چکے تھے۔ ہماری زندگی میں گوناگوں تغیرات ہو چکے تھے۔ شانتی اس اثنا میں اعلیٰ درجے کا صحافی بن چکا تھا۔ میں بھی اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ ہوئی لیکن ہمیں کسی قسم کے نقصان کا احساس نہ ہوا بلکہ احساس تفاخر پیدا ہوا۔ مگر ۱۹۷۱ء کی جنگ نے ہمارا اہم سے سب کچھ چھین لیا ہمارا مشرقی بازو کٹ گیا اور اس پس منظر میں معاہدۂ شملہ کے بعد شانتی کا پاکستان آنا مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ خود کو چھپا لوں کسی کو نظر نہ آؤں۔ چہ جائیکہ کسی ہندوستانی دوست کو یوں گلے لگانا پڑے تو اس سے بڑا کرب اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس سے بڑی سزا اور کیا ہو گی۔ وہ لوگ جو قوم و ملک کی خاطر قیدی بن کر ہندوستان کے کیمپوں میں رسوائی اٹھا رہے ہیں، بہر حال دشمن کے رحم و کرم پر ہیں اور اسی کی سرزمین پر ہیں۔ بند گی بیچارگی کی مکمل تصویر ہیں لیکن میں ایک آزاد ملک کا آزاد باشندہ تھا۔ میں اپنی قوم کا ایک معزز فرد تھا مجھے شانتی سے ملنے میں جس رسوائی اور بے بسی کا احساس اپنے ہی ملک کی آزاد فضاؤں میں ہو رہا تھا وہ ہر طرح سوہانِ روح تھا۔ میں شانتی کا خیر مقدم اور سواگت کرنے کو تیار تھا لیکن ان حالات میں جو مجھے دیکھنے پڑے اور جن کا پس منظر بڑا دل خراش تھا۔ مجھے خود سے گھن آ رہی تھی۔

مجھے اعتراف ہے کہ شانتی جب تک پاکستان میں رہا میں سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہا کراچی سے لاہور، لاہور سے راولپنڈی اور اسلام آباد، اسلام آباد سے پشاور اور پھر وہاں سے کراچی ــــ لیکن یہ بھی درست ہے کہ مجھے یوں لگا کہ جیسے شانتی کے ہمراہ میں نہیں ہوں میرا ہیولیٰ ہے جس پہ سے میرا جسد بے جان ہے، میرا قالب بے روح ہے۔ میرے تپاک میں سرد مہری، میری محبت میں تصنع، میرے خلوص میں بناوٹ ہے۔ شانتی مجھ سے بار بار کہتا:

"یار کیا بات ہے تم کچھ بجھے بجھے سے ہو ــــ وہ اگلی سی شوخی اور چہل نہیں ہے ــــ یہ تمہاری

چھکنے کی عادت کو کیا ہو گیا؟"

اور میں پھیکی ہنسی ہنستا اور کہتا "کچھ نہیں ۔۔ یار کچھ بھی تو نہیں بس کچھ سن کا تقاضا ہے سنجیدگی آ ہی جاتی ہے نا ۔۔۔" شانتی اثبات میں گردن ہلاتا، لیکن صاف معلوم ہوتا جیسے اسے باور نہیں میں نے اس کی مہمان نوازی میں کمی نہ کی۔ ہر طرح سے اسے خوش رکھنے کی سعی کی۔ ملک کے چپے چپے کی سیر کرائی مگر کچھ بھی جو مجھے ہونا چاہیئے تھا جیسا ہونا چاہیئے تھا میں نہ بن سکا۔

آخر وہ وقت بھی آن پہنچا جب شانتی کو رخصت ہونا تھا اور ہم دونوں وی آئی پی لاؤنج میں کبھی بیٹھتے تھے کبھی ٹہلتے تھے اور کبھی سر جوڑ کر بیٹھ جاتے تھے۔ میری اداسی کا سبب شانتی پا چکا تھا جب اس کے جہاز کی رخصت کا اعلان ہونے لگا، گلے لگا کر چلتے وقت اس نے کہا "یار افسردہ نہ رہو تم نے ملک بنایا تھا، قوم نہیں بن سکے۔ اس کی بات کاٹ کر کہا گیا، ہمیں ملک بنانا یاد تھا لہذا قوم بناتے رہے اور بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ کوئی بات نہیں پیارے کبھی کے دن بڑے کبھی کی رات۔ میں کچھ جواب دینا چاہتا تھا کہ وہ بولا "میں نے تمہاری قوم کا جائزہ لیا ہے۔ تمہارا سپاہی بہت بہادر ہے لیکن قوم جو سپاہی کے پیچھے ہوتی ہے خود غرض ہے۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے گھڑی دیکھی اور مجھے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا: "مجھے معاف کرنا پیارے مجھے کوئی حق تو نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں احمد آباد، بمبئی، کلکتے جیسے شہروں کے فٹ پاتھوں پر لاتعداد لوگ روزانہ سوتے ہیں۔ بہتیرے بھوک، مفلسی اور فاقہ کشی سے مر جاتے ہیں لیکن ہماری سڑکوں کو روشن کرنے والے بلب اور ٹیوب بدستور روشن رہتے ہیں ۔۔۔ اور یہاں تمہارے ملک میں، کراچی، لاہور اور پنڈی میں کوئی کبھی فاقہ کشی سے نہیں مرتا۔ فٹ پاتھوں پر سونے والے بھی کم بلکہ بہت کم ہیں ۔۔۔ مگر تمہاری سڑکوں کی روشنی غائب ہے۔ فٹ پاتھوں کے کھمبے بلب اور ٹیوب سے محروم ہیں۔ جب تک تمہاری قوم کے بچے بچے کے دل میں وطن اور ملک کے لئے روشنی نہیں ہوگی

تم قوم نہیں بن سکتے۔ تمہارا قومی کردار جگہ جگہ بکھرا پڑا ہے۔ قوم سے ملک بنتے ہیں، ملک سے قوم نہیں بنتی ــــ۔

شانتی مجھے تھپتھپا کر مسافروں کے غول میں گم ہو گیا۔ اپنے جہاز میں جا بیٹھا اور جہاز ٹیک آف کر کے فضاؤں میں بلند ہوا اور پرواز کرتا ہوا ایک نقطہ موہوم کی طرح غائب ہو گیا۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ میں سُن ہو چکا ہوں۔ میرا جسم پتھر کا ہو چکا ہے جس میں مطلقاً زندگی کے آثار نہیں پائے جاتے ــــــ

دعا

بظاہر یہ کوئی مشکل مسئلہ نہ تھا کہ بابو منظور احمد اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک مرنجاں مرنج مرلی اور کھچڑی مونچھوں والے بڈھے کو سمجھاتا جو اپنے گول گول مدور دیدوں میں استعجاب لئے ڈوبتی ہوئی عینک کے شیشوں کے آر پار یوں تک رہا تھا جیسے کوئی معمہ یا پہیلی بوجھنے کو کہا جائے اور وہ بوجھ نہ پائے۔ وہ جانتا تھا کہ بچہ بچہ دستِ غیب کے کرامات سمجھتا تھا بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ ماں کے پیٹ سے سارے گُن سیکھ کر نکلتا ہے اور دیکھتے دیکھتے پر پرزے نکالتا ہے اور ایسی اڑان گھمائیاں بتاتا ہے کہ کوئی خضرِ طریقت بھی ہو تو ہستی گم ہو جائے پھر منظور احمد نے کوئی ایسی زبان بھی استعمال نہ کی تھی جس کے لئے عسیر الحصول لغات کھنگالنا پڑتے سیدھی سادھی صاف اور آسان زبان میں کہا تھا:

"بڑے میاں درخواست آگے بڑھانا ہے تو پہیئے لگاؤ۔"

اور بڑے میاں تھے کہ اس کے چہرے کو تکے جا رہے تھے منظور احمد نے دل میں ہزار بار

اس منحوس بڈھے پر لعنت بھیجی کہ کمبخت نہ گانٹھ ڈھیلی کرتا ہے نہ انٹی سے کچھ نکالتا ہے بس ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم، کیسا کٹھور بے غیرت اور غبی انسان ہے۔ بولا بھی تو کیا بولا:

"پہیئے ——؟"

گویا اب اسے یہ بھی سمجھاؤ کہ گول گول مدوّر روپیوں کو پہیہ نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے دنیا میں سارا کرشمہ پہیئے کا نہیں ہے تو اور کس کا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ سائنس میں ترقی کی اساس پہیہ ہے تو بس سمجھ لو کہ یہ پہیہ بھی بس روپیہ ہی ہے نقدہٗ علیہ السلام۔ آخر اتنی آسان اور عام بات اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ بابو منظور احمد نے سوچا کیا پتہ کہ یہ بڈھا بن رہا ہو۔ سمجھ بوجھ کر انجان بن گیا ہو۔ ہاں ہاں ایسے لوگ بڑے کائیاں ہوتے ہیں سیدھی طرح نہیں مانتے' اچھا رہو بچو، تم بھی کیا یاد کرو گے تمہاری فائل میں وہ وہ اڑچنیں ڈالی ہوں کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا دفتر کے چکر کرتے کرتے ہاں میں بھی منظور احمد ہوں، آسانی سے گلا نہیں چھڑا سکتے مجھ سے۔ جونک کی طرح چمٹ کر لہو پی جاؤں گا۔

منظور احمد نے چپراسی کو آنکھ ماری اور چپراسی نے بڑے میاں سے چپکے سے کہا "ذرا باہر آئیے۔

بڑے میاں کے باہر جاتے ہی دفتر کے بابوؤں نے اظہار خیال شروع کر دیا۔

یار یہ آدمی کچھ نہیں دیتا، سوکھا سوکھا کام لینا چاہتا ہے"

دوسرے نے کہا: "منظور کا شکار ہے" اور منظور احمد کی میز سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر اس کے دوست نے تھری کیسل سگریٹ منہ میں پھنسا کر لائٹر سے سلگاتے ہوئے کہا: قبر تک پیچھا نہیں چھوڑے گا بوڑھے کا —— حلق میں انگلیاں ڈال کر نکال لے گا"

بابو منظور احمد نے فائل پر جھکے جھکے مسکراتے ہوئے کہا "ویسے کام سیدھا سادا ہے صاحب کے دستخط ہو جائیں تو سمجھو کام ہو گیا"

تیسرے نے کہا "اور صاحب کی میز تک فائل پہنچے ہی گا نہیں"

ایک اور بولا: ویسے صورت سے کیسا مسکین معلوم ہوتا ہے۔"

چوتھا بولا "ارے نہیں یار، صورت پر نہ جانا، مال پانی ایسے ہی لوگوں کے پاس ہوتا ہے۔"

پہلے نے کہا "کراچی میں تو پھٹے پرانے کپڑے پہنے بسوں میں سفر کرنے والے سگریٹ کی جگہ بیڑی پینے والے لکھ پتی اور کروڑ پتی سیٹھ ہوتے ہیں کیا پتہ یہ بڈھا....."

دوسرے نے کہا: "اب ایسا بھی کیا ہے!"

دو تین آدمی تنک کر بولے: "کیسا نہیں؛ ــــ یہ بڈھا مالدار نہیں ہے؟"

ایک بولا "ارے میاں دولت ایسے ہی لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ یہ ہم تم نہیں کہ آٹھ گھنٹے قلم گھستے اور ٹائپ رائٹر کھڑکھڑاتے ہیں تب کہیں روکھی سوکھی روٹی کے چند ٹکڑے میسر آتے ہیں۔"

تیسرے نے کہا اب ایسی ناشکری بھی نہ کرو۔ اسی نوکری کی بدولت، تو منظور نے اسکوٹر لے لیا، بیوی کے نام سے گلبرگ میں زمین خریدلی۔"

دوسرے نے نوالہ دیا: "یار ایک آدھ کوٹھی بنا لینا یا اسکوٹر لے لینا بھی کوئی بات ہے ذرا اپنے سے اوپر تو دیکھو، سید صاحب کی کتنی کوٹھیاں کتنی گاڑیاں ہیں۔ بچے ولایت میں پڑھتے ہیں۔"

تیسرے نے کہا "اپنے شیخ صاحب کسی سے کب کم ہیں ایک کوٹھی مری میں بنوالی ایک کراچی میں دو گلبرگ میں اب سنا ہے کوئی مل خرید رہے ہیں۔"

ایک نے کہا "ہاں یار بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں ہیں، ہمیں تو ان کے مقابلے میں کوئی پوچھتا بھی نہیں۔"

چپراسی واپس آیا اور بولا "بابو صاحب سمجھا دیا ہے۔"

بابو منظور احمد نے پوچھا: "کیا کہتا ہے؟"

چپراسی بولا "کہتا کچھ بھی نہیں ہے سُن کر چپکا ہو گیا اور بولا "اچھا پھر آؤں گا۔"

منظور احمد بولا: "اس کا تو باپ بھی آئے گا سامنے کا، جائے گا کہاں؟"
تمام لوگ ہنسنے لگے۔ اور کسی موٹی اسامی کا انتظار کرنے لگے۔

قائد اعظم کی قد آدم روغنی تصویر کے عین نیچے اتحاد، ایمان اور تنظیم کے الفاظ جلی حروف میں کندہ تھے اور اُن کے سامنے میں منظور احمد کی سیٹ تھی۔ چاروں طرف پاکستان کے رُوح پرور مناظر کی تصویریں آویزاں تھیں۔ بابو منظور احمد کے عین روبرو یادگار پاکستان کی تصویر تھی اور اس کے قریب ہی بادشاہی مسجد کے مہتم بالشان مینار نظر آتے تھے۔ گرد و پیش دوسرے بابو لوگ اپنی اپنی میزوں پر جمے ہوئے نہایت مستعدی سے کام کرتے رہتے دروازے کے قریب ہی اسٹول پر چپراسی بیٹھا رہتا۔ کبھی کوئی فائل ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا پڑتی تو دم نکل کر رہ جاتا ورنہ دن بھر چائے کے بڑے بڑے لاتا رہتا اور خوش و خرم رہتا۔ کسی موٹی اسامی کو نہایت ہوشیاری سے پھانس کر سیٹ میں اتارنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ گرمی کا زمانہ ہوا تو خس کے پردے ڈال کر پنکھا کھول کر مزے سے سو جاتا جاڑا ہوتا تو ہیٹر لگا کر مزے سے چائے کی چسکیاں لیتا رہتا۔ تمام بابوؤں کی ہفتہ دہشت تک کا علم اسے ازبر تھا اور ہر ایک کا مزاج داں اور راز شناس تھا کیا مجال کہ کسی کی مرضی کے بغیر ذرا بھی کوئی کام کرے۔

آج جو بڑے میاں کو آتے دیکھا تو بابو منظور احمد سے بولا "موٹی مرغی آگئی۔"

منظور احمد نے کہا: "کون سے وہی بڈھا، بچوں کا مربہ؟"

چپراسی نے کہا: "بابو منظور احمد جی! مجھے لگتا ہے کہ بڈھا کچھ دے مرے گا۔"

منظور احمد نے کہا: "پتہ نہیں کچھ سے کبھی بالیوں ہی سوکھی ہڈی جھنجھوڑنا پڑے گی۔"

چپراسی دوڑتا ہوا گیا اور بڈھے سے دیر تک کھسر پھسر کرتا رہا پھر اندر آ کر بابو منظور احمد

سے بولا "بڈھا کہتا ہے میں خود بات کروں گا۔"

منظور احمد جھلّایا ہوا تو تھا ہی۔ بولا "بلا سے سن لیں گے کیا بکتا ہے۔"

بوڑھے نے آکر ادب سے سلام کیا اور نہایت ملتجیانہ طور پر سرگوشی کے انداز میں منظور احمد سے بولا "آپ غریب خانے پر تشریف لا کر چائے نوش فرمانا قبول کرلیں۔"

منظور احمد نے امید و بیم کی حالت میں دعوت قبول کر لی اور بڑے میاں کے اصرار پر پتہ نوٹ کر کے انہیں رخصت کر دیا تو بابوؤں میں سے ایک نے کہا "یار کچھ بھی کہو، لگتا یہ ہے کہ بڑے میاں کے پلے کچھ ہے نہیں۔"

دوسرے نے کہا "پھر بھی چلے جانے میں نقصان نہیں ——— ہو سکتا ہے کسی خفیہ خزانے کی کنجی ہی ہاتھ لگ جائے۔"

تیسرے نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "اور اگر بڑے میاں کی دختر نیک اختر......"

پہلے بابو نے کھنکھار کر ذرا کنکھیوں سے بابو منظور کو دیکھا جو مسکرا رہا تھا، چوتھے نے جملہ تیز کیا "تو کیا مضائقہ ہے پیارے! اسلام میں تو چار شرعی نکاح جائز ہیں۔"

ایک اور نے اظہار خیال کیا "اور اگر وہاں معاملہ کچھ اور ہوا یعنی بڑے میاں اپنی دختر نیک اختر کو میاں منظور کے ساتھ کمرے میں دھکیل کر دروازہ بند کرلیں تو"

گنجے نے کھنکھار کر کہا "تو اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے چپڑی اور دو دو۔"

پہلے نے خم ٹھوک کر کہا "بابو منظور چوکنا نہیں۔ بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لینا۔"

بابو منظور نے ایک ننگی سی گالی دے کر کہا "میں تو ——— ہاتھ کیا دھونا، غسل کروں گا۔"

تمام لوگوں نے قہقہہ لگایا اور چپراسی کو چائے منگانے کے لئے دوڑا دیا۔

جب دفتر جم گیا اور بابو منظور کی سیٹ خالی رہی تو سب کو فکر ہوئی کہ بھئی کیا بات ہے پتہ نہیں بڑے میاں کی دعوت میں کیا گذری لوگ اپنے اپنے طریقے سے تبصرے کر رہے تھے کہ بابو منظور احمد آ پہنچے تمام یار لوگ کھل گئے کہ مزے مزے کی باتیں سنیں گے مگر منظور کا چہرہ ستا ہوا اور منہ اترا ہوا تھا۔ لوگوں کے ماتھے ٹھنکے کہ معاملہ گڑبڑ ہے پتہ نہیں بڑے میاں نے کیا حرکت کی۔ بابو منظور نے آتے ہی کوٹ ایک طرف پھینکا اور سیٹ پر جم کر جیب سے چابی نکال کر چپراسی کی طرف اچھالی، پاس بیٹھے ہوئے گنجے بابو کی میز سے تھری کیسل کا پیکٹ اٹھا کر سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا تو گنجے بابو نے مسکرا کر دیکھا۔ دوسرے بابو کی ہمت بڑھی تیسرے نے پوچھا: "کہو کیسی رہی دعوت"۔

"بکواس ہے" سگریٹ سلگا کر دھواں اڑاتے ہوئے منظور نے کہا "بڑے میاں بالکل فراڈ ہے"

"اچھا؟"

"ہاں سالے نے مکسڈ (MIXED) چائے کا گلاس تھما کر دو بسکٹ سامنے رکھ دیئے بولا میں غریب آدمی ہوں، میرے پاس آپ کے دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے، بس میرے دل سے دعا لے لو میرا کام کر دو۔"

"اچھا؟"

"ہاں، اور پھر جانتے ہو کیا ہوا؟"

"کیا؟" ——— سب نے بصد شوق پوچھا۔

"اپنے ٹوٹے پھوٹے صندوق کو کھول کر سالے نے ایک لکڑی کا کیس نکالا ——— میں سمجھا سالا دفینہ نکال رہا ہے کوئی ہیرا وغیرہ نکال کر دے گا، مگر جانتے ہو وہ لکڑی کا کیس میرے پاس لے کر آیا اور بولا یہ میرے مورثِ اعلیٰ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید کا نسخہ ہے یہ میں تم کو تحفے کے طور پر دے رہا

ہوں، اس کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔"

"چہ چہ چہ"

"اب تم ہی کہو اس سالے نے کتنا وقت برباد کیا۔ ارے بھئی کون مسلمان ہے جس کے گھر میں قرآن نہیں ـــــ"

"یار یہ تو بڑی زیادتی ہے۔"

ایک نے کہا "تو پھر وہ قرآن تم نے کیا کیا؟"

"کیا کرتا ـــــ گھر لے کر جاتا تو بیوی بدگمان ہوتی کہ سارا پیسہ قرآن خرید خرید کر ختم کر دیتا ہوں پہلے ہی گھر میں دو دو قرآن موجود ہیں میں نے محلے کی مسجد میں لے جا کر رکھ دیا۔"

دفتر میں سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص اس منحوس بوڑھے کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا کہ اچانک منظور پھر بولا "آج سب سے پہلے اس سالے بڈھے کی فائل ٹھکانے لگانی ہے کہ وہ بھی یاد کرے۔"

ایک نے کہا "جلا دو سالی فائل کو۔"

منظور نے کہا "بالکل یہی ہوگا، مر جائے گا سالا دوڑ دوڑ کے۔ کہدیں گے فائل گم ہوگئی۔"

چپراسی کو اشارہ کر کے منظور نے فائل اس کے سامنے اچھال دی۔ چپراسی نے بخاری میں فائل رکھ کر چولھے سے تیل نکال کر چھڑکا اور ماچس دکھا دی۔ آن واحد میں، فائل جل کر راکھ ہو گئی چائے منگا دی گئی اور غم غلط کرنے کے لئے سب اکٹھا ہو کر بیٹھ گئے کہ عین اسی وقت بڑے میاں آن ٹپکے۔ چپراسی نے بے حد روکھے انداز میں کہا:

"بابو جی کو فرصت نہیں ہے باہر ٹھہریئے۔"

بڑے میاں خاموشی سے بنچ پر جا بیٹھے جب بھی گھنٹے دو گھنٹے کے بعد اندر جھانکنے کی

کوشش کرتے چپراسی ڈانٹ کر بٹھا دیتا۔ اس اثنا میں جانے کتنے لوگ آتے جاتے رہے جانے کتنے بار چائے کے دور چلے لیکن بڑے میاں کو باریابی کی اجازت نہ ملی پر نہ ملی۔ ایک بار بابو منظور باہر نکلے بڑے میاں لپکے کہ کچھ عرض کریں مگر بابو منظور نے ڈانٹ کر کہا۔

"بڑے میاں کہہ دیا کہ فائل ابھی نہیں آئی ہے، جب آئے گی تو کام ہو گا۔"

بڑے میاں نے صبر و شکر کے ساتھ یہ کلمات سنے اور بے یقینی کے انداز میں گردن ہلاتے ہوئے جدھر سے آئے تھے واپس چل دیئے۔

بابو منظور نے کہا "دیکھو کس طرح دھمال جما کر بیٹھا تھا یہاں بڈھا، معلوم ہوتا ہے یہ دفتر نہیں اس کے باوا کا مزار ہے۔ مجاوری کرنے آیا ہے سالا......"

ایک کلرک بولا: "کیا پتہ سچ مچ بے چارہ مفلس ہی ہو ——"

منظور نے کہا: "تو بھائی کر لو تماشا —— ان کو سمجھاؤ کہ ایسے ایسے قابل رحم بڈھے کتنے ظالم ہوتے ہیں اور کس کس طرح دولت جمع کرتے ہیں، سالے کے دل سے نکلا بھی تو کیا —— قرآن شریف —— اب کہو وہ دولت کیوں نہیں نکالتا جو جمع کی ہے۔ کیا قبر میں ساتھ لے کر جانا ہے۔"

گنجے نے کہا "دل سے تو اس کے دعا بھی نکلی پر تم نے سنی ہی نہیں۔"

بابو منظور بولا "اس کی —— اور اس کی دعا کی...... ہمیں ضرورت نہیں۔"

اسی اثنا میں چپراسی نے کسی اجنبی کی آمد کی اطلاع دی۔ صورتاً بھی وہ کباڑیا معلوم ہوتا تھا اور سچ مچ وہ نکلا بھی کباڑیا۔ منظور کا پتہ معلوم کر کے وہ آ کر اس سے ملا، اور بولا "میں آپ سے ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔"

منظور نے بیحد روکھے انداز میں کہا: "کہاں ہے درخواست لائیے۔"

کباڑیا بولا: "جی نہیں میرا مطلب ہے گزارش"

منظور نے کہا "فرمایئے"

کباڑیا بولا: "دیکھئے وعدہ کیجئے کہ انکار نہیں کیجئے گا"

منظور نے جھلا کر کہا "کچھ بکیئے بھی آخر"

کباڑیے نے بصد منت کہا: جناب غصہ نہ کیجئے ـــــ دیکھیئے میں بہت دور سے آیا ہوں ـــــ بڑے میاں نے تو دوڑاتے دوڑاتے مجھے ادھموا کر دیا ـــــ مہینوں دوڑا ہوں اس قرآن مجید کے نسخے کے لئے ـــــ دراصل میں بھی کوئی مالدار آدمی تو نہیں ہوں، دیکھئے دس ہزار روپیہ میں نے لگا دیا مگر بڑے میاں نہیں مانتے تھے۔ اب کہتے ہیں کہ وہ قرآن انھوں نے آپ کو دے دیا ہے اگر آپ...... مہربانی کریں تو میں ابھی ابھی نقد دس ہزار روپیہ......"

منظور ہکا بکا رہ گیا بولا...... "کیا وہ قرآن مجید ـــــ آپ...... دس...... ہزار......"

"آپ سے کیا پردہ جناب" کباڑیا بولا مجھے تو اس کا گاہک مل گیا ہے۔ دو چار ہزار ہم بھی کما لیں گے"

"مگر وہ تو ـــــ"

"دیکھئے اب انکار نہ کیجئے گا منظور صاحب میری قسمت بن جائے گی، آپ ہاں کر دیجئے میں ابھی روپیہ گنے دیتا ہوں......"

تمام دفتر کے لوگ بھی ہکا بکا تھے اور منظور بھی سراسیمہ انداز میں یہ باتیں سن رہا تھا کہ معاً جوتے اتار کر بے تحاشا باہر کی طرف دوڑا، کباڑیئے سے بولا "آپ ٹھہریئے میں قرآن مجید لے کر ابھی آتا ہوں ـــــ"

کباڑیا مزے سے پاؤں پسار کر بیٹھ گیا۔ ٹھ ایک بجا، دو بجے، چار بجے حتیٰ کہ شام ہو گئی مگر منظور

واپس نہ آیا تمام دفتر والے واپس گھروں کو چلے گئے، چپراسی جمائیاں لینے لگا تب کہیں اللہ اللہ کرکے منظور نظر آیا مگر کسی تھکے ہوئے جواری کی طرح وہ گرتا پڑتا ہوا آیا اور خالی ہاتھ کباڑیے کی طرف بڑھا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ "بھائی میں لٹ گیا۔ میرے دس ہزار روپے مارے گئے ـــــ مسجد سے کوئی قرآن مجید کا وہ نسخہ لے گیا۔" کباڑیا جو دن بھر امید و بیم کے عالم میں رہا تھا تڑپ کر بولا ـــــ "مسجد سے کوئی لے گیا ـــــ ارے غضب ہو گیا وہ تو پیران پیر حضرت غوث اعظم کے دست مبارک کا لکھا ہوا تھا۔ ارے کہیں بڑے میاں نہ اٹھالے گئے ہوں؟

منظور نے کہا "میں بڑے میاں کے گھر بھی گیا تھا انھیں خبر نہیں کیا ہوا۔ اس کی چوری کا حال سن کر چھاتی پر زور سے مکہ مارا اور گر گئے"۔

چپراسی نے پوچھا "کیا..... مر گئے بڑے میاں؟"

منظور نے کہا "جہنم میں جائے بڈھا، پتہ نہیں زندہ ہے کہ مر گیا ـــــ ہائے میرے دس ہزار روپے ـــــ"

کباڑیا بھی سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور بولا: "ہائے میں نے تو بیس ہزار کا گاہک تلاش کیا تھا"۔

چپراسی نے جلی ہوئی فائل کی راکھ اٹھا کر سوتے ہوئے زمین پر گرانا شروع کر دی اور آہستہ سے بابو منظور سے بولا "بابو اب باہر نکلو مجھے دفتر میں تالا مارنا ہے"۔

کباڑیا اور منظور دونوں دفتر کے باہر یوں نکلے جیسے کسی عزیز قریب کو دفنا کر قبرستان سے واپس آرہے ہوں۔

زبانِ خنجر

اگر کسی درخت، کھمبے یا لیمپ پوسٹ کا تعارف کرانا آسان ہے تو میں آپ سے "اُس" کا تعارف بھی کرا سکتا ہوں۔ "اُس" کلمۂ ضمیر ہے لیکن میں اسے بجائے اسم کے نہیں بطور اسم استعمال کر رہا ہوں کیونکہ میں اس کا نام نہیں جانتا۔ صرف اس قدر جانتا ہوں کہ ڈھاکہ کی اس سڑک پر کسی درخت، کھمبے یا لیمپ پوسٹ کی طرح میں نے اسے ہمیشہ ایک ہی جگہ استادہ دیکھا ہے فٹ پاتھ پر ایک کھمبے، ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے دُبلا پتلا سوکھا سا بالکل ہڈیوں کی مالا، کالا کلوٹا انسان کھڑا ہے۔ اس کے سپید بالوں اور داڑھی میں اس قدر میل کچیل جمع ہو گیا ہے کہ وہ آپس میں چپک کر کسی بوڑھے برگد کے پیڑ کی جٹائیں معلوم ہونے لگے۔ ان سپید بالوں کے بیچ میں کہیں پر میل کچیل سے بھری دو آنکھیں کسی نہ بجھتے ہوئے دیئے کی لو کی طرح ٹمٹماتی رہتیں۔ وہ ہمیشہ ہاتھ پھیلائے ایک ہی انداز میں کھڑا نظر آتا۔ زبان پر مہر لگی ہوئی، خاموشی اتھاہ خاموشی کا ایک پُراسرار ہالہ اس کے وجود کے گرد پھیلا رہتا۔ اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا گویا وہ ازل سے اسی طرح

خاموش صم بکم حالت میں کھڑا ہے اور ابد تک اسی حالت میں کھڑا رہے گا۔ اگر وہ بولا تو بس قیامت آجائے گی لہٰذا اس کا خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔

ایک مجھ پر موقوف نہیں، شہر کی ساری خلقت اُسے اسی طرح دیکھنے کی عادی ہو گئی تھی۔ ربع صدی سے میں بھی اسے اس لیمپ پوسٹ کے نیچے ہاتھ پھیلائے خلاؤں میں تکتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ آیندرروند، چھوٹے بڑے، عورتیں مرد بچے سب اس کو اسی طرح دیکھنے کے عادی بن چکے تھے جیسے وہ اس سڑک اور اس فٹ پاتھ کا ایک جزِ ولاینفک ہو۔ اس لیمپ پوسٹ کے نیچے ازل سے کھڑا ہوا اور اس رہ گذر کا جزِ ولاینجزا بن چکا ہے۔ رکشوں پر چلنے والے، گاڑیوں اور بسوں میں سفر کرنے والے، پیدل چلنے والے غرضیکہ تمام لوگ اس کو اسی طرح دیکھنے کے عادی بن چکے تھے اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے، کیا ہے کہاں رہتا ہے کہاں سے آتا ہے کہاں چلا جاتا ہے۔

ایک تو آس پاس کوئی دکان نہیں کوئی بازار نہیں، دوسرے اگر کوئی بھولا بھٹکا خوانچے والا ادھر آنکلتا اور کوئی ایک آدھ بات اُس سے کرنا چاہتا تو خاموشی سے ادب کرا اپنا سا منہ لے کر خود ہی چلا جاتا یا بہت سے بہت بڑبڑا کر چپ ہو جاتا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید وہ گونگا ہے کچھ کہتے تھے بہرہ ہے بعض کا خیال تھا کہ آدھی رات کو زمین اس کو نگل جاتی ہے اور صبح ہوتے ہی اگل دیتی ہے کچھ کہتے تھے کہ وہ ہلتا جلتا بھی نہیں ممکن ہے بے جان مورتی ہو پتھر کا بت ہو۔ کچھ مسخرے قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ وہ کوئی جن ہے بھوت پریت یا آسیب ہے کہ دن نکلتے ہی نظر آنے لگتا ہے اور رات گئے تک یوں ہی جما رہتا ہے اور پھر کسی وقت غائب ہو جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ کوئی آسیب تھا نہ چھلاوہ، نہ جن بھوت اور نہ غول وحش وہ محض انسان تھا۔ ایک ایسا انسان جو ۲۵ سال سے پورے تواتر سے اسی سڑک کی فٹ پاتھ پر اسی لیمپ پوسٹ

کے نیچے ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ البتہ اس کے بارے طرح طرح کی جو قیاس آرائیاں ہوا کرتی تھیں اُس میں اس کی پُراسرار خاموشی کو بڑا دخل تھا۔ بس جس بات پہ سب سے زیادہ فکرمند تھا وہ اس کی خاموشی نہیں تھی بلکہ وہ حالت یا کیفیت تھی جس پر وہ ایک ہی انداز میں اس طرح کھڑا رہتا تھا کہ نہ ہاتھ ہلاتا تھا نہ کھجاتا تھا نہ مکھیاں ہلاتا تھا جیسے وہ قرون اولیٰ کا کوئی راہب ہوا راہب ایک حالت میں برسہا برس خود کو رکھتا ہے لیکن اس میں اور راہب میں فرق صرف اتنا تھا کہ رات گہری ہوتے ہی وہ اپنی جگہ سے ذرا ہلتا اور پھر اسی فٹ پاتھ پر یوں ایک طرف کو چل دیتا ہے جیسے کل کا گڈا ہو یا جیسے مسمریزم کے زیر اثر کوئی چل رہا ہو یا جیسے کوئی خواب میں راستہ چلنے لگے۔

ڈھاکے کی اس سڑک سے گذرنے والوں کے قافلے کوئی ایک طرح کے نہیں طرح طرح کے ہوتے۔ خالص دیسی لوگ بدیسی لوگ۔ بدیسی وضع قطع کے لوگ۔ طلبہ طالبات، اساتذہ، مزدور، ڈاکٹر، انجینیر، پیدل سوار، سائیکل سوار، اسکوٹر سوار، رکشا سوار وغیرہ اور ہر شخص اس کو اسی طرح دیکھنے کا عادی بن چکا ہے حتیٰ کہ اسی سڑک سے موسم بھی دبے پاؤں آتے اور گذر جاتے لیکن اس کے معمولات میں کوئی فرق نہ دیکھتے۔ ڈھاکہ کسی قومی تہوار کے موقع پر خوشی و انبساط کے دریا نہا جاتا، لیکن وہ اس وقت بھی تن تنہا اسی جگہ جما ہوتا، ڈھاکہ میں اسٹرائیکیں ہوتیں۔ جلسے جلوس برآمد ہوتے، زندہ باد مردہ باد کے فلک شگاف نعرے لگتے، ہجوم پر پتھراؤ ہوتے کبھی کبھار گولیاں بھی چل جاتیں لیکن وہ ان باتوں سے مطلقاً بے پرواہ رہتا اور خود اپنی ذات میں گم رہتا حتیٰ کہ آس پاس سے گذرنے والے ہجوم میں پھنسے لوگوں کو اس پہ ترس آتا کہ کوئی پتھر کوئی گولی خواہ مخواہ بیچارے کا خاتمہ نہ کردے لیکن شاید ایسا کوئی پتھر اور گولی ایجاد ہی نہیں ہوئے کہ اسے موت کی نیند سلا سکیں کیونکہ بارہا اسی سڑک پہ خشت باری بھی ہوئی اور گولیاں بھی چلیں لیکن اس بوچھار میں

اس کا بال بھی بیکا نہ ہو اور نہ وہ اپنی جگہ سے ہلتا جلتا نہ سرکتا نہ کھسکتا نفس مطمئنہ بنا ہوا اسی جگہ ڈٹا رہتا۔

میرا تو یہ خیال ہے کہ گو وہ اپنی ان آنکھوں سے جو اس کی پیشانی کے نیچے واقع تھیں دیکھنے کا کام ضرور لیتا تھا لیکن آنکھیں اپنے من میں اُس نے کھول رکھی تھیں اُن سے زیادہ دیکھتا تھا اور اسی لئے اپنے گرد و پیش سے مطلقاً بے نیاز رہتا تھا۔ اس تجسس کو پہلے پہل خود میں نے دور کیا تھا کہ آیا وہ دن رات یہاں کھڑا رہتا ہے یا کہیں چلا جاتا ہے۔ ایک دن سکنڈ شو فلم دیکھ کر عمداً یہاں آ کر کھڑا ہو گیا دیکھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہلا اور اسی فٹ پاتھ پر ایک طرف کو کلدار گڈے کی طرح چلنے لگا جیسے کسی مسمریزم کے ماتحت اس نے ایسا کیا ہو اور حدِ نگاہ پر ایک سیاہ سایہ میں تبدیل ہو کر غائب ہو گیا۔ ایک بار ایک دوست نے سائیکل پر بیٹھ کر اس کا پیچھا کیا پتہ چلا کہ وہ آبادی سے دور کسی قبرستان میں جا کر گم ہو گیا تھا۔ صبح صادق کے وقت سے ہمیشہ میں نے اسے یہاں موجود پایا ہے بلکہ میں نے اُس کے ہاتھ پر بھیک کے سکے بھی ڈالے ہیں پھر بھی اس میں کسی قسم کی جنبش نہیں ہوئی۔

پہلے تو ڈھاکے میں گشت و خون رہا پھر اچانک جنگ چھڑ گئی لیکن اس کے معمول میں ذرا بھی فرق نہ آیا حتیٰ کہ بمباری عین اسی سڑک پر ہوئی کہ سڑک کا ایک بڑا حصہ غائب ہو گیا لیکن اس نے نہ اس فٹ پاتھ کو چھوڑا اور نہ لیمپ پوسٹ کو۔ جنگ ختم ہو گئی اور گشت و خون کا بازار بدستور گرم ہو گیا حتیٰ کہ مجھے پناہ لینے کے لئے جگہ جگہ مارے مارے پھرنا پڑا۔ جان بہت پیاری شے ہے، مال کو اس پر سے قربان کر دیا جاتا ہے۔ میں نے بھی خطرہ دیکھ کر گھر بار چھوڑا اور روپوش ہو جانے ہی میں مفر دیکھی جگہ جگہ مارا مارا پھرا لیکن کوئی ڈھنگ کی جگہ نہ ملی۔ اسی سڑک پر جہاں بم گرا تھا اور ایک گڑھا بن گیا تھا، اسی گڑھے کے پہلو میں ایک خلا سا تھا جو زیر زمین پائپ لائن دوڑائی جا رہی تھی اور

ابھی خالی پڑی تھی اس سے جا ملا تھا مجھے یہی مقام سب سے زیادہ محفوظ نظر آیا میں اس میں اتر گیا اور جا چھپا لیکن چھپنے کے سوچنے لگا اگر اس نے بتا دیا کہ میں یہاں چھپا ہوں تو کیا ہو گا؟ اندر کئی بار میں نے محسوس کیا کہ جیسے اوپر وحشیانہ ہڑبونگ مچا ہوا ہے نعرے لگ رہے ہیں گولیاں چل رہی ہیں اور ہر لمحے خطرہ نزدیک سے نزدیک تر ہوتا جا رہا ہے۔ میں سانس روکے گھنٹوں پڑا رہا ہوں لیکن بالآخر خطرہ ٹل مل گیا اور میں نے جب بھی کچھوے کی طرح گڑھے سے گردن نکال کر باہر جھانکا اسے بدستور لیمپ پوسٹ کے نیچے موجود پایا۔

اس حالت میں مجھے چھتیس گھنٹے گزر گئے۔ تین فاقے کر لینے کے بعد مجھ میں ہلنے جلنے کی بھی سکت باقی نہ رہی۔ شاید میں پائپ لائن کے اندر پڑے پڑے بے ہوش بھی ہو گیا۔ معاً میں نے محسوس کیا کوئی شخص مجھ پر جھکا ہوا ہے اور پانی چھڑک رہا ہے۔ میں ذرا ہلا جلا تو کسی نے سہارا دے کر اٹھایا پانی پلایا اور کاغذ کی ایک پڑیا مجھے تھما کر چلنے لگا تو میں نے دیکھا، میرے خدا یہ تو وہی تھا جو لیمپ پوسٹ کے نیچے جما رہتا تھا گویا اسے سب کچھ معلوم تھا وہ بے خبر نہیں ہے۔

دوسرے دن سڑک پر اور زیادہ اودھم رہا میں اس مجمع کو مطلوب تھا۔ وہ مجھے چیر پھاڑ کر تکہ بوٹی کرنے کے لئے بے تاب تھے انھوں نے میرے گھر سے لے کر شہر کا کونا کونا چھان مارا تھا اور اب اس سڑک پر اودھم مچا رہے تھے کئی گھنٹے اسی طرح گزر گئے اور وہ بالآخر تھک کر واپس گئے تو کسی نے میرا شانہ ہلایا لیکن اس بار میرا دوست آیا اور جو دور جھاڑیوں میں جیب چھپا آیا تھا، میں نے سڑک پر نکل کر جو سب سے پہلا منظر دیکھا وہ یہ تھا کہ لیمپ پوسٹ کے نیچے اس کی لاش پڑی تھی اور اس کے منہ سے حلق تک ایک چھرا گھنیا ہوا تھا۔

آخری ہاتھ

میں، میں نہیں۔ مگر میں آخر کار میں ہی تو ہوں —— جو "میں" اور "میں" کے مابین حائل ہے وہ بھی تو میں ہی ہوں۔ پھر میرے اندر یہ کیسا جوار بھاٹا اُٹھ رہا ہے۔ روشنیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور میرے باہر گھپ اندھیرا ہے میرے اندر سے اتنی بھی روشنی پھوٹ کر باہر نہیں آتی کہ ہلکا سا کوندا ہی لپک جائے، جگنو ہی چمک جائے، کچھ تو راستہ نظر آئے کہ میں کہاں ہوں۔ کہاں نہیں ہوں۔ اور اگر سچ مچ میں میں نہیں ہوں تو پھر یہ روشنی کیسی ہے؟ یہ نور کیسا ہے جو میرے اندر ہی اندر چھپا ہوا ہے؟ ایسی چکا چوند ہے کہ کچھ نظر نہیں آتا۔ اندر روشنی کی کثرت ہے کہ کچھ نظر نہیں آتا۔ باہر اندھیرا ہے گھپ اندھیرا کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ اندر باہر ہر طرف راستے مسدود ہیں۔

یاد آیا کہ جب کرن بن کر سفر کا آغاز کیا تھا تو دنیا منور و متغیر ہو گئی تھی۔ ہر شے نظر آ رہی تھی —— چمک رہی تھی۔ پہاڑ، دریا، سمندر، میدان، سبزہ زار، بستیاں، انسان اور

حیوان کیا نظر کے احاطے میں زمان و مکان تک سمٹ آئے تھے۔ جب یہی کرن سمٹ کر وجود میں لوٹ آئی تو باہر اندھیرا ہوگیا اور اندر روشنی ہی روشنی۔ لیکن اندر تو کچھ نہیں سناٹا ہے بس روشنی کا ایک سمندر ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے، جوار بھاٹا اٹھ رہے ہیں اور نظر کچھ نہیں آتا۔ شاید پھر کسی مدوجزر حوادث نے ٹھوکا دیا۔ کرن کی ایک لکیر پر بیٹھ کر باہر قدم رکھا، ہاتھ کسی شے سے ٹکرایا۔ یہ بھی کسی کا ہاتھ تھا جو ہاتھ میں آگیا۔ مگر یہ کس کا ہاتھ ہے؟ معاً معلوم ہوا کہ یہ بھی میرا ہی ہاتھ ہے۔ میں نے خوب ٹٹول کر دیکھا۔ میرے تو دونوں ہاتھ موجود تھے۔ یہ تیسرا ہاتھ کیسا؟ تو کیا میرے تین تین ہاتھ ہیں؟ تو یہ تیسرا ہاتھ کہاں سے نکلا؟ یہ کیسے پیدا ہوا؟ ابھی یہ عقدۂ لاینحل حل نہ ہوا تھا کہ تیسرے ہاتھ کو چوتھے ہاتھ نے پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا پاؤں زمین پر جم گئے۔ سر آسمان میں جا لگا اور میرے وجود سے سینکڑوں اور ہزاروں ہاتھ نکل نکل کر ادھر ادھر پھیلنے لگے۔ پلک جھپکتے میں یہ ہاتھ کائنات کی وسعتوں میں تیزی سے کام کرنے لگے۔ لمحات بن بن کر ذرّن کھسکنے لگے۔ ہاتھ کام کرتے رہے، بستیاں بساتے رہے، اجاڑتے رہے صنعتیں گڑھتے رہے، کھیتیاں اگاتے رہے، جہاز اڑاتے، راکٹ چلاتے رہے اور کائنات کی تزئین و آرائش کرتے رہے۔ ایک بڑا کھیانک اور گمبھیر ہاتھ اٹھا اور جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو، اژدہا سانپوں کو کھا جاتا ہے۔ اس طرح وہ ہاتھ چھوٹے چھوٹے نرم و نازک مضبوط اور محنتی ہاتھوں کو کاٹ کاٹ کر گرانے لگا۔ ہاتھوں کے ـــ کٹے ہوئے ہاتھوں کے پشتے کے پشتے لگ گئے جس طرح کسان کی درانتی پکی ہوئی فصلوں کو کاٹ کر پھینک دیتی ہے اسی طرح دست ہائے بریدہ کے کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے اور میں ایک مرتبہ پھر اپنے وجود میں سمٹ آیا اور سوچ رہا ہوں کہ یہ آخری ہاتھ بھی میرا ہی تھا نا ـــــ پھر سوچتا ہوں کہ میں میں نہیں، مگر میں آخر کار میں ہی تو ہوں۔ جو میں اور میں کے مابین حائل ہے وہ بھی تو میں ہی ہوں پھر

میرے اندر یہ کیسا جوار بھاٹا اٹھ رہا ہے۔ روشنیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور میرے
باہر گھپ اندھیرا ہے۔ میرے اندر سے اتنی بھی روشنی پھوٹ کر باہر نہیں آتی کہ ہلکا سا کوندا ہی
لپک جائے۔ جگنو ہی چمک جائے۔ کچھ تو راستہ نظر آئے کہ میں کہاں ہوں کہاں نہیں ہوں اور
اگر سچ مچ میں نہیں ہوں تو پھر یہ روشنی کیسی ہے؟ یہ نور کیسا ہے جو میرے اندر ہی اندر پھیلا
ہوا ہے؟ ایسی چکاچوند ہے کہ کچھ نظر نہیں آتا۔ اندر روشنی کی کثرت ہے کہ کچھ نظر نہیں آتا، باہر
اندھیرا ہے گھپ اندھیرا کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ اندر باہر ہر طرف
راستے مسدود ہیں۔